یہ شوہر یہ نرسیں

اسرار اشفاق

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ شوہر نرسیں

اسرار اشفاق

UQAABI
03055198538

یوسف پبلشرز۔ بنک روڈ راولپنڈی

مصنف : اسرار اشفاق
پبلشر : یوسف پبلشرز بنک روڈ راولپنڈی
پرنٹر : ٹی ایس پرنٹرز گوالمنڈی
کتابت : اقبال حسین
قیمت : ۲۵ روپے

UQAABI
03055198538

جملہ حقوق بحق پبلشرز محفوظ ہیں

فہرست مضامین

نمبر شمار	مضمون	صفحہ
۱	انتساب	۲
۲	گر نام و نشان من	۳
۳	پیش لفظ	۷
۴	یہ شوہر	۹
۵	ہماری فلمیں ہمارا کلچر	۲۲
۶	یونائیٹڈ کرسچین ہسپتال گلبرگ میں چند روز	۳۱
۷	ہم بھی منہ میں پان رکھتے ہیں	۵۳
۸	سیاسی فٹ بال میچ	۶۳
۹	جادیں وے کبوترا	۷۶
۱۰	بڑے لوگوں کے جینز ک نام	۸۶
۱۱	عوامی نیلام گھر	۹۶
۱۲	پڑ رہا ہے مگر مسکرونا	۱۱۵
۱۳	اگلے وقتوں کے باکمال لوگ	۱۲۳
۱۴	چلے بھی آؤ کہ	۱۴۶
۱۵	ہم اور ہمارے محاورے	۱۵۶
۱۶	باکمال لوگ لاجواب سروس	۱۶۷
۱۷	ایجوکیٹرز کلب راولپنڈی کی ایک شام	۱۸۱
۱۸	قینچیاں	۱۸۷
۱۹	ابن بطوطہ ماڈل ٹاؤن میں	۱۹۴
۲۰	مرکے بھی چین نہ پایا تو	۲۰۵

انتساب

میرے سوا ہر اُس شوہر کے نام جو مثالی بیوی حاصل
کرنے میں کامیاب ہوگیا ہو۔

گرنام و نشانِ من

دس سال پیشتر میں نے اپنی پہلی کتاب "یہ بیویاں یہ کلرک" میں اپنا مختصر سا جغرافیہ پیش کیا تھا۔ اتنے بڑے عرصے میں طوفان اور آندھیاں انسان کے جغرافیائی حالات کا حلیہ بگاڑ دیتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ان سب طوفانوں اور آندھیوں کے بے پناہ زور و شور کے باوجود میرے جغرافیے میں کوئی خاص تغیر نہیں ہوا۔ تاہم ایک بار پھر میرے جغرافیائی حالات سُن لیجئے۔

نام بدستور اسرارالحق ہے جس کو بعض دانش ور حضرات 'ص' سے بھی لکھتے ہیں۔ کتابی یعنی اشتہاری نام اسرار اشفاق ہے۔ شناختی کارڈ پر دونوں نام درج ہیں۔

۱۸ مئی ۱۹۱۹ء کو اللہ تعالیٰ نے نہایت مہربان ہو کر آجکل کی ہوشربا گرانی آپس کا ڈالڈائی خلوص اور محمد بن قاسم کے کارناموں پر ناز کرنے والے نوجوانوں کے اخلاق کا نظارہ کرنے کے لئے اس خطۂ زمین پر بھیج دیا۔ جس کا مطلب لا الٰہ الا اللہ ہے اور یہ سنتے سنتے بھی کان پک گئے کہ اسلام کے نام پر حاصل کیا ہے۔ لیکن اسلام ہے کہاں ؟ اس کی ابھی تک تلاش ہے۔

بدقسمتی سے یہی تاریخ میٹرک کے سرٹیفکیٹ پر بھی درج ہے۔ ۱۹۳۹ء میں گورنمنٹ کالج لدھیانہ سے امتیازی حیثیت سے بی۔ اے پاس کیا۔ بیک وقت اکٹھی تین فرسٹ ڈویژن حاصل کیں جو ڈگری پر کچھ اس طرح III لکھی ہوئی ہیں' الحمدللہ۔ اگر ایم۔ اے کرنے کا خیال ہوتا تو یقیناً ایسی ہی شاندار کامیابی حاصل کرتا مگر اللہ تعالیٰ کو منظور نہ تھا۔

۱۹۴۱ء میں بر ہٹلر کی سرسری سفارش سے جی ایچ کیو گورنمنٹ آف انڈیا میں بڑی آسانی سے ملازم ہو گیا۔ خدا بھلا کرے ہٹلر میاں کا جہاں بھی ہوں خوش رہیں۔

آزادی کے وقت کرایہ کا دولت خانہ شملہ میں تھا آزادی کے بعد نہ دولت رہی اور نہ خانہ۔ بلکہ آج تک خانہ خراب ہے' دولت نایاب ہے۔

۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۵ء تک راولپنڈی ڈویژن کا ٹینس چیمپئن رہا کیونکہ یہ میرے اپنے دست و بازو کا کھیل تھا اس لئے آگے بڑھ گیا۔ خدانخواستہ اگر اس میں سفارش کی ضرورت ہوتی تو دست و بازو کو نظر لگی ہوتی۔ ڈیڑھ درجن ٹرافیاں ٹینس میں حاصل کیں۔ پسندیدہ غذا گوشت ہے جو اول تو ملتا ہی نہیں' اگر ملتا ہے تو بہت مہنگا اور وہ بھی مریل گھوڑے یا اس سے بھی کم درجے کے جانور کا۔ اس لئے آجکل ان ٹرافیوں میں چنوں یا آلوؤں کی یخنی پی کر جان بنا رہا ہوں۔

۱۹۶۳ء میں میری پہلی کتاب "یہ بیویاں یہ کلرک" کا پہلا ایڈیشن اخباری کاغذ پر کیونکہ اُس وقت اس سے گھٹیا کاغذ دستیاب نہ تھا کتابت کی بے شمار غلطیوں کے ساتھ لاہور سے چھپا تھا۔ تعجب ہے اغلاط سمیت بہت جلد ختم ہو گیا یا ختم کر دیا گیا۔ اسی کتاب کا دوسرا ایڈیشن شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور نے سفید کاغذ پر بغیر کتابت کی غلطی کے کیونکہ پروف میں نے خود پڑھا تھا ۱۹۶۸ء

میں نکالا۔ دوسرا ایڈیشن بھی نبتے ہی ہاتھوں ہاتھ نکل گیا۔ کہاں نکل گیا معلوم نہ ہو سکا۔ کتاب اتنی مقبول ہوئی کہ اکثر دوستوں کو مجھے خود شیخ غلام علی اینڈ سنز سے قیمتاً خرید کر پیش کرنی پڑی اور ساتھ ہی شکریہ قبول فرمائیے بھی لکھنا پڑا۔

میری پہلی کتاب میں "یہ بیویاں" والا مضمون پڑھ کر میرے دوستوں کی بیویوں نے میری بیحد تعریف کی مگر اُلٹے الفاظ میں۔ اور یہ کتاب کی کامیابی کی دلیل ہے۔ کامیاب وہی ہوتا ہے جس کو کوسا جائے۔ ان اُلٹے الفاظ کو بیان کرنے کے لئے میرے پاس سیدھے الفاظ نہیں ہیں۔ اب میں اپنی دوسری کتاب "یہ شوہر یہ نرسیں" اپنی پہلی کتاب "یہ بیویاں یہ کلرک" کے مقابلے میں پیش کرنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ یہ کتاب کیسی ہے؟ جمہوریت کے اس دور میں میں خود کچھ نہیں کہوں گا اور نہ مجھے حق ہے، اس کا فیصلہ میں عوام پر چھوڑتا ہوں۔ جو کتاب واقعی خرید کر پڑھتے ہیں، ان عوام پر جو کتاب لائبریری سے لیکر یا کسی سے مانگ کر پڑھتے ہیں اور غلطی سے کتاب واپس کر دیتے ہیں اور خاص کر ان عوام پر جو کتاب ایک دن کے لئے مانگ کر لے جاتے ہیں مگر دانشمندی کا ثبوت دیتے ہوئے عمر بھر واپس نہیں کرتے۔ اور اسی دانش مندی سے تیس چالیس سال میں اپنی ذاتی لائبریری بنا لیتے ہیں۔ تاہم مجھے پکا یقین ہے کہ اس کتاب میں "یہ شوہر" والا مضمون پڑھ کر میری سہیلیوں کے نہیں بلکہ میری بھابھیوں کے شوہر اُس سے بھی بڑھ کر میری تعریف کریں گے جو میرے دوستوں کی بیویوں نے "یہ بیویاں" پڑھ کر کی تھی۔ اس سے میری مزید حوصلہ افزائی ہوگی اور مجھے تیسری کتاب "یہ دوست احباب" لکھنے کا شوق پیدا ہوگا۔ سنہ ۱۹۶۹ء اور سنہ ۱۹۷۰ء کے عرصے کے درمیان سیاسی حالات، سیاسی شخصیتوں اور سیاسی اعلانات اور وعدوں سے اس قدر مرعوب ہوا اور سیاسی شخصیتوں کے ساتھ بھرپور تعاون اور قوم کی

خدمت کا ایسا جوش پیدا ہوا اور جذبہ ابھرا جیسے کنوئیں میں پہلی بار ڈوبتا ہوا آدمی اُبھرتا ہے اور پھر ڈوب جاتا ہے۔

اسی جذبے کے تحت جنوری ۱۹۷۱ء میں تیس سالہ ملازمت کو خیرباد کہا اور افسری، چھوڑکر نو سال قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی۔ ۱۹۷۲ء سے لے کر آج تک اعلانات اور وعدے کرنے والوں کو خطوط لکھتا رہا کہ خدمت کا موقع دیں۔ میرے جائز جذبہ و جوش اور تعاون سے مفت فائدہ اُٹھائیں۔ بقول غالب ع مفت ہاتھ آئے تو بُرا کیا ہے مگر کسی نے مجھ سے مفت بھی فائدہ نہ اُٹھایا۔ افسوس نوکری بھی گنوائی اور خدمت کا موقع بھی نہ ملا۔ نہ خدا ملا اور نہ صنم سے وصال ہوا۔ بلکہ خود اپنا وصال ہوتے ہوتے بچا۔ نتیجہ ظاہر ہے جذبہ و جوش بالکل سرد پڑ گیا۔

بزرگ لوگ جو ہمیشہ کچھ نہ کچھ کہتے ہی رہتے ہیں "ان کا کہنا ہے کہ بلند کردار انسان وہ ہے جو کچھ وہ زبان سے کہے اس پر کاربند رہے" جو وعدہ کرے اس پر قائم رہے وعدہ وفا کرے۔ مولانا کوثر نیازی نے اپنی ذاتی کتاب "زرِگل" میں نہایت پیارا اور حقیقت افروز شعر کہا ہے۔ ع

قائدینِ کرام کے وعدے مکڑیوں کے حسین جالے ہیں

زیادہ تر خطوط میں نے مولانا کو ہی لکھے تھے۔

قائدینِ کرام سے ہر طرح مایوس ہو کر آجکل "الشمس" سول لائنز راولپنڈی میں بطور ایک ریٹائرڈ ملازم اور بحیثیت ایک او۔ایس۔ڈی شوہر کے قیدِ حیات بھگت رہا ہوں۔ اور اللہ ہی جانتا ہے کہ اس مرغوب قید کی میعاد کب ختم ہو گی۔ اپنے متعلق بقول غالب ہی کہہ سکتا ہوں۔

؎ حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد ہے۔

اسرار اشفاق۔ ۲۹ دسمبر ۱۹۷۹ء

پیش لفظ

اگر کوئی مجھ سے پوچھے کہ مزاح کی کتنی قسمیں ہیں تو میرا جواب ہوگا جتنے مزاح نگار ہیں۔ ہر مزاح نگار اپنی قسم آپ پیدا کرتا ہے۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ فلاں نیا ادیب فلاں پرانے ادیب سے متاثر ہوا ہے۔ ہوا ہوگا لیکن اُس کا اسلوب متاثر ہونے کے باوجود انفرادی ہوگا اُس کا اپنا ہوگا، وہ ہزار متاثر ہو لے اپنے پیشرو کا اسلوب نہیں اپنا سکتا۔ شاید تھوڑی بہت "خاندانی مشابہت" پیدا کر لے مگر IDENTICAL TWIN نہیں بن سکتا۔ اگر ایسا ہوتا تو آج بیسیوں غالب، اقبال اور بطرس بھر رہے ہوتے۔

ان حالات میں اگر کہا جائے کہ اسرار اشفاق کا مزاح خالص ان کا ذاتی مزاح ہے تو یہ کوئی نئی دریافت نہیں ہوگی۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسرار اشفاق کے مزاح اور اسلوب کے خصائص کیا ہیں؟ جہاں تک مجھے محسوس ہوتا ہے اسرار اشفاق کا مزاح خالص سرزمینِ پنجاب کا مزاح ہے۔ برملا، براہ راست، غیر مبہم، تنومند اور پنجابی لفظوں میں ہسدا رسدا۔ اسرار اشفاق کے مزاح میں وہ رعایت نہیں، وہ اخفا نہیں وہ FINESSE اور نزاکت نہیں جو کئی مزاح نگاروں کے اسلوب کا حصہ ہیں۔ مگر ان عناصر کی عدم موجودگی سے ان کے مزاح کی کوالٹی پہ کوئی اثر نہیں پڑتا۔ کہ جو خوبیاں اس میں موجود ہیں وہ بجائے خود اتنی دلکش ہیں کہ کسی کمی کا احساس نہیں ہوتا۔

اسرار اشفاق کا مزاح سامنے کے واقعات، شخصیات اور ارد گرد کے افعال و اعمال سے متعلق ہے اور بیشتر مزاح برائے مزاح ہے۔ اگر اس میں کوئی اصلاحی عنصر ہے، تو اتفاقی ہے ارادی نہیں۔ اس لئے ان کا اسلوب مصنوعی نہیں بے ساختہ ہے۔

ادب میں مقصدیت ایک بڑا آدرش ہے۔ مگر بعض قلمکار تحریر میں بھی مقصدیت بھرنے کے لئے اُس کا وہ حلیہ بگاڑتے ہیں کہ ایک ہلکی پھلکی سادہ سی بات کو ایک بھاری بھرکم وعظ

میں بدل دیتے ہیں۔ مقصدیت بالکل غیر محسوس طریقے سے در آنی چاہیئے۔ دراصل یہ روگ ان ادیبوں کا ہے جنہیں اپنی دانشوری کا مغالطہ ہے جو کومٹمنٹ کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہیں جو اِس یا اُس فلسفے سے بعیت ہیں۔ اسرار اشفاق خوش قسمت آدمی ہیں سیدھے سادے پنجابی مسلمان اور پکے پاکستانی ہیں انہیں فلسفے یا دانشوری کے دَورے نہیں پڑتے وہ بحمد للّٰہ صحت مند، دیانت دار اور محبت شعار آدمی ہیں۔ خوش طبع ہیں لہٰذا کبھی کبھار بے ضرر طنز یا مزاح کا وار کر جاتے ہیں مگر اذیت رسانی ان کا شیوہ نہیں بس چٹکیاں سے لیتے ہیں کبھی چھوٹی اور ہلکی سی اور کبھی بڑی سی اور بھاری سی۔

بعض مزاح نگار فکر اور اسلوب کے اعتبار سے عام انڈر میٹرک قارئین کے سر سے گزر جاتے ہیں ان کے مزاح کی بلندی میں کوئی شک نہیں مگر جو بے شمار لوگ اس مزاح تک پہنچتے ہی نہیں ان کی محرومی میں بھی کوئی شک نہیں۔ سو ضرورت ہے ایک ایسے مزاح نگار کی جو ایک عالم سے لے کر ایک عامی تک یکساں طور پہ سمجھ میں آ سکے اور ہر ایک کا منہ مسکراہٹوں سے بھر دے۔ بدیگر الفاظ ایک عوامی مزاح نگار کی ضرورت ہے اور اسرار اشفاق بلاشبہ ایک ایسے مزاح نگار ہیں ان کو پڑھتے وقت سرہانے ڈکشنری رکھنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ اِدھر تحریر پڑھی اُدھر دل میں اتری اور ہونٹوں پر تاثیر نمودار ہوئی۔ اسرار اشفاق کو پڑھتے ہوئے قاری اکثر محسوس کرتا ہے کہ

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دِل میں ہے

اسرار اشفاق کا مزاح جبلی ہے۔ انہوں نے نہ تو مزاح پہ کوئی ٹیکسٹ بک پڑھی ہے اور نہ کسی مزاح نگار کے آگے زانوئے تلمذ تہ کیا ہے۔ بس کھڑے کھڑے خود بخود لکھنا شروع کر دیا۔ گویا انہوں نے اپنی حنابندی خود کی ہے اور رنگ چوکھا آیا ہے یا کم۔ بڑی خوبی یہ ہے کہ تمام تر رنگ اُن کا اپنا پیدا کردہ ہے ـــــ ذرا اُس مصور کے جذبات کا اندازہ کیجئے جس نے کسی رئیس کو اپنی پینٹنگ پیش کرتے ہوئے اُس کی سب سے بڑی خوبی یہ بتائی تھی کہ "میں نے خود بنائی ہے"ـــــ اب دیکھئے اسرار اشفاق کی بنائی ہوئی لفظی تصویریں اور خاکے اور داد دیجئے۔

محمد خان (کرنل)

یہ شوہر

شوہروں کے بارے میں اگر کچھ کہا جائے تو اس سے شوہروں کے ناراض ہونے کا ڈر ہے۔ یہ بلاشبہ خطرناک بات ہے۔ لیکن اگر شوہروں کے بارے میں کچھ نہ کہا جائے تو اس سے بیویوں کا ناراض ہونا یقینی اَمر ہے۔ یہ اور بھی خطرناک بات ہے۔ لیکن اگر کوئی مستند اور مستقل شوہر ہی شوہروں کی خوبیوں کا ذکر کردے۔ تو انگریزی محاورے کے مطابق ایک پتھر سے دو شکار والا معاملہ ہوگا۔ یعنی شوہروں کو بھی ناگوارِ خاطر نہ ہوگا اور بیویوں کے دل کا غُبار بھی نکل جائے گا اور اُن کی کسی حد تک تسکین ہوجائے گی۔

پانوں کی طرح شوہروں کی قسمیں تو بہت ہیں مثلاً جابر' رُعب دار' نرم دل' صلح جُو' صلح کُل' بھیگی بِلّی' گربہ کُشتن' گھر داماد' اُس سے خطرناک زن مُرید اور اُس سے بھی خطرناک اور خوفناک زن داماد وغیرہ وغیرہ۔ ان کی پہچان اپنے اپنے گریبان میں ذرا سا جھانک کر ہوسکتی ہے۔ یہاں اُن پر بحث مقصود نہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ کوئی شخص چاہے بہت بڑا افسر ہو' معمولی کلرک ہو' رشوت لیتا ہو یا نہ لیتا ہو۔ مِل کا مالک ہو یا مزدور' انجینیئر ہو یا مستری' اپنے ملک میں ہو یا دوبئی میں' ڈاکٹر ہو یا مریض' موٹر کمپنی کا مالک ہو یا ٹرک ڈرائیور' بحیثیتِ شوہر عادات واطوار اور حرکات وسکنات

دوسرے شوہروں سے مشابہت رکھتا ہے۔ بیوی پر بلا وجہ رُعب جمانے کی کوشش تمام شوہروں کا خاص وصف ہے۔

صرف تین باتیں ایسی ہیں جن میں شوہر اپنے آپ کو دھوکا دیتا ہے۔ اوّل وہ اس غلط فہمی میں مبتلا رہتا ہے کہ اُس کے پاس عقل کا کبھی نہ ختم ہونے والا ذخیرہ ہے۔ دوسرے اُس کو اس بات کا احساس یقین کی حد تک ہوتا ہے کہ دولت کا کبھی نہ ختم ہونے والا خزانہ دوسروں کے پاس ہے۔ تیسری بات بڑی دلچسپ ہے وہ دل میں تو بیوی سے ڈرتا ہے لیکن ظاہر یہ کرتا ہے کہ نہیں ڈرتا۔ دوستوں سے اکثر کہتا ہے۔ "ارے بھائی بیوی سے کیوں رُوح فنا ہوتی ہے، ڈرتے کس بات سے ہو؟ ہم تو خدا کی قسم پرواہ بھی نہیں کرتے"۔ اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شوہر بیوی کو جھُوٹی بات کا یقین دلانے کے لیے اتنی قسمیں کھاتا ہے کہ کسی اور کے سامنے سچّی بات کا یقین دلانے کے لئے بھی نہیں کھاتا۔

شادی ہوتے ہی بیوی سے تمام عمر ہنسی خوشی بخیر و خوبی نباہنے کے وعدے ہوتے ہیں۔ اپنی دائمی غلامی کا یقین دلایا جاتا ہے۔ بیوی کا ہر حکم ماننے اور جائز ناجائز ہر خواہش پوری کرنے کا اعلان کیا جاتا ہے۔ تعریف کے پُل باندھ دیئے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ بیوی کی چپٹی ناک بھی خوبصورت ترین ولایتی سانچے میں ڈھلی ہوئی بتائی جاتی ہے۔ اور ناک بڑی اہم شے ہے۔ ناک کے بغیر کوئی ذیشان اور معزز نہیں ہو سکتا۔ ناک پر تو مکھی بھی بیٹھنے نہیں دی جاتی۔ اگر بیٹھ جائے تو اڑا ہی اُڑا دیا جاتا ہے۔ بیوی کا نام سوات کے شہد سے زیادہ شیریں ہوتا ہے۔ لیکن دو ایک سال کے بعد تمام وعدے اور باتیں وزیرانہ ثابت ہوتی ہیں اور اس طرح محو ہونے لگتی ہیں جیسے کسی خاندانی 'فارغ البال' کے سر سے بال اُڑنے لگتے ہیں۔ وہ خوبصورت ناک زکام کا منبع قرار پاتی ہے۔ شروع میں جو تعریف کے پُل باندھے گئے تھے، وہ

سیمنٹ نہ ہونے اور صرف ریت ہونے کی وجہ سے آہستہ آہستہ سرکنے، کھسکنے لگتے ہیں۔ سوات کا شہد پھیکا پڑ جاتا ہے اور وقت بے وقت نام کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے۔ "سبحان اللہ! والدین نے نام بھی کیا چھانٹ کر رکھا ہے نور جہاں۔ اس گھر میں تو روشنی نہ ہوئی۔ جو گھر میں بلب تھے وہ بھی مدہم پڑ گئے، سارے جہاں میں کیا نور پھیلے گا۔ اور نام بھی کیا شریفانہ ہے ایکٹرسوں جیسا یا جیسے کسی کبوتر پکڑنے والی کا نام ہو۔

آغاز میں حالت یہ ہوتی ہے کہ میاں یوں اکڑے اکڑے پھرتے ہیں جیسے سارے خاندان میں پہلی شادی اُنہی کی ہوئی ہو، باپ دادا تمام عمر کنوارے ہی رہے ہوں گے۔ بار بار ٹائی کی ناٹ درُست کی جاتی ہے، گھڑی گھڑی پتلون کی کریز کا خیال رکھا جاتا ہے۔ پھر تین چار بچّوں کا بوجھ سر پر پڑتے ہی پتلون کی کریز تو ایک طرف رہی پیٹ ہی غائب ہو جاتی ہے۔ درویشانہ پیوند لگ جاتا ہے۔ ہم خرما و ہم ثواب۔

سسُرال والوں سے توقع رکھی جاتی ہے کہ سب کے سب "فٹ میٹ" کی طرح ان کے قدموں میں بچھ جائیں، ان کے گرد گھومتے رہیں اُسی رفتار کے ساتھ جس رفتار سے زمین سوُرج کے گرد گھومتی ہے۔ لیکن سسُرال والوں کی انتہائی خدمت اور خاطرداری کے باوجود اُن کی ناک سیدھی نہیں ہوتی۔

اگر اتفاق سے ان کی موجودگی میں ہم زلف بھی سسُرال میں آجائے تو اُس کی ہر خاطر مدارات کو اسی نظر سے دیکھیں گے جیسے ایف آئی اے میں ہیڈ کانسٹبل ہوں اور اس 'ٹوہ' میں رہیں گے کہ اُس کو کس کس جگہ اور کس کس بات میں اُن پر فوقیت دی گئی ہے۔ اور اس کے بعد چھوٹی سے چھوٹی بات بیوی کو بار بار جتائیں گے۔ "دیکھ لیجئے کھانے کی میز پر آپ کے ابا جان نے مجھے اپنے بائیں ہاتھ بٹھایا اور آپ کے بہنوئی صاحب کو دائیں ہاتھ۔ یعنی وہ تو اُن کے دائیں ہاتھ ہیں۔ انہیں آپ کے

ابا جان کار آمد خیال کرتے ہیں اور مجھے بیکار انسان سمجھتے ہیں۔ اور اُن کی پلیٹ میں ابا جان نے دستِ مبارک سے دو نرگسی کوفتے رکھ دیئے اور مونگ کی چھلکوں والی دال کا ڈونگا میری طرف سرکا دیا یعنی وہ تو صحت مند رستم زماں ہیں اُن کی صحت برقرار رکھنے کے لئے کوفتے ضروری ہیں اور میں اُن کو مریض دکھائی دیتا ہوں جیسے مونگ کی دال کھلانا درازئ عمر کا باعث ہے۔

عمر کے آخری سانس تک بیوی کو اپنی اصل تنخواہ یا اصل آمدنی کے حدود عرض سے بے خبر رکھتے ہیں۔ شوہروں کو تنخواہ میں ڈنڈی مارنے کی خاص مہارت ہوتی ہے۔ پھل اور سبزی والوں، گوشت اور پرچون فروشوں کے بعد ان سے بہتر ڈنڈی مارنے والا اور کوئی نہ ملے گا۔ کسی ماہ تو زیادہ رقم اڑا دیں گے اور کسی ماہ کم۔ اور چلتا ہوا بہانہ یہ ہوتا ہے "اس ماہ انکم ٹیکس زیادہ کٹ گیا یا اس ماہ فلڈ ریلیف فنڈ ڈبل ہوگیا۔ نجانے یہ فنڈ کب ہماری جان چھوڑے گا" دراصل رمی یا ریس میں ہاری ہوئی یا کسی قرض خواہ کو ادا کی ہوئی رقم اس طرح ڈنڈی مار کر پوری کی جاتی ہے۔ بیوی بے چاری رمی یا ریس کھیلے بغیر ہر ماہ برابر ہارتی رہتی ہے۔ اس بے چاری کو کسی ماہ بھی جیتنے کا موقع نہیں ملتا۔

ہر روز رات کو گھر دیر سے آئیں گے۔ کلب میں وقت ضائع کر کے "کہیں گانا سُن کر یا بزبان پنجابی کہیں 'کھے' کھا کر۔ اور دیر سے گھر آنے کی تاویل میں قسم قسم کے بہانے تراشیں گے۔ "فلاں دوست کی دادی کا انتقال ہوگیا وہاں جانا پڑا۔ فلاں دوست کے ماموں کا چہلم تھا شرکت ضروری تھی" ایک دوست کی دادی کا ایک سال میں دو بار انتقال کرا دیا۔ یا پھر بیوی کی توجہ ہٹانے کے لئے کوئی سنسنی خیز خبر یا واقعہ اسی وقت گھڑ دیں گے۔ "آج تو ایکسیڈنٹ ہوتے ہوتے رہ گیا۔ اللہ نے بال بال بچالیا۔ میں سکوٹر پر آ رہا تھا۔ جب شیزان کے قریب پہنچا تو کار تیزی سے

اتنی قریب سے گزری کہ اگر اللہ کا فضل شاملِ حال نہ ہوتا تو میں اُس کی پیٹ میں آ گیا تھا۔ ابھی تک دل دھڑک رہا ہے' ذرا ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس یا سپرٹ امونیا تو دینا" شکل وصورت سے ایکسیڈنٹ کے آثار کہیں ظاہر نہیں ہوتے۔ پتلون کی کریز قائم ہے اور چہرے کی بھی۔ اب بیوی بیچاری کیا کرے اور کیا کہے۔ صرف یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ اُس کو شوہرِ نامدار کے بیان کا یقین ہے دوسرے دن ایک بکرا یا اُس کی سِری بطورِ صدقہ دے کر جرُمانہ بھرتی ہے۔ کسی رات جو بہت دیر سے آئیں گے تو چُپکے سے گھڑی گھنٹہ دو گھنٹہ پیچھے کر دیں گے اور گھڑی کی طرف اشارہ کرکے فرمائیں گے۔ "بیگم! ابھی تو ساڑھے بارہ بجے ہیں' کیا ہو گیا ہر روز بارہ ایک بجے تو سوتے ہیں۔ ایک بار ایسا ہی کرشمہ دکھاتے ہوئے کرنل یوسف پکڑے گئے تھے۔ گھر تو پہنچے تھے صبح کے چار بجے اور گھڑی کی سوئی دو پر کر دی اور بیوی سے معصومانہ انداز سے معافی مانگنے لگے۔ "آج تو واقعی دیر ہو گئی' دو بج گئے۔ یقین کرو آئندہ کبھی اتنی دیر نہیں ہوگی۔ آج آخری بار ہے پھر کبھی دو نہ بجیں گے۔" کرنل صاحب ابھی "دو نہ بجیں گے" کے الفاظ مُنہ سے نکال رہے تھے کہ قریب کی مسجد کے لاؤڈ سپیکر سے صبح کی اذان جوش وخروش کے ساتھ گُونجی۔ کرنل صاحب کا خون خشک ہو گیا۔ بیوی قہر آلود نظر ڈالتے ہوئے بولیں۔ "لیجئے برج کھیلنے کی اذان ہو گئی' جلدی سے تیمم کرکے اپنی مسجد کو سدھاریئے کہیں نماز قضا نہ ہو جائے۔" ہر بار دیر سے گھر آنا اور یہ کہنا "آج آخری بار ہے پھر کبھی دیر نہ ہو گی۔" یہ گویا رات کا وظیفہ ہے جو پڑھا تو جاتا ہے لیکن بے اثر ہوتا ہے۔

جتنی تیز قوتِ شامہ شوہروں کی ہوتی ہے اور کسی جاندار کی نہیں ہوتی۔ بیوی بڑی مشکل سے پیسہ جمع کرتی ہے اور چھُپا چھُپا کر رکھتی ہے کہ بُرے بھلے وقت پر کام آئے گا۔ مگر شوہر فوراً سونگھ لیتے ہیں کہ کہاں پیسہ چھُپا کر رکھا ہے اور موقع پا کر اُڑا لے جائیں

گے۔ زیادہ شرافت دکھائیں گے تو کسی اور بہانے سے کھینچ لے جائیں گے۔ کبھی کہیں گے۔ "فلاں دوست پر اچانک آفت آگئی ہے' بے چارہ بلا وجہ مصیبت میں گرفتار ہو گیا ہے' قرض مانگتا ہے پہلی تاریخ کو واپس کر دے گا۔" بیوی یقین دلاتی ہے کہ اس کے پاس ایک پائی بھی نہیں' اُس نے تو ابھی راشن نہیں خریدا' وہ خود پہلی تاریخ کا انتظار کر رہی ہے۔ لیکن وہ ایسی ایسی مسکین شکلیں بنائیں گے جیسے کسی یتیم خانے سے اس کام کی خاص طور پر تربیت حاصل کی ہو۔ بیوی ترس کھا جاتی ہے اور مطلوبہ رقم حاضر کر دیتی ہے۔ رقم ملتے ہی بیوی کی شان میں قصیدہ گوئی شروع کر دیں گے۔ پھر پہلی تاریخ تو آتی ہے لیکن رقم کی واپسی نہیں ہوتی۔ بیوی یاددہانی بھی کراتی ہے تو خوبصورتی سے بات ٹال دی جاتی ہے۔

صبح اُٹھتے ہی سب سے پہلے کلی کئے بغیر 'بیڈ ٹی' سے شوق فرمائیں گے اور پھر اخبار کھول کر بیٹھ جائیں گے۔ اور یہ پوچھنے پر کہ آج دوپہر کیا کھائیے گا' کیا پکایا جائے تو ارشاد ہوگا "جو کھلا دو گی کھا لوں گا جو دل چاہے پکا لو۔" لیکن جب کھانے کی میز پر بیٹھیں گے تو نکتہ چینی شروع کر دیں گے۔ "واہ یہ کیا پکایا ہے' جب دیکھو آلو' ہر روز آلو' صبح آلو دوپہر آلو شام آلو رات آلو۔ شاید جناب کو صرف آلو ہی پکانے آتے ہیں" حالانکہ شادی کے ابتدائی دنوں میں جب بیوی آلو پکاتی تھی تو آلو کو دُنیا کی بہترین سبزی قرار دیا جاتا تھا اور ان کی بہت تعریف کی جاتی تھی اور اس تعریف کی وجہ سے اُن کی امّی جان ناراض رہا کرتی تھیں۔ اب بیوی وہی آلو پکاتی ہے تو نکتہ چینی ہوتی ہے اور اب امّی جان بھی خوش ہیں۔

اکثر میاں صاحب وقت بے وقت کسی دوست کو بغیر پیشگی اطلاع کئے کھانے کے لئے گھر لے آتے ہیں جیسے گھر نہ ہوا علی بابا کا انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل ہو گیا جہاں پر ہر قسم کا کھانا ہر وقت دستیاب ہوتا ہو اور یہ اُمید بھی رکھتے ہیں کہ ہر قسم کا کھانا تھوڑی سی دیر میں

تیار ہو جائے۔ نجانے ان سے کس نے کہہ دیا ہے کہ بیوی جہیز میں الہ دین کا چراغ بھی ساتھ لاتی ہے اور آنکھ جھپکنے میں ہر چیز مہیا کر سکتی ہے۔

اس بات کا تو پکا عہد کیا ہوتا ہے کہ بیوی سے کبھی سچ نہ بولا جائے۔ دنیا کو سب بات بتا دیں گے مگر بیوی سے چھپا کر رکھیں گے۔ بہانے اس خوبصورتی سے تراشتے ہیں جیسے کوئی بُت تراش سنگِ مرمر کا مجسمہ تراشتا ہے۔ جھُوٹ اور بہانہ بازی میں کوئی مقابلہ نہیں کر سکتا۔ پھر ستم یہ کہ جھُوٹ بولنے، بہانے تراشنے اور قسمیں کھا کر یقین دلانے کی ساری مشق صرف بیوی پر ہوتی ہے اور کسی دوسرے پر طبع آزمائی کی ہمت نہیں پڑتی۔

بیوی کو کہتے تو صلاح کار ہیں لیکن حلف اُٹھایا ہوتا ہے کہ بیوی جو صلاح دے اس کو نہ مانا جائے۔ ایک مزے کی بات یہ ہے کہ خفا کسی اور سے ہوتے ہیں۔ دفتر میں جھاڑ اپنے افسر سے کھاتے ہیں، ناراض ماتحتوں سے ہوتے ہیں یا کلب میں دوستوں سے لڑ جھگڑ کر آتے ہیں لیکن گھر میں آکر تمام غصّہ بیوی اور بچوں پر اتارتے ہیں۔

مزاج کا یہ عالم ہے کہ کبھی سیدھی سی بات پر بگڑ جائیں گے اور کبھی معمولی سی بات پر باچھیں کھِل جائیں گی۔ شاہانہ مزاج رکھتے ہیں۔ کبھی خوشی کی بات پر بھی خوش نہیں ہوتے اور کبھی کسی ناگوار بات پر بھی ناراض نہیں ہوتے۔ لیکن نمک کی کمی بیشی پر طوفان کھڑا کر دیتے ہیں۔ ایک رُومال جیسی چیز نہ مِلنے پر قیامت برپا کر دیتے ہیں۔

صبح سے شام تک بیوی جان مارتی رہے یہ خوش نہیں ہوتے۔ اس کی تمام محنت پر ایک فضول سی بات کہہ کر پانی پھیر دیتے ہیں۔ نوکدار فقرے بازی کا آغاز کچھ اس طرح کرتے ہیں "ماشاءاللہ کیا تربیت حاصل کی ہے۔ نمک تک کا صحیح اندازہ نہیں کبھی تو حاتم طائی بن کر سالن میں نمک کی کان اُنڈیل دی جاتی ہے اور کبھی ایسی بے نیازی کہ نمک کا نام و نشان نہیں اور سلیقے کے کیا کہنے وقت پر ایک رُومال تک تو ملتا نہیں اس گھر میں، درجنوں خرید کر لاتا ہوں مگر ملتا ایک نہیں اور اُلٹا مجھ پر الزام کہ

باہر کہیں چھوڑ آتا ہوں۔ بھلا رُومال میں کس کو دے کر آؤں گا۔ لو اور دیکھو قمیض کا بٹن غائب ہے' اب یہ میرا کام ہے یا حضور کا، تمام دن مصروف رہتی ہو مگر سمجھ میں نہیں آتا کرتی کیا ہو۔ اِدھر دفتر جانے میں دیر ہو رہی ہے اُدھر قمیض کا بٹن غائب ہے۔ کس بے سلیقہ عورت سے واسطہ پڑا ہے۔

جب کبھی بہت زیادہ ناراضگی کا اظہار مقصود ہوتا ہے تو حدیثیں بیان کرنی شروع کر دیتے ہیں۔ اپنے مطلب کی چند حدیثیں یاد کر رکھی ہیں۔ ان کے علاوہ کسی حدیث کا نہ علم ہے ان کو اور نہ جاننے کی خواہش ہے۔ عالمانہ جلال سے ارشاد ہوگا۔ "جانتی ہو کیا فرمایا ہے رسولِ اکرمؐ نے۔ اگر خدا کے بعد کسی کو سجدہ کرنے کا حکم ہوتا تو بیوی کو حکم دیا جاتا کہ وہ خاوند کو سجدہ کرے۔" لیکن اپنا تو پکا یقین ہے کہ اگر بیوی اس مجازی خدا کو اُٹھتے بیٹھتے سجدے پر سجدہ کرتی رہے تو یہ پھر بھی کبھی خوش نہ ہوں گے۔ خود یہ چاہتے ہیں کہ مہاتما گوتم بدھ کی طرح آلتی پالتی مار کر بیٹھ جائیں اور بیوی دیوداسی کی طرح ان کی پُوجا کرتی رہے۔ دوسرے لفظوں میں لاہور کے عجائب گھر یا ٹیکسلا میوزیم میں بھرتی ہو کر اَمر ہونے کی خواہش رکھتے ہیں۔

بعض اوقات بلاوجہ ناراضگی پر یہ فرمان ہوتا ہے۔ "اسلام نے جو چار شادیوں کو جائز قرار دیا ہے بالکل درُست ہے۔ جب بیوی خاوند کے کسی مصرف کی نہ ہو تو خاوند بے چارہ کیا کرے۔ دوسری شادی کے سوا اور کیا چارہ ہے بے چارے کے لیے۔" اور جب ان کی توجہ مساوات' انصاف اور متعلقہ تقاضوں کی طرف دلائی جاتی ہے تو ارشاد ہوتا ہے۔ "مانا آپ تو نورجہاں ہیں لیکن میں شہنشاہ جہانگیر نہیں' میرا کوئی محل ہے اور نہ سونے کی زنجیر۔" ہز ہائی نس راجہ اِندر بننے کا تو شوق ہے مگر ہز میجسٹی شہنشاہ جہانگیر کا نام سننا تک گوارا نہیں۔

جب حد سے زیادہ تنگ ہوتے ہیں تو زندگی کو جہنم سے تشبیہ دیتے ہیں۔ عائلی

قانون کے نافذ ہونے کی وجہ سے دوسری شادی کی دھمکی کا ناجائز رعب نہیں جما سکتے تو بیوی کو میکے بھجوانے کی دھمکی دیتے ہیں اور ساتھ ہی اعلان کر دیتے ہیں کہ خدا کی قسم اب کبھی واپس نہیں بلاؤں گا اور اگر واپس بلاؤں تو پھر خدا کی قسم میں "یہ" نہیں "وہ" ہوں گا۔ اتنی بڑی قسم کھانے کے بعد ہمیشہ نکلتے "وہ" ہی ہیں۔

لطف کی بات ہے کہ میکے بھیجتے بھی نہیں اور اگر عارضی جوش میں آکر بھیج دیتے ہیں تو ہفتے کے بعد ہی ڈاک تار کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ اپنی تکلیفوں اور مصیبتوں کا ذکر چھڑ جاتا ہے "کھانے کا کچھ مزا نہیں' صحت خراب ہوتی جا رہی ہے اور تم وہاں پر دھونی رما کر بیٹھ گئی ہو" اگر دل پر جبر کرکے بیٹھ جاتے ہیں تو بیوی کے واپس آنے تک گھر کا تمام نظام' نظام سقے کی طرح درہم برہم کر دیتے ہیں۔ ہر چیز نوکروں کے ہاتھ میں چلی جاتی ہے۔ مہینے بھر کا گھی دس دن میں غائب' چاول اور آٹے کا ذخیرہ جو کئی ماہ کے لئے کافی تھا چند ہفتوں کا رہ جاتا ہے۔ حیرت ہے بیوی سے تنگ بھی بہت ہوتے ہیں مگر اُس کے بغیر گزارہ بھی نہیں۔ بیوی کو میکے جانے کی اجازت دے دیتے ہیں تو بعد میں حالت یتیموں جیسی ہو جاتی ہے۔

خودنمائی اور خودستائی کا یہ عالم ہے کہ اکثر موقع بے موقع جتاتے رہتے ہیں کہ "اگر مجھ سے شادی نہ ہوئی ہوتی تو کسی بوڑھے سے ہوتی" اس طرح کہیں گے جیسے خود "مسٹر پاکستان" کا اعزاز حاصل کر رکھا ہو۔

ڈپلومیسی تو ان پر ختم ہے۔ پارٹی میں دوسروں کے سامنے بیوی کے غلام بنتے جائیں گے۔ دیکھنے والا سمجھے گا کہ ان پر چوبیس گھنٹے یہی کیفیت طاری رہتی ہے۔ "آپ آپ' جی جی" کرکے خطاب کریں گے' تہذیب اور اخلاق کا بہترین نمونہ نظر آئیں گے۔ اس کے بعد علیحدگی میں یعنی گھر آکر "تم تم' تُو تُو" شروع کر دیں گے یعنی بیوی غلام' میاں آقا۔ بیوی کتنی ہی خدمت کرے مگر ان کو یہی خیال رہتا ہے کہ بیوی ہو تو فلاں دوست کی

بیوی جیسی۔ واہ واکیا بات ہے اُس کی۔ ہر شوہر کو اپنے ہر دوست کی بیوی اپنی بیوی سے بہتر نظر آتی ہے۔ ان کی نظر میں دوستوں کی بیویاں عمدہ اور لذیذ کھانے پکاتی ہیں، کپڑے نفیس سیتی ہیں، بچوں کی پرورش خوب کرتی ہیں، شوہر کا بہت زیادہ اور مناسب طریقے سے خیال رکھتی ہیں۔

محبت بھری نظر پڑتی ہے تو دوسروں کی بیویوں پر اور اپنی بیویوں پر نظر پڑتی ہے تو قہر کی۔ پہلے تو بیوی کو کسی مخلوط پارٹی میں لے جانے سے احتراز کرتے ہیں اگر کسی پارٹی میں مجبوراً لے کر جاتے ہیں تو اپنی بیوی کو چھوڑ کر دوسروں کی بیویوں سے ہنس ہنس کر باتیں ہوتی ہیں۔ ان کا تعاقب شروع کر دیتے ہیں۔ بیوی گھر آکر شکایت کرتی ہے تو فراخدلی سے فرماتے ہیں۔ "آپ کو تنہا اس لئے چھوڑتا ہوں کہ آپ پر پورا پورا اعتماد ہے اور مجھے تو آپ اچھی طرح جانتی ہیں میرے کیریکٹر پر تو کوئی انگلی نہیں اُٹھا سکتا۔" سچ کہتے ہیں کیونکہ جہاں ہاتھ اُٹھانے کا موقع محل ہو وہاں اُنگلی کون اُٹھائے۔

بازار جاتے ہیں تو صاحبی کی شان میں لُٹ کر آجاتے ہیں۔ دو روپے کی چیز تین روپے میں خرید کر لاتے ہیں اور پھر اس پر ناز کرتے ہیں۔ اوّل تو بیوی کے لئے کوئی چیز خیر سے لانے کی توفیق نہیں ہوتی اگر بھولے سے سُوٹ یا قمیض کا کپڑا لے آتے ہیں تو بار بار پوچھتے ہیں۔" وہ سُوٹ کا کپڑا لایا تھا آپ کے لئے کہاں گیا۔ دبا کر رکھ دیا سُوٹ کیس میں، سِلوایا نہیں۔" حقیقت میں ان کو یہی شک رہتا ہے کہ میکے بھیج دیا ہوگا۔

شوہر کا شک و شبہ انتہا کو پہنچ جاتا ہے جب کبھی بیوی کا پھوپھی زاد، ماموں زاد، چچا زاد جن کے لئے انگریزی کا ایک ہی لفظ "کزن" ہے ملاقات کے لئے آجائے تو اُسے مشکوک نظروں سے دیکھتے ہیں کہ کہیں یہ پہلا اُمیدوار تو نہیں جواب ان کی بیوی کو ورغلانے کے لئے آیا ہو۔ جیسے اُس بے چارے کو ان کی بیوی کو ورغلانے کے سوا

دنیا میں اور کوئی کام نہ ہو۔

کئی بار کہنے اور زور دینے کے باوجود نماز بہت کم پڑھتے ہیں۔ نماز نہ پڑھنے کی تاویل میں عجیب دلیل پیش کرتے ہیں۔ "میں تو نماز باجماعت پڑھنا چاہتا ہوں لیکن مسجد کی پیشانی پر یہ مصرع "اولیں پرسشِ نماز بود" پڑھ کر لوٹ آتا ہوں۔ یہ تو سب جانتے ہیں کہ باز پُرس ہمیشہ اس بات کی ہوتی ہے جو کی جائے۔ اس کا مطلب ہے کہ سب سے پہلے روزِ محشر یہی پوچھا جائے گا کہ تم نے نماز کیوں پڑھی۔ بس میں اس خوف سے مسجد کے دروازے سے واپس آجاتا ہوں۔" سبحان اللہ کیا دلیل ہے' وہی بات ہوئی جیسے ان کے ایک دوست نے "جوابِ جاہلاں باشد خموشی" کا مطلب یہ نکالا تھا کہ "جاہل لوگ جب جواب نہیں دے سکتے تو خاموش ہو جاتے ہیں۔

اور جب کبھی وقتی جوش میں آکر بھولے سے نماز پڑھ لیتے ہیں تو ساتھ ہی وعظ و نصیحت شروع کر دیتے ہیں۔ ملازموں تک کو ہدایت فرمانے لگتے ہیں۔ "نماز پڑھا کرو' بندہِ خدا۔ کبھی تو اللہ کا نام بھی لے لیا کرو۔" نماز کا دورہ سال میں ایک آدھ بار پڑتا ہے اور وہ بھی جب کبھی کوئی مشکل درپیش ہو اور صرف نماز سے ٹل سکے یا ترقی کا مسئلہ ہو جو نماز سے حل ہو سکے ورنہ نماز کی عموماً چھٹی رہتی ہے اور اگر بیوی معمول کے مطابق قرآن شریف کی تلاوت کر رہی ہو اور خود باہر سے تشریف لے آئیں تو ارشاد ہوتا ہے۔ "اس گھر میں جب دیکھو چوبیس گھنٹے تلاوت ہی ہوتی رہتی ہے جیسے گھر میں سے جن نکالنا ہو۔ ہمارے کسی کام کی طرف توجہ نہیں۔ بیوی کی اصل عبادت تو خاوند کی خدمت ہے۔" اس فرمان کے ساتھ پھر وہی حدیث نازل ہوتی ہے "اگر خدا کے بعد کسی کو سجدہ کرنے کا حکم ہوتا تو بیوی کو حکم ہوتا کہ خاوند کو سجدہ کرے۔" اب ان سے کوئی پوچھے کہ جن لڑکیوں یا عورتوں کی ابھی شادی نہیں ہوئی وہ بے چاریاں تو بہت بڑی اصل عبادت سے محروم رہ جاتی ہوں گی۔

بیوی اگر اتفاقاً بیمار ہو جائے تو اس کے علاج کی طرف مطلق توجہ نہ دیں گے بلکہ اُلٹی سیدھی دل جلانے والی باتیں کریں گے "جب سے اس گھر میں آئی ہو ایسی ہی صحت دیکھی ہے۔ شادی سے پہلے یہاں صرف سر کے تیل کی شیشی ہوتی تھی، اب ہر طرف دواؤں کی شیشیاں بکھری پڑی ہیں۔ کبھی کوئی بیماری ہے اور کبھی کوئی۔ اونٹ کی طرح کوئی کل سیدھی نہیں۔ تمہاری بجائے اگر اونٹ سے شادی کی ہوتی تو کسی کام تو آتا۔ بیماری تو اس گھر میں اس طرح آئی ہے جیسے جہیز میں آئی ہو۔" لیکن اس کے برعکس اگر خود معمولی سے زکام میں مبتلا ہو جائیں تو تمام گھر سر پر اُٹھا لیتے ہیں جیسے بڑی خطرناک بیماری نے گھیر لیا ہو جس سے بچنا محال ہو۔

دن کو تو خیر دفتر جانا ہوتا ہے اور اس کے متعلق ہمیشہ یہ ظاہر کرتے ہیں کہ تمام دفتر اور ملک کا بوجھ ان کے نازک کندھوں پر ہے۔ اگر وہ دفتر نہ جائیں یا کام میں دلچسپی نہ لیں تو پھر ملک و ملت کا بچنا محال ہے لیکن ان کے چپڑاسی سے معلوم ہوا کہ فائل تو ایک آدھ دیکھتے ہیں لیکن چاء کے دور دن بھر چلتے ہیں، میٹنگ اور کانفرنس کے بہانے خوب گپیں چلتی ہیں۔ دفتر کے بعد کا وقت کلب میں گزر جاتا ہے۔ بچوں کی طرف تو سرے سے توجہ ہی نہیں دی جاتی۔ گھر کا انتظام بیوی کے ذمے ڈال کر خود بے فکر ہو جاتے ہیں۔ توقع رکھتے ہیں کہ مہترانی کے کام کے سوا باقی سب کام بیوی کرے جب تک کہ اُس کا اپنا کام تمام نہ ہو جائے۔ باورچن بیوی، دھوبن بیوی، گھر کی دیکھ بھال اس کے ذمے، بچوں کی تربیت تو خیر کرتی ہے، ان کی پڑھائی لکھائی کا کام بھی اُس پر ڈال دیا جاتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے "بھئی، بچوں کو بھی پڑھا دیا کرو، عالم فاضل باپ کی دُختر نیک اختر ہو۔ تم سے بہتر بچوں کو اور کون پڑھا سکتا ہے۔ تم جانتی ہو کہ میں تو تمام دن دفتر کے کاموں میں مصروف رہتا ہوں، سر اُٹھانے کی فرصت نہیں ہوتی۔" دراصل فرصت دوستوں اور کلب سے نہیں ملتی دفتر کا نام تو بدنام ہے۔ گھر میں ٹکنا محال ہوتا ہے اور جب کبھی عارضی

طور پر گھر میں خلافِ توقع ٹک جائیں تو صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ دانہ پھکا ختم ہو چکا ہے، مجبوراً گھر پر آرام فرما رہے ہیں ورنہ جب جیب گرم ہو تو گھر میں بیٹھنا حرام ہے۔

یہ خیالات شوہروں کے متعلق میرے ہی نہیں بلکہ میری بیوی کے بھی ہیں، اور ہم دونوں کو ان خیالات سے پُورا پُورا اتفاق ہے اور اتفاق بھی اس لئے کہ اتفاق میں برکت ہوتی ہے۔ لہٰذا مجھے یقین ہے کہ اکثر بیویوں کو میری بیوی کے خیالات سے اتفاق ہوگا۔ اب آپ بھی اپنی بیوی سے اتفاق کر کے میرا ساتھ دیجیے تاکہ ایسا نہ ہو کہ میں اس بھری دُنیا میں اکیلا رہ جاؤں۔

ہماری فلمیں ہمارا کلچر

(اسد بخاری کی نذر)

ہماری اُردو اور خصوصاً پنجابی فلموں میں مضحکہ خیز اور عجیب و غریب باتیں ہوتی ہیں۔ کیا باتیں ہوتی ہیں غور فرمایئے۔

۱۔ کہانی کا اصلیت سے دُور کا تعلق نہیں ہوتا۔ جو واقعات روزمرہ زندگی میں کبھی دیکھنے میں نہیں آتے وہ ہماری فلموں میں کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ انسان اس زمانے میں معجزے دیکھ لیتا ہے تو درُست ہوگا۔

۲۔ کہانی "کاک ٹیل" قسم کی ہوتی ہے جیسے بار روم کے کاؤنٹر پر بیٹھ کر لکھی گئی ہو اِدھر اُدھر سے ٹکڑے پکڑ کر جوڑ دیئے جاتے ہیں اور تسلسل نہیں ہوتا۔ بے ڈھنگے طریقے سے ٹکڑے اس طرح جوڑے جاتے ہیں جیسے کسی مست ملنگ کے کمبل میں رنگ برنگے پیوند لگے ہوں مگر کمبل کے پیوند کہانی کے بے جوڑ ٹکڑوں سے خوبصورت دکھائی دیتے ہیں۔

۳۔ اکثر کہانیاں ایک ہی پیٹنٹ قسم کی ہوتی ہیں۔ انٹرول سے پہلے دھما چوکڑی مچا کر خوب ہنسایا جاتا ہے۔ انٹرول کے بعد گیئر بدل کر پبلک کو رُلانے کی سرتوڑ کوشش کی جاتی ہے اور اکثر اس کوشش میں ہیرو یا ہیروئن کا سر بھی توڑ دیا جاتا ہے تاکہ پبلک کے دل پر اثر ہو اور رقّت طاری ہو۔ چونکہ فلم کو ختم بھی کرنا ہوتا ہے اس لئے آخر میں اچانک صُلح یا شادی کی صورت میں انجام خوشگوار کر دیا جاتا ہے۔ فلم اچانک اس طرح

ختم ہوتی ہے جیسے آجکل اچانک بجلی فیل ہوتی ہے یا اچھے بھلے صحتمند آدمی کا ہارٹ فیل ہوجاتا ہے جو گھر سے ولیمہ کھانے نکلتا ہے اور اچانک اُس کا اپنا انجام چہلم پر ہوتا ہے۔

۴۔ ہیرو، ہیروئن اور ولن کی تکون جیومیٹری کے لحاظ سے ہر کہانی میں لازمی ہوتی ہے۔ لیکن اس کے علاوہ فلمی الجبرے کے لحاظ سے ایک ایسے جوڑے کی جبری بھرتی بھی ضروری ہوتی ہے جو پبلک کو اپنی بے ہودہ حرکات اور بازاری فقرہ بازی سے ہنسا سکے۔ خچر یا گھوڑے جیسی شکل بنا کر یا کبھی ہنہنا کر اور کبھی ذو معنی فقرے کہہ کر ہنسانا اُس جوڑے کا فرض ہوتا ہے۔ یہ جوڑا کہانی میں فٹ ہوتا ہو یا نہ ہوتا ہو مگر 'فکس اپ' کر دیا جاتا ہے۔

۵۔ فلم کسی بھی شہر یعنی کراچی، لاہور، ملتان، سرگودھا، برلن، پیرس، کابل یا کسی بھی جگہ یعنی صحرا، جنگل یا سمندر کے نیچے بنائی جائے اس میں مری پہاڑ کا سین دکھانا ایسا لازمی ہے جیسے کوئی ڈاکٹر یا حکیم نسخے میں لکھ کر وصیت کر گیا ہو۔ کاش! مری ہل کی بجائے کبھی ہمیں سانگلہ ہل کا بھی کوئی سین دکھایا جائے۔

۶۔ اکثر فلمیں مار دھاڑ سے بھرپور ہوتی ہیں۔ ایک ڈالڈا خور دُبلا پتلا ہیرو، موٹے تازے وِلن اور اُس کے ہٹے کٹے ساتھیوں کو تن تنہا 'بلا شرکتِ غیرے' بہ رضا و رغبت' بلا جبر و اکراہ اپنی مرضی سے مار مار کر بے حال کر دیتا ہے۔ اُس کے ہر فولادی مُکے سے سٹین لیس سٹیل کی آواز آتی ہے۔ وہ سب کو باری باری اُٹھا کر اِدھر اُدھر پٹکے فرش پر پٹختا ہے۔ وِلن کے تین چار ساتھی بیکار 'کیو' میں کھڑے اس طرح انتظار کرتے ہیں جیسے راشن ڈپو کے سامنے قطار میں کھڑے مٹی کا تیل لینا ہو کہ کب اُن کی باری آتی ہے اور ہیرو انہیں بھی اُٹھا کر فرش پر دے مارے۔ مار کھانے میں وِلن اور اُس کے ساتھی ہیرو سے ہر طرح تعاون کرتے ہیں۔ اتحاد کا ایسا جاں پرور نظارہ کہیں اور نظر نہیں آتا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ہیرو پٹختا بھی کچھ اس طرح سائنٹفک طریقے سے ہے کہ

کسی کو چوٹ نہیں لگتی۔ کپڑے بھی سب کے ڈرائی کلین رہتے ہیں۔ اس خوفناک مار دھاڑ میں ہمٹی کٹی پلی ہوئی زنانہ ہیڈ کانسٹبل قسم کے سائز کی ہیروئن پاس کھڑی سیکنڈ ہینڈ فرنیچر توڑ تماشہ دیکھتی ہے اور عجیب عجیب قسم کی شکلیں بناتی ہے۔ اگر ہیرو اپنی مرضی سے لڑھک کر نرم ملائم قالین یا گدے دار صوفے پر گرتا ہے تو ایسی رونی شکل بناتی ہے جس پر بے ساختہ ہنسی آتی ہے اور جب ہیرو ولن کو اس کی رضامندی سے اُٹھا کر میز کے اُوپر سے کھڑکی کے پاس پھینکتا ہے تو ہیروئن کا چہرہ اس طرح کھِل اُٹھتا ہے، جسے دیکھ کر رونا آتا ہے۔

۷۔ ہیرو ایک جھٹکے سے ولن کے ہاتھ سے پستول گرا دیتا ہے۔ ولن قسطوں میں مار کھاتا ہوا پستول کے قریب گرتا ہے اور اپنے جسم کو گھسیٹ کر پستول کے اور قریب لے جاتا ہے اور جب اُس کا ہاتھ پستول سے دو ایک انچ کے فاصلے پر ہوتا ہے اور وہ پستول کو پکڑنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا ہوتا ہے جیسے جانکنی کے عالم میں ہو تو ہیرو اس کے ہاتھ پر پاؤں رکھ دیتا ہے۔ تعجب ہے ہماری ہمٹی کٹی پلی ہوئی ماڈرن ہیروئن جو دھمال شریف میں تو بہت پھرتی اور تیزی دکھاتی ہے لیکن یہاں مہاتما گوتم بدھ کے بُت کی مانند آنکھیں بند کر کے گیان دھیان میں کھڑی رہتی ہے اتنا کرم نہیں کرتی کہ پستول اُٹھا کر ہیرو کی مدد کرے۔ وہ جانتی ہے کہ ہیرو دوسری فلم میں دوسری ہیروئن کے لئے بھی اسی طرح لڑے گا، کنٹریکٹ سے پہلے اُسے کوئی نہیں مار سکتا۔

۸۔ ہمارے ہیرو اور ہیروئن نے شاید آبِ حیات یا ماءاللحم دو آتشہ بازاری نہیں بلکہ بالکل اصلی جو بطورِ تحفہ بڑے بڑے افسروں کو ہر سال سردیوں میں پیش کیا جاتا ہے، پی رکھا ہے کہ ان کی "بالی عمریا" ایک پوائنٹ پر آ کر رُک جاتی ہے۔ وہ کبھی بوڑھے نہیں ہوتے۔ چھبیس سالہ ہیرو دِگ سے مزین کالج کا طالب علم دکھایا جاتا

ہے اور وہ بھی فرسٹ ایر کا۔

۹۔ کلب یا کسی ریستوران میں رمبا سمبا قسم کے ڈانس کا سین دکھانا یا ہیروئن کا برتھ ڈے منانا یعنی چالیس سال کی عمر میں برتھ ڈے کیک پر اٹھارہ موم بتیاں بجھانا تقریباً ہر فلم کا لازمی جزو ہے۔ اس برتھ ڈے پر ناکام یا مایوس قسم کے ہیرو کا مہمانوں کے پُر زور اصرار پر کوئی المیہ گیت یا غزل خاص کر پیانو بجا کر سُنانا اور ہیروئن کا پیانو کے پاس آکر کھڑے ہونا، پیانو کے کونے پر اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں رکھ کر حسرت سے ہیرو کو دیکھنا ایک ایسا فرض بن گیا ہے جس سے فلم انڈسٹری کو دو نفلوں کا ثواب حاصل ہوتا ہو۔

۱۰۔ ہیروئن کا الٹرا ماڈرن فیشن اور نزاکت سے چلنا یعنی "نوٹر" دکھانا اور سیمابی ڈانس ہیجان خیز ہوتا ہے۔ ڈانس کرتے وقت جسم کے دو ایک قیمتی حصوں پر خاص طور سے زیادہ زور دیا جاتا ہے جس سے یہ ڈانس کلاسیکل بن جاتا ہے۔ ہیروئن کو امورِ خانہ داری سے واقفیت اتنی ضروری نہیں جتنا ڈانس میں پرفیکٹ ہونا ضروری ہے۔ ہیروئن چاہے جج کی بیٹی ہو، سرکاری وکیل کی لڑکی یا بستہ ب ملزم کی "کرٹی" اس سے فرق نہیں پڑتا، ڈانس تینوں کا "کلاس وَن" ہوتا ہے۔

۱۱۔ موقع بے موقع اور جا بے جا گانا ضرور رکھا جاتا ہے۔ کھانا کھانے سے پہلے غزل، کافی پینے کے بعد کافی، نشے کی حالت میں گیت اور مصیبت کے وقت قوالی کرنا فرض ہو کر رہ گیا ہے۔ مرنے سے پہلے کلمہ پڑھنا اتنا فرض نہیں جتنا اطمینان سے بے تکا گیت گا کر مرنا فرض ہے۔

۱۲۔ اکثر گانوں کے بول نثر کی صورت میں پڑھنے میں دشواری ہوتی ہے مگر گائے بخوبی جا سکتے ہیں اور اکثر گیتوں کے بول ایسے ہوتے ہیں کہ سینما ہال میں گیت سنتے ہوئے بیوی کی آنکھیں کھُلی ہوتی ہیں اور اُن کی چمک بڑھ جاتی ہے اور ڈیڈی کی

کی آنکھوں خود بخود بند ہو جاتی ہیں خاص کر جب ماہی ہیچی سے چھلا اتار لیتا ہے اور ہیروئن گھر جا کر ترنم کے ساتھ 'شکیت' لگانے کی دھمکی دیتی ہے یا پھر جب بہتی ندیا شور کرتی ہے اور دل ملنے کو زور کرتا ہے یا جب جھنگ کا ٹانگے والا خیر مانگتا ہے۔ ہیروئن کے حسن کی یا گھوڑی کے حسن کی، یہ فلم انڈسٹریز والوں کو معلوم ہوگا۔ یہ تو تانگے میں بیٹھ کر خیر مانگتا تھا، اب دیکھیں لوگ کاروں میں بیٹھ کر کب خیر مانگتے ہیں۔ اور پھر جب ہیروئن ملکہ ترنم کی آواز میں خواہش کرتی ہے "آ سینے نال لگ جا ٹھاہ کر کے" تو ڈیڈی کی شرم بھی ٹھاہ ہو جاتی ہے اور جب ہیروئن بھرے ہال میں حق گوئی سے کام لیتی ہے اور بے باکی سے اعتراف کرتی ہے "مینوں پیار دا سپولیا لڑ ایا ای اَدھی راتی ڈنگ مار کے جگایا ای" تو ڈیڈی یہ سوچ کر کہ اگر کوئی ماڈرن آرٹسٹ اس معرفت کے شعر کی تصویر بنائے تو کیسی خطرناک اور شرمناک بنے گی تو اس کا دل یقیناً چاہتا ہوگا کہ کاش یہ کمبخت سپولیا اس کی غیرت کو ڈس جائے۔

۱۳۔ اولیاء اللہ اور بزرگانِ دین کی درگاہ شریف پر قوالی اور دھمال شریف سے آناً فاناً ہر مراد پوری کر لی جاتی ہے۔ جتنی اس طبقے کو ان بزرگوں سے عقیدت ہے اتنا ہی ان بزرگوں کو بھی ان کا خیال ہے۔ غریب آدمی منتیں مانتا ہوا روضہ شریف کی جالی پر رنگ برنگے دھاگے باندھتا ہوا جیسے کسی نو دولیتے کے سوٹ کیس کے ہینڈل پر مختلف ایئر لائنز کے رنگ برنگے ٹوکن بندھے ہوتے ہیں، تمام عمر گزار دیتا ہے تو تب کہیں جا کر "بائی چانس" اپنی مراد کو تھوڑا سا پہنچتا ہے۔ لیکن ہیروئن کی پہلی دھمال میں ہر مراد پوری ہو جاتی ہے اور مست ملنگ بابا جی کی بیڑیاں کٹ جاتی ہیں۔

۱۴۔ عدالتوں کے ساتھ ظریفانہ سلوک کیا جاتا ہے۔ فلمی وکلاء اس انداز طور طریقے اور زور شور سے بحث کرتے ہیں جیسے موچی دروازے میں مجمع لگا کر سرمۂ محبت بیچ رہے ہوں اور جج صاحب بہادر کا صرف اتنا کام ہوتا ہے کہ عدالت میں پبلک کی طرف

سے ذرا سا شور ہو تو دو بار میز پر ہتھوڑا ماریں اور ساتھ ہی ہتھوڑے کی تال کے ساتھ سُر ملا کر دو بار آرڈر' آرڈر کہیں اور بس۔

۱۵۔ عدالت جب لکھے لکھائے دستخط شدہ فیصلے پر دوبارہ دستخط کرنے لگتی ہے اور فیصلہ ہیرو یا ہیروئن کے خلاف سُنانے کا لمحہ ہوتا ہے تو اچانک ہی کوئی ہستی عدالت میں آگھستی ہے اور دروازے پر کھڑا ہو کر حکم دیتی ہے۔ "ٹھہریئے جج صاحب ٹھہریئے!" یہ حکم اس انداز سے دیا جاتا ہے جیسے ٹیکسی ٹھہرائی جا رہی ہو۔ اور پھر وہ اچانک نمودار شدہ ہستی باوقار طریقے سے آہستہ آہستہ چل کر جج صاحب کے قریب جا کر ٹھہر جاتی ہے اور پھر بغیر اجازت اور فل سٹاپ کے تسلسل اور روانی کے ساتھ ایک مدلل تقریر شروع کر دیتی ہے اور جج صاحب بے محکمہ وزیروں کی سی یتیم صورت بنا کر نہایت صبر و سکون سے سُنتے ہیں۔ اس ہستی کے خود اعترافِ جرم کرنے پر یا اصل مجرم کی نشاندہی کرنے پر جو یقیناً ولن ہوتا ہے' پہلے مجرم کو جو ہمیشہ ہیرو ہوتا ہے جس کے لئے پھانسی کی سزا یا کم از کم عمر قید کی سزا یقینی ہوتی ہے اُسی وقت باعزت بری کر دیتے ہیں، اور اُسی لکھے لکھائے فیصلے پر دستخط بھی فوراً کر دیتے ہیں تاکہ ہیرو بری ہوتے ہی اب وہ ہیروئن کے ساتھ شادی کے لئے بری تیار کر سکے یا پھر دوسرے سیٹ پر جا کر دوسری ہیروئن کے لئے 'دوگانا' ادا کر سکے۔ جج صاحب اُٹھ کر چیمبر کی طرف بھاگتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی اور ہستی اچانک آکر فیصلہ ہی کینسل کرا دے۔ فلمی عدالت دُنیا کی پہلی اور آخری عدالت ہے جہاں فیصلے سالوں کے بجائے منٹوں میں ہوتے ہیں۔ اصلی عدالت میں تو ضابطے پورے کرتے کرتے' کاغذوں پر ٹکٹ لگاتے لگاتے اور کلرکوں کو رشوتیں دیتے دیتے کئی سال لگ جاتے ہیں۔ خدانخواستہ اگر فلموں میں اصلی عدالت ہو تو بیچارہ ہیرو تمام عمر ایک ہی کیس میں پیشیاں بھگتتے بھگتے ایک ہی فلم میں بوڑھا ہو جائے اور ہیروئن تب تک نانی اماں بن چکی ہو اور جب ہیرو کے پاس رشوت دینے کے لئے ایک پیسہ بھی نہ رہے

تو آخر میں پولیس تنگ آکر اُس کا ریمانڈ لینا بھی چھوڑ دے۔

۱۶۔ یہ بات قابلِ تعریف ہے کہ فلمی پولیس موقعہ واردات پر واردات سے پہلے موجود ہوتی ہے اور حد سے زیادہ تیزی دکھاتی ہے اور تیزی بھی ایسی جو صرف فلموں ہیں دیکھنے میں آتی ہے۔ اس بات سے بہت خوشی ہوتی ہے کہ فلموں میں پولیس کی ایمانداری مسلّم ہے۔ وہ رشوت پر لعنت بھیجتی ہے اس لئے فلموں میں تھانیدار ہمیشہ دُبلا پتلا نظر آتا ہے۔

۱۷۔ پولیس اور ڈاکوؤں کے درمیان زبردست فائرنگ ہوتی ہے۔ فائرنگ میں صرف ڈاکو سب کے سب مارے جاتے ہیں یا پھر چند ڈاکو جن کو شاید معاوضہ کم ملا ہوتا ہے میدان سے بھاگ جاتے ہیں۔ پولیس کی گولیاں ایسی بلڈ پروف ہوتی ہیں کہ جو بھی ڈاکو زخمی ہو کر گرتا ہے یا مرتا ہے اُس کے خون کا پہلا قطرہ بھی محفوظ رہتا ہے۔ اسی طرح ہماری بہادر پولیس کے تمام سپاہی وردی سمیت صاف ستھرے بچ جاتے ہیں۔ سپاہی کو مرتا شاید اس لئے نہیں دکھایا جاتا کہ کہیں اُس کے لواحقین فلم والوں سے پنشن یا وظیفے کا مطالبہ نہ کر بیٹھیں اور ابھی تو فلم والوں نے کہانی کے مصنف کو بھی پیسے نہیں دیئے ہوتے اور گیت نگار بھی آس لگائے بیٹھا ہوتا ہے۔

۱۸۔ کبھی کبھی فلموں کے نام بھی بڑے دلچسپ ہوتے ہیں۔ لیجئے آپ کے لئے ایک خوش خبری ہے۔ سُنئیے "ریشماں جوان ہوگئی" سنہری موقع ہے فائدہ اٹھائیے ایسا نہ ہو کہ بیس پچیس سال بعد سُننا پڑے "ریشماں کا سر سفید ہوگیا" یا "ریشماں کے دانت جھڑ گئے" پھر وہ آپ کے کس کام کی۔ مولانا حالؔی نے اسی موقع کے لئے کہا تھا "کچھ کر لو نوجوانو! اُٹھتی جوانیاں ہیں" ایک معصوم بچہ اگر امی سے پوچھے "امی! گرمی، سردی، بہار، خزاں اور برسات، یہ موسم تو ہوتے ہیں، یہ 'پیار کا موسم' کون سا موسم ہے اور کس مہینے میں آتا ہے اور اس میں کیا ہوتا ہے"۔ تو بتائیے امی بیچاری کیا جواب دے سکتی ہے۔

پنجابی فلموں میں ان باتوں کے علاوہ اور بھی بہت دلچسپ باتیں ہوتی ہیں، سُنیئے۔

۱۹۔ جس گاؤں کی زندگی دکھائی جاتی ہے اس سے ہمارے گاؤں کی زندگی کی عکاسی ہرگز نہیں ہوتی۔ ہو سکتا ہے وہ پنجاب کا گاؤں کسی اور ملک ہالینڈ، اٹلی، فرانس یا یونان میں واقع ہو۔ پنجاب میں ایسا گاؤں کہیں نہیں ہوتا۔

۲۰۔ ہیرو اور ہیروئن کھُلے بندوں کھیتوں میں یا کنوئیں کے اِردگرد پنجابی میں کورٹ شپ کرتے ہیں۔ نہ کوئی اُن کو دیکھنے والا ہے اور نہ روکنے والا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمام کھیت اور کنواں اُن کے لئے 'ریزرو' کر دیا گیا ہے۔ کوئی اُس طرف داخل نہیں ہو سکتا سوائے بُزدل وِلن کے جو چھُپ کر اُن کو دیکھ لیتا ہے۔ ہمارے پنجاب کے گاؤں میں ذرا سی بے غیرتی کی بات پر لٹھ چل جاتے ہیں، خون ہو جاتے ہیں، سر توڑ دیئے جاتے ہیں لیکن فلمی گاؤں میں بڑی سے بڑی بے غیرتی کی بات پر کوئی حُقّے کی چلم تک نہیں توڑتا، زیادہ سے زیادہ ایک 'بڑک' مار دی جاتی ہے۔

۲۱۔ پنجابی فلموں کا ڈانس اُردو فلموں کے ڈانس سے بہت ایڈوانس ہے۔ اس میں جو اُچھل کود مچائی جاتی ہے 'لُدکڑے' لگائے جاتے ہیں وہ اُردو فلموں کو کہاں نصیب۔ یہ ڈانس 'جمناسٹک'، 'ٹھمکوں'، 'مٹک' اور عشقیہ گیتوں کے وٹامن سے بھرپور ہوتا ہے۔ اس لئے پنجابی فلموں کی ہیروئن حد سے زیادہ صحت مند ہوتی ہے 'میٹ لیس' یعنی ناغے کے دن اُسے دیکھ کر مُنہ میں پانی بھر آتا ہے۔

۲۲۔ گاؤں کی ہیروئن کا فیشن شہری ہیروئن کے فیشن سے کسی طرح کم نہیں ہوتا۔ بلکہ کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔ وہی انگریزی طرز کے بال 'ایرانی زُلفیں' باڑے سے سمگل کردہ جاپانی ریشم کی تنگ قمیص اور ساڑھی نما سلکی دھوتی جسے 'لاچا' کہتے ہیں۔

۲۳۔ گھروں اور کمروں کی سیٹنگ گاؤں کے ماحول سے مختلف ہوتی ہے۔ ماحول میں شہریت کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ شہری خوبصورت کُتّے کے

بچے کی جگہ ہیروئن کی لاڈلی بکری کا بچہ صحن میں اُچھل کود رہا ہوتا ہے۔

۲۴۔ پنجابی فقرے اکثر ذومعنی ہوتے ہیں۔ ایک مطلب وہ ہوتا ہے جو گیلری والے سمجھتے ہیں اور دوسرا مطلب سب سے اگلی کلاس والوں کے لئے ہوتا ہے اور پھر یہ فقرے سڑکوں پر، گلیوں میں سرِعام بلا تکلف بغیر ادب و لحاظ فراخدلی سے استعمال ہوتے ہیں۔

۲۵۔ ہماری فلمیں زیادہ تر کمرشل ہوتی ہیں۔ فلم بنانے والوں کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ ان فلموں سے عوام کے اخلاق پر کیا اثر پڑے گا۔ ان کے پیشِ نظر صرف ایک قیمتی اصول ہوتا ہے کہ وہ نظیر اکبر آبادی کے الفاظ میں "روٹی تو کسی طور کما کھائے مچھندر" وہ اس اصول پر سختی سے کاربند ہوتے ہیں۔

۲۶۔ عام شکایت ہے کہ ہماری فلمیں چربہ ہوتی ہیں۔ بھارتی فلموں سے جو زائد چربی اُترتی ہے وہ ہم اپنی فلموں پر چڑھا کر چربہ بنا لیتے ہیں۔ درحقیقت ہماری فلمیں 'چربہ' کی بجائے 'مجرب' ہوتی ہیں۔

حیرت کا مقام ہے کہ سنسر بورڈ ان اخلاق سوز، اصلیت سے دُور، مجرب فلموں کو فیملی سمیت دیکھتا ہے اور ان کو آنکھیں بند کر کے پاس کرتا ہے جیسے وہیکل انسپکٹر بغیر دیکھے قابلِ مرمت ٹرک یا بس پاس کرتا ہے۔ آپ بھی چاہتے ہیں اور میں بھی چاہتا ہوں کہ ہماری فلمیں اصلیت پر مبنی ہوں۔ اخلاق سنوارتی ہوں لیکن کوئی آپ کی سنتا ہے نہ میری۔ اب ہم کس سے فریاد کریں؟ آیئے دُعا کریں کہ اللہ تعالیٰ فلم سازوں کو توفیق عطا کرے کہ وہ اچھی فلمیں بنائیں اور اچھی فلموں کو بنانے کے جو اصول ہیں ان کو ذہن میں رکھیں تاکہ فلم سنسر بورڈ کو آنکھیں بند کر کے فلمیں پاس کرنے میں دشواری نہ ہو۔ آمین۔

یونائیٹڈ کرسچین ہسپتال گلبرگ میں چند روز

(ڈاکٹر قمر زماں کی نذر)

جالندھر موٹر پارٹس راولپنڈی کے مالک قاضی علاؤالدین راوی ہیں کہ راولپنڈی کے ایک شیخ صاحب جو انسان کے گوشت کے علاوہ ہر قسم کے گوشت کا کاروبار کرتے تھے' اپنی حلال کی کمائی سے جو بکرے حلال کر کے حاصل کی تھی' حج کرنے تشریف لے گئے۔ جب حج سے واپس آئے تو دوست احباب مبارکباد دینے اُن کے گھر پہنچ گئے۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ شیخ صاحب سفر کے حالات بیان کرتے رہے۔ سوال جواب ہونے لگے۔ شیخ صاحب آجکل کے میٹرک کی طرح پڑھے لکھے واجبی ہیں' اس لئے اپنے علم اور عقل کے مطابق جواب دیتے رہے۔ کسی نے کہا "عرب تو بہت اچھا ملک ہے"۔

کہنے لگے "سبحان اللہ۔ ہر طرف اللہ کا نور ہی نور ہے۔ پیاری پیاری گلیاں' خوبصورت مقدس سڑکیں' ہر طرف اللہ کی رحمت ہی رحمت ہے۔ سبحان اللہ' کیا بات ہے عرب شریف کی۔ وہاں جا کر تو واپس آنے کو دل نہیں چاہتا"۔

کسی اور نے پوچھ لیا۔ "شیخ جی! وہاں کا موسم کیسا ہے' گرمی کا کیا حال ہے؟"

گھبرا کر فرمانے لگے۔ "گرمی' توبہ توبہ استغفار (کانوں کو ہاتھ لگا کر) گرمی ایسی کہ خدا دشمن کو بھی وہاں نہ لے جائے"۔

شیخ صاحب نے تو بغیر سوچے سمجھے بات کہہ دی لیکن درحقیقت یہ فقرہ 'خدا دشمن کو بھی وہاں نہ لے جائے' ہمارے سرکاری ہسپتالوں پر فِٹ بیٹھتا ہے ہمارے اپنے سرکاری ہسپتال صفائی سُبحان اللہ' سمارٹ نرس واہ وا' لباس نفیس اور صاف سُتھرا کیا کہنے۔ ہسپتال کے دفتر میں قالین بچھے ہوئے' صوفے لگے ہوئے' طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔ ہسپتال کا باغیچہ دیکھ کر دل باغ باغ ہو جائے۔ لیکن ہسپتال والوں کا حُسنِ اخلاق اور رویہ' خدا دشمن کو بھی واسطہ نہ ڈالے۔

تمام عمر اللہ کے فضل سے ہسپتالوں سے بچتے رہے۔ لیکن ۱۹۷۰ء میں ذاتی طور پر ہسپتال سے آمنا سامنا ہو گیا۔ بات صرف اتنی ہوئی کہ بیگم صاحبہ جنہوں نے شادی کے ۲۷ سال صحت مند گزارے تھے' اچانک ان کی طبیعت اتنی سخت خراب ہوئی کہ ہسپتال لے جانے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ میں ان دنوں محکمۂ دفاع میں تھا۔ محکمہ دفاع کے سویلین ملازمین کے لئے ایک دلچسپ قانون ہے کہ ان کا اپنا علاج سرکاری طور پر سی ایم ایچ میں ہوتا ہے اور ان کی بیویوں کا علاج سنٹرل گورنمنٹ ہسپتال میں۔ یعنی ان بے چاروں کا خالصہ کالج تو امرتسر میں ہے اور بورڈنگ ہاؤس راولپنڈی میں۔ بیگم صاحبہ فوری طور پر ہسپتال جانے پر مُصر ہوئیں اور یہاں ہسپتال جانے کا اتفاق نہ ہوا تھا۔ پریشانی سے بچنے کے لئے آفتاب اسرار نے فوراً اپنے دوست عثمان گُل کو بلایا کیونکہ وہ سی جی ایچ کے جغرافیے سے واقف تھا اور اس کا ایک دوست سی جی ایچ میں سرجن تھا۔ میں نے خود باہر سے سی جی ایچ کا بورڈ دیکھا تھا اور 'اندرونِ خانہ' سے بالکل ناواقف تھا کہ کہاں جانا ہے' کس کو ملنا ہے' کس راستے سے جانا ہے۔ اس لئے عثمان گُل کی ضرورت پڑ گئی۔

جب سی جی ایچ پہنچے تو عثمان گُل اُوپر کی منزل کی سیڑھیاں عبور کراتا ہمیں اوپریشن تھیٹر کی طرف لے گیا اور خود ڈاکٹر صاحب کو تلاش کرنے کمرے کے اندر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد ایک ڈاکٹر صاحب عثمان گل کے ساتھ تشریف لائے، اوورآل پہنا ہوا تھا، اُس پر خون کے چھینٹے تھے اور ہاتھوں پر ربڑ کے دستانے تھے جیسے بجلی ٹھیک کرنے والوں کے ہوتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اوپریشن بیچ میں چھوڑ کر آگئے ہوں۔ مریضہ کی طرف دیکھا، تکلیف کا پوچھا اور پھر یہ کہہ کر "اس بنچ پر بیٹھ کر انتظار کیجیے" واپس تشریف لے گئے۔ تقریباً ایک گھنٹہ انتظار میں گزرا۔ مریضہ کی تکلیف بڑھتی جارہی تھی اور ڈاکٹر صاحب تشریف نہ لائے۔ مجھے تشویش ہوئی، میں اُس وقت راجہ محمد سرور، مالک ناز سینما کے گھر گیا جو شہر کے بااثر اور بارسوخ انسان سمجھے جاتے ہیں اور اُن کو ساتھ لے آیا۔ اُن کے ساتھ اُن کے سینما کے مینجر بابو رحیم بھی تھے۔ راجہ سرور مجھے ڈاکٹر نوبہار کے کمرے میں لے گئے۔ ڈاکٹر صاحب کمرے میں موجود نہیں تھے، وہ اسلام آباد کسی میٹنگ میں گئے ہوئے تھے۔ راجہ صاحب نے اب بابو رحیم کو ڈاکٹر حفیظ صاحب کی تلاش میں روانہ کیا۔ معمول کے مطابق ڈاکٹر حفیظ راؤنڈ پر تھے۔ وہی بات ہے کہ جب آپ کو ٹیکسی کی ضرورت ہو تو ایک بھی نظر نہ آئے گی اور جب کبھی آپ کو ٹیکسی کی ضرورت نہ ہو تو ایک ایک منٹ کے بعد آگے پیچھے سے خالی ٹیکسیاں ہارن بجا کر آپ کو متوجہ کرتی ہوئی گزر جائیں گی۔ بابو رحیم کی دوڑ دھوپ کے بعد اتنا معلوم ہوا کہ ڈاکٹر حفیظ کسی دوسرے راستے سے اپنے کمرے کی طرف چلے گئے ہیں۔ جب راجہ صاحب اور میں ڈاکٹر حفیظ کے کمرے میں گئے تو وہ وہاں موجود تھے۔ ان کو حالات بتائے اور جب ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہوا کہ مریضہ اوپر کی منزل میں اوپریشن تھیٹر کے باہر بیٹھی ہیں تو سخت ناراض ہوئے۔ کہنے لگے "آپ پڑھے لکھے لوگ ہیں اور یہ بھی علم نہیں کہاں جانا ہے۔"

ایک پریشانی اور اُس پر پڑھے لکھے لوگوں کو جھاڑ پڑنا سب برداشت کرنا پڑا۔ بے بس پھنسا ہوا آدمی اور کیا کرسکتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب جانے یہ کیوں سمجھ بیٹھے کہ پڑھے

لکھے آدمی صرف ہسپتالوں کے چکر لگاتے رہتے ہیں، ہسپتال کا کونہ کونہ سروے کرتے رہتے ہیں اس لئے اُن کو ہسپتال کا ایک ایک اِنچ معلوم ہونا چاہیئے۔ ڈاکٹر صاحب جب ذرا ٹھنڈے ہوئے تو سب سے پہلے انہوں نے ڈاکٹر عظیمہ کے متعلق دریافت کیا کہ وہ کہاں ہیں۔ ہماری کمال بدقسمتی کہ وہ اُس روز رخصت پر تھیں۔ اکثر لوگوں سے ڈاکٹر عظیمہ کی تعریف سُنی تھی۔ اس کے بعد ڈاکٹر حفیظ نے شاید مجبور ہو کر ایک اور لیڈی ڈاکٹر کے نام چِٹ لکھ دی۔ چِٹ پر صرف اتنا لکھا تھا "مریضہ کو جلد دیکھ لیجیے" اور چِٹ ہمیں عطا کر دی۔ ہماری مزید بدقسمتی کہ ڈاکٹر صاحبہ ہسپتال میں موجود تھیں اور رخصت پر نہ تھیں۔ میں اور راجہ صاحب ڈاکٹر حفیظ کا شکریہ ادا کر کے باہر نکلے کہ سامنے سے مریضہ، آفتاب اسرار اور عثمان گل آ گئے۔ بدقسمتی سے سرجن صاحب نے اپنی چِٹ بھی اسی لیڈی ڈاکٹر کے نام لکھ کر دی۔ اب ہم سب ایک جلوس کی صورت میں اُس لیڈی ڈاکٹر کے کمرے کی طرف روانہ ہوئے تو وہ بھی اصولاً اور معمولاً راؤنڈ پر تھیں۔ باہر برآمدے میں انتظار کیا۔ ہمارے ساتھ اور بھی بہت مریض باہر برآمدے میں انتظار میں کھڑے تھے۔ تھوڑی دیر بعد کسی نے اشارہ کیا "وہ آ رہی ہیں" تمام با ادب باملاحظہ ہوشیار اور خاموش ہو گئے اور وہ شاہانہ وقار کے ساتھ جیسے ممتاز محل تاج محل میں داخل ہوئی تھی، مریضوں کے سلام کا جنبشِ ابرو سے جواب دیتی ہوئیں اپنے کمرے میں داخل ہوئیں۔ مریضہ ڈاکٹر حفیظ کی چِٹ لے کر کمرے میں چلی گئی اور ہم باہر انتظار کرنے لگے۔ دو ایک منٹ کے بعد مریضہ باہر آ گئی۔ چہرے سے تکلیف کا کم اور غصے کا زیادہ اظہار ہو رہا تھا۔ غصے میں کہنے لگی "میں اس ہسپتال اور اس لیڈی ڈاکٹر سے ہرگز علاج نہ کراؤں گی۔ مجھے فوراً لاہور لے جانے کا بندوبست کیا جائے"

پوچھنے پر بتایا کہ "اس لیڈی ڈاکٹر نے معائنہ نہایت بے دردی سے کیا ہے اور اس کا اندازِ گفتگو متکبرانہ ہے۔ چِٹ پر کچھ لکھ کر حکم دیا "جاؤ جا کر جنرل وارڈ میں داخل

ہو جاؤ۔ اس طرح تو کوئی کسی اردلی یا باورچی کی بیوی سے بھی نہیں بولتا۔ اس کے تو پاس سے بھی انسانیت نہیں گزری۔ مریضوں سے اس طرح سلوک کیا جاتا ہے۔"

اب ظاہر ہوا کہ ڈاکٹر حفیظ اس لیڈی ڈاکٹر کو چٹ لکھنے سے کیوں ہچکچا رہے تھے۔ اُس وقت طبیعت کو رنج بھی ہوا اور سخت غصہ بھی آیا۔ مریضہ نے مزید انکشاف کیا۔ "اوپریشن تھیئٹر کے باہر جو سرجن مجھے دیکھنے آیا تھا وہ پورے اوپریشن ڈریس میں تھا۔ دستانے خون آلود تھے' ایپرن پر خون کے بے شمار چھینٹے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی قصائی بکرا حلال کر کے آ رہا ہو' حالانکہ اُن کو آپریشن کا لباس اُتار کر باہر آنا چاہیئے تھا۔"

ہمارے سرکاری ہسپتالوں میں مریضوں سے جو سلوک ہوتا ہے وہ نہایت قابلِ افسوس ہے۔ ہسپتال کے سٹاف کا عوام سے رویہ ہمدردانہ نہیں ہوتا۔ دو ایک واقعات ضرور سُن لیجیے جن سے ہسپتالانہ ہمدردی کا اندازہ بخوبی ہو جائے گا۔

میری ایک عزیزہ اتفاقاً بڑے باپ کی بیٹی ہونے کی وجہ سے ایک بہت بڑے ہسپتال کے سب سے قیمتی وارڈ میں داخل تھی۔ بڑے لوگوں کی بیماریاں اور تکلیفیں بھی بہت قیمتی ہوتی ہیں۔ ان دنوں کسی وارڈ میں ایک بوڑھا آدمی جو شاید کسی بڑے آدمی کا خانساماں تھا' بیمار پڑا تھا۔ اُس کے متعلق نرسیں اکثر مذاق کیا کرتی تھیں' قہقہے لگایا کرتی تھیں۔ "چاچا اب جانے والا ہے' بڑا لمبا عرصہ کاٹ گیا' بہت تنگ کیا اِس بابے نے۔"

اور ایک شام ایک نرس بھاگتی ہوئی آئی اور دوسری نرسوں کو ہنس کر خوشخبری سنانے لگی۔ "ریتا! مبارک ہو' ایڈنا! کونگریچولیشن' چاچا گیا بابا گیا۔ چھٹی ہوئی۔" ان کو چاچے یا بابے کے مرنے کا افسوس نہ تھا بلکہ خوشی تھی ایک مریض ڈسپوز آف ہو گیا۔

ایسا ہی ایک واقعہ لاہور کے ایک مشہور ہسپتال میں ہوا۔ ایک ایسے ہی غریب بوڑھے کے متعلق پنجابی میں اظہارِ خیال ہو رہا تھا جس کا ترجمہ اردو میں اس طرح ہے۔

"اس بابے کا بچنا محال ہے، آج گیا یا کل۔ دے انجکشن اور کر پار۔ اس کی مشکل حل ہو اور چھٹکارا ہو۔" تعجب کی بات ہے کہ یہ اظہارِ خیال بڑی بے تکلفی سے مریضوں کے سامنے کیا جاتا ہے۔

ایک ذاتی واقعہ بھی سُن لیجئے۔ نظر کمزور ہوتی جا رہی تھی، آنکھیں ٹسٹ کرانے کے لئے سرکاری ہسپتال گیا۔ کمرے کے دروازے پر ایک تختی لگی ہوئی تھی۔ جو کچھ انگریزی میں لکھا تھا، اس کا اُردو میں مطلب یہ تھا۔ "اپنی باری کا انتظار کیجئے"۔ میں کمرے کے باہر برآمدے میں ٹہلنے لگا اور انتظار کرنے لگا۔ لیکن دیکھا یہ کہ تھوڑی دیر کے بعد ایک آدمی کمرے سے باہر آکر آواز لگاتا۔ "فلاں افسر کا خانساماں کدھر ہے؟ فلاں صاحب کی آیا اِدھر آجائے۔ فلاں صاحب کی بیگم صاحبہ کا ڈرائیور کہاں ہے؟" وغیرہ وغیرہ۔ ان بلائے جانے والے لوگوں میں سے کئی میرے بعد آئے تھے۔

ایک بار جب آواز لگانے والے نے کسی صاحب کے مالی یا باورچی کا نام پکارا تو مجھ سے نہ رہا گیا۔ میں نے تختی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "بھئی یہ جو انگریزی میں لکھا ہوا ہے ہمارے لئے ہے یا انگریزوں کے لئے۔ اگر یہ انگریزوں کے لئے ہے تو وہ تو کب کے چلے گئے۔ یہ تختی اُتار کر اُن کو بھیج دو اور پھر تسلی سے صاحب کے ملازموں کو آوازیں دو۔"

میں نے ذرا تیز آواز میں نیک مشورہ دیا تھا۔ میری آواز ڈاکٹر صاحب کے کانوں تک جا پہنچی۔ وہ کمرے سے باہر آئے، مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا کم گھورا زیادہ اور پھر واپس کمرے میں چلے گئے اور فوراً ہی مجھے کمرے میں طلب کر لیا اور غصے سے بحث شروع کر دی۔ "کیا نام ہے؟ کہاں کام کرتے ہو؟ قاعدہ قانون نہیں جانتے تمہارا کاغذ کہاں ہے؟" میں نرمی سے مناسب جواب دیتا رہا۔ جب ڈاکٹر صاحب زیادہ گرم ہونے لگے تو مجھے مجبوراً کہنا پڑا۔ "معاف کیجئے ڈاکٹر صاحب! میں آپ کو آنکھیں دکھانے

آیا تھا اور آپ اُلٹا مجھے آنکھیں دکھانے لگے۔ میرا کاغذ مجھے عنایت کیجیے۔ میں فیس دے کر کسی پرائیویٹ ڈاکٹر سے آنکھیں ٹسٹ کرا لوں گا۔ میں اس سرکاری سہولت سے باز آیا۔"

اس قسم کے بے شمار واقعات ہیں۔ اگر ان واقعات کو کتابی صورت دی جائے تو حجم میں انسائیکلوپیڈیا کی طرح کئی جلدیں بن سکتی ہیں۔ مگر ان کو پڑھے گا کون اور انسداد کرے گا کون ؟

اُس روز شام کی فلائٹ سے مجبوراً لاہور جانا پڑا۔ سہولت دینے والے ہسپتالوں سے خوف زدہ ہو کر ایئرپورٹ سے سیدھے گلبرگ یونائیٹڈ کرسچین ہسپتال پہنچ گئے۔ میری بیوی کی چھوٹی بہن کو آنے کی اطلاع پہنچ چکی تھی۔ وہ ایئرپورٹ پر آئی ہوئی تھی۔ اُسی کے مشورے سے گھر جانے کی بجائے سیدھے ہسپتال چلے گئے۔ اس ہسپتال کے پاس سے گزرتے ہوئے کئی بار اُسے باہر سے دیکھا تھا اور کبھی توجہ نہ کی تھی مگر اب ہسپتال کے اندر جانے کا پہلی بار اتفاق ہوا تھا۔ جب ہم انکوائری آفس میں داخل ہوئے تو اُس وقت ڈیوٹی پر مسٹر منور سنی تھے۔ "اسلام علیکم" کہہ کر کھڑے ہو گئے اور سوالیہ صورت بنا کر ہمیں دیکھنے لگے۔ مریضہ کی بہن نے بتایا کہ مریضہ راولپنڈی سے آئی ہیں اور ایمرجنسی کیس ہے۔

منور نے پوچھا۔ "مریضہ اس وقت کہاں ہیں، گھر پر یا ہسپتال کے باہر؟"

بتایا گیا۔ "باہر گاڑی میں بیٹھی ہیں۔"

منور نے پھر پوچھا۔ "انہیں ٹرالی کی ضرورت پڑے گی یا وہیل چیئر کی؟"

کہا گیا۔ "وہیل چیئر ٹھیک رہے گی۔"

یہ سن کر منور سنی باہر گئے اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے وہیل چیئر تیز رفتاری سے جا رہی تھی۔ اس غیر متوقع توجہ اور رویہ سے حیرت ہوئی۔ زیادہ سے زیادہ دو منٹ میں مریضہ کو ایمرجنسی وارڈ میں پہنچا دیا گیا اور فوراً لیڈی ڈاکٹر صباحت اور لیڈی ڈاکٹر

خالدہ کو کال سلپ بھیج دی گئی اور مریضہ کو بڑے آرام سے بیڈ پر لٹا دیا گیا۔ تھوڑی دیر میں ڈاکٹر خالدہ آ گئیں۔ سنجیدہ اور معصوم قسم کی سادی سی۔ کافی دیر تک ڈاکٹر خالدہ نے مریضہ کا معائنہ کیا' مناسب سوالوں کا جواب لیا اور مریضہ کو ہر طرح سے تسلی دی۔ پھر ڈاکٹر صباحت آ گئیں۔ ڈاکٹر خالدہ سے بات چیت کی۔ پھر مریضہ سے تسلی آمیز گفتگو کی۔ اور مریضہ کو فوری طور پر پرائیویٹ روم خالی نہ ہونے پر جنرل وارڈ میں پہنچا دیا گیا اور ساتھ ہی متعلقہ دفتر میں پرائیویٹ روم کے لئے سلپ بھیج دی گئی۔ رات گزر گئی اور صبح ایک ٹسٹ کی غرض سے چھوٹا آپریشن کیا گیا اور آپریشن کے بعد فوراً ہی مریضہ کو پرائیویٹ وارڈ میں کمرہ نمبر ۱۵۔اے میں پہنچا دیا گیا۔ اب صرف ٹسٹ کے نتیجے کا انتظار تھا۔ آپریشن کے انچارج ڈاکٹر قمر زمان ایم بی بی ایس D R C O G ' M R C O G لندن تھے۔ یہ ڈگریاں ان کے کمرے کے باہر ان کے نام کے بورڈ پر لکھی ہوئی تھیں اور میں D R C O G اور M R C O G کو مسٹر کاگ اور ڈاکٹر کاگ' پڑھتا تھا۔ لیکن ان کا مطلب کچھ اور تھا۔ مریضہ کی انچارج ڈاکٹر صباحت احسن ایم بی بی ایس تھیں۔ روز صبح و شام ڈاکٹروں کی ایک ٹیم کی ٹیم مریضہ کو دیکھنے کے لئے باقاعدگی سے آتی تھی۔ ترتیب کچھ اس طرح ہوتی تھی۔ سب سے آگے ڈاکٹر قمر زمان' ان کے پیچھے دُبلی پتلی ڈاکٹر صباحت احسن اور اُن کے پیچھے ویسی ہی دُبلی پتلی اُنیس بیس کا فرق ڈاکٹر خالدہ ہوتی تھیں۔ وہ ڈاکٹر صباحت کی کاربن کاپی لگتی تھیں۔ ڈاکٹر خالدہ کے بعد دراز قد صحت مند ڈاکٹر تسنیم ایم بی بی ایس اور ڈاکٹر تسنیم کے پیچھے چھپی ہوئی دُبلی پتلی ڈاکٹر شاہدہ ایم بی بی ایس اچانک نمودار ہوتی تھیں۔ چاروں ڈاکٹروں کے بعد ڈاکٹر شاہدہ ایسے لگتی تھیں جیسے کار کے ساتھ سٹپنی ہو۔ ان سب کے پیچھے ڈیوٹی نرس ہاتھ میں مریضہ کا ریکارڈ پکڑے ہوتی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی ڈاکٹر قمر زمان بڑی نرمی اور آہستگی سے سب کی طرف سے "اسلام علیکم" کہتے تھے۔ سب سے پہلے

ڈاکٹر صاحب مریضہ کی کیفیت پوچھتے، پھر نرس کو کچھ لکھوا دیتے تھے' ہدایات دیتے تھے۔ پھر مریضہ کو انگریزی نما اُردو میں تسلی دیتے تھے۔ ڈاکٹر کی تسلی اور میٹھے بول سے مریض کے مرض میں کافی کمی ہو جاتی ہے۔ میں نے ڈاکٹر قمر زمان کے اُردو لب و لہجہ سے اندازہ لگایا کہ ضرور امریکہ کافی عرصہ رہ کر آئے ہیں۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ ان کا تعلق خاص پشاور شہر سے ہے۔ یہ ٹیم جس در سے آتی تھی' اُسی ڈور سے واپس جاتی تھی۔ جانے سے پہلے پھر ڈاکٹر قمر زمان نرم آواز سے "اسلام علیکم" کہتے تھے۔ ان کا یہ اخلاق اور ہمدردانہ رویہ دیکھ کر میرے جسم کے روئیں روئیں سے ان سب کے لئے دُعا نکلتی تھی۔ لیکن افسوس مجھے جتنی اُن کو دُعائیں دینی چاہئیں' اتنے روئیں میرے جسم میں نہیں۔ لیکن راولپنڈی سی جی ایچ کو "دُعا" دینے کے لئے میرے جسم میں بیشمار روئیں ہیں۔

ایک شام معمول کے مطابق ڈاکٹر قمر زمان اپنی ٹیم کے ساتھ تشریف لائے اور جاتے جاتے کہنے لگے "ٹسٹ کا ریزلٹ آگیا ہے' کل صبح سب سے پہلے آپ کا آپریشن کیا جائے گا۔" اور پھر مُسکرا کر بولے "گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔"

آپریشن کے خیال ہی سے انسان سہم جاتا ہے' مریضہ نے کہا "ڈاکٹر صاحب! میں نے ساری عمر میں ایک بار بھی آپریشن نہیں کرایا۔"

ڈاکٹر صاحب اطمینان سے مُسکرا کر بولے "کوئی بات نہیں۔ کل ہو جائے گا میں آپریشن کروں گا۔" یہ ڈاکٹر صاحب نے اس بے ساختگی سے کہا کہ میں مُسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ ڈاکٹر صاحب مزید تسلی دے کر ٹیم کے ہمراہ باہر چلے گئے۔ اور نجانے کیا خیال آیا کہ چند لمحوں بعد اکیلے لوٹ آئے اور مریضہ کو پھر تسلی دی اور اطمینان دلایا کہ ڈرنے اور گھبرانے کی ضرورت نہیں' اللہ تعالیٰ کے فضل سے سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ان کے اخلاق اور ہمدردانہ رویّے سے ہم پہلے ہی متاثر تھے' اب اور زیادہ ہو گئے۔

لیکن سنٹرل گورنمنٹ ہسپتال نے جو شاخِ نہالِ غم عطا کی تھی وہ ہری کی ہری رہی۔

آپریشن کس قسم کا ہونا تھا' اس کے متعلق ڈاکٹر قمر زمان نے جو مجھے بتایا تھا اس کا مطلب یہ تھا کہ آپریشن بڑا ہے۔ مریضہ کا فیملی پلاننگ ڈیپارٹمنٹ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نکال دینا ہے اور اس کے لئے انہوں نے مجھ سے اجازت طلب کی۔ میں نے فوراً رضامندی ظاہر کی کہ اس سے بہتر حکومت سے تعاون کرنے کا اور کون سا موقع ہو سکتا تھا۔

اس خیال سے کہ مریضہ تمام رات آپریشن کے متعلق سوچ سوچ کر پریشان نہ ہو' ڈاکٹر صاحب کے حکم سے اُسے نیند کا ایک انجکشن لگا دیا گیا۔ وہ تو سو گئی مگر اس کی جگہ میں تمام رات جاگتا رہا۔ ۲۷ سالہ رفاقت تھی۔ کاش ڈاکٹر قمر زمان آئندہ بیوی کے ساتھ خاوند کو بھی ایک ایسا ہی نیند کا انجکشن لگانے کا حکم دے دیا کریں تاکہ خاوند بھی سو سکے اور رات بھر پریشان نہ ہو۔

دوسرے دن صبح مریضہ کو آپریشن تھیٹر لے گئے۔ آٹھ بجے لے کر گئے تھے اور گیارہ بجے کے قریب آپریشن ختم ہوا۔ ان تین گھنٹوں میں میرے اضطراب اور بے قراری کی حالت کا اندازہ وہی حضرات لگا سکتے ہیں جنہوں نے میری طرح ازدواجی زندگی کے ۲۷ سال ہنستے کھیلتے گزارے ہوں۔ کبھی تو میں اوپر کمرے میں چلا جاتا تھا اور خالی بیڈ کو دیکھتا تھا جس پر رات بیوی سوئی تھی۔ اور کبھی نچلی منزل میں آپریشن تھیٹر کے باہر آ کر کھڑا ہو جاتا تھا۔ نجانے میں نے یہ اضطرابی چکر کتنے لگائے۔ گیارہ بجے کے قریب ڈاکٹر قمر زمان آپریشن سے فارغ ہو کر باہر آئے میں مارک آف انٹیروگیشن بنا سامنے کھڑا تھا۔ قریب آ کر ذرا سا مسکرائے۔ اس مسکراہٹ سے مجھے کچھ اطمینان ہوا۔ مختصر الفاظ میں کہا "ہر چیز او کے"۔

مریضہ اب 'ریکوری روم' میں تھیں۔ میں اس اثنا میں ایک پرائیویٹ نرس کا

بندوبست کرنے متعلقہ دفتر گیا۔ ایک ڈیوٹی سسٹر سے پرائیویٹ نرس کے لئے درخواست کی۔ سسٹر نے ہمدردی سے کہا۔" میں لسٹ دیکھتی ہوں آج کس نرس کا آف ڈے ہے اُسے بُلاکر ابھی بھیج دیتی ہوں۔ آپ کا کمرہ نمبر کیا ہے ؟ ویسے دن اور رات کے لئے الگ الگ نرسیں ملیں گی۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے کہا اور کمرے کا نمبر بتاکر اوپر کمرے میں آگیا۔ کمرے میں آئے ابھی تین چار منٹ ہی ہوئے تھے کہ وہی سسٹر ایک نرس ساتھ لئے ہوئے کمرے میں آئی اور کہنے لگی۔" آج ثریا مریم دن کے وقت یہاں ڈیوٹی دے گی۔ اُس کا آف ڈے ہے۔ رات کے لئے میں دوسری نرس بھیج دوں گی۔"

ثریا مریم دُبلی پتلی ہنس مکھ لڑکی اُس وقت عام گھریلو لباس میں تھی۔ چند منٹ کے لئے باہر گئی اور پھر نرس کا لباس پہن کر آگئی۔ بیڈ وغیرہ درُست کرنے لگی اور ساتھ ہی بتایا کہ مریضہ کو 'ریکوری روم' سے تھوڑی دیر میں کمرے میں لایا جارہا ہے۔ ثریا مریم چند مزید چیزیں جن کی وہ ضرورت محسوس کرتی تھی' دفتر اور سٹور سے لے آئی اور پھر مریضہ کو لینے چلی گئی۔ میں بھی اُس کے ساتھ گیا۔ مریضہ کو ٹرالی میں لٹا کر لایا جارہا تھا اور ٹرالی کے ساتھ ساتھ ثریا مریم تھی۔ گلوکوز کی بوتل بھی ساتھ لگی ہوئی تھی۔ کمرے میں آکر مریضہ کو اُس کے بیڈ پر لٹا دیا گیا۔ مریضہ قدرے بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ ثریا مریم اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔ وہ مشین کی طرح کبھی نبض دیکھتی تھی، کبھی گھڑی کی طرف اور کبھی گلوکوز کی بوتل کی طرف۔ ثریا مریم کے علاوہ پرائیویٹ نرس کے طور پر مس ڈین' مس مِل اور مس فرانسس نے بھی کام کیا۔ چند دن بعد پرائیویٹ نرس کی ضرورت نہ رہی پھر بھی ثریا مریم اور مس فرانسس مریضہ کو دیکھنے اور حال پوچھنے کے لئے آجاتی تھیں۔ ان کی ہمدردی کا جذبہ قابلِ قدر ہے۔ خدا ایسا جذبہ ہمارے اپنے ہسپتالوں کے سٹاف کو بھی نصیب کرے۔ آپ

'آمین' کہہ دیں شاید دُعا قبول ہو جائے۔

دیگر سسٹرز اور نرسیں جو ڈیوٹی پر ہوتی تھیں، اپنا فرض بالکل وقت پر بجالاتی تھیں۔ کوئی دوائی دینے آرہی ہے، کوئی ٹمپریچر لینے اور کوئی بلڈ پریشر چیک کرنے۔ تمام نرسیں اپنا اپنا کام وقت کے مطابق کرتی تھیں۔ ہم نرس کو آتا دیکھ کر بغیر گھڑی دیکھے وقت بتا سکتے تھے۔ جب بلڈ پریشر چیک کرنے والی نرس آتی تھی تو ہمیں معلوم ہو جاتا تھا کہ اس وقت گھڑی میں یہ وقت ہونا چاہیے جو تقریباً ٹھیک ہوتا تھا۔ ایک واقعہ تیزی اور پھرتی سے کام کرنے کا سُن لیجیے۔ پہلے دن جب آپریشن کے بعد گلوکوز لگایا گیا تھا تو ثریا مریم نے نوٹ کیا کہ جس بازو پر سُوئی لگائی گئی تھی، وہ بازو سُوج رہا تھا، جو سُوجنا نہیں چاہیے۔ وہ فوراً جاکر بڑی سسٹر کو لے آئی۔ اُس نے آکر فوراً سُوئی بازو میں سے نکال دی اور دوبارہ جہاں سُوئی لگائی جانی چاہیے تھی وہاں لگانے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر اُس کو وہ رگ نہیں مِل رہی تھی۔ اُس نے فوراً نرس کے ہاتھ سب سے بڑی سسٹر جو امریکن تھی، اُس کو لکھ کر پیغام بھیجا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سب سے بڑی سسٹر بھی آگئی۔ اُس نے رگ تلاش کی، سُوئی لگا کر اپنی تسلّی کی اور خاموشی سے چلی گئی۔ یہ کام بہت جلد کیا گیا۔ مریضوں کا اس طرح خیال رکھنا قابلِ تعریف ہے۔

آخر ۲۱ دن کے بعد ڈاکٹر قمر زمان نے مریضہ کو ہسپتال سے گھر جانے کی اجازت دے دی۔ ہم سب ڈاکٹروں، سسٹروں اور نرسوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اور کمرے کے درو دیوار پر حسرت کی نظر ڈالتے ہوئے بارہ بجے کے قریب گھر پہنچ گئے۔ ۲۱ دن کمرے میں رہ کر کمرے سے اُنس ہو گیا تھا۔ کمرے کی ایک ایک چیز سے پیار ہو گیا تھا۔ یہاں تک کہ 'بیڈ پین' بھی نظر انداز نہ ہو سکا۔ جا تو خوشی سے رہے تھے مگر کمرہ چھوڑتے ہوئے دل اُداس ہو رہا تھا۔ دراصل اس ہسپتال میں کمرے کچھ

اس انداز سے بنائے گئے ہیں کہ ہسپتال کے کمروں کی بجائے ہوٹل کے کمرے معلوم ہوتے ہیں۔ اکثر اوقات دل چاہتا تھا کہ اگر یہ کمرہ مجھے کلیم میں مل سکے تو ضرور حاصل کر لوں۔ مگر یہ ممکن نہ تھا۔

اب کچھ یو۔سی۔ایچ کے بارے میں بھی سُن لیجئے۔

اس ہسپتال کے پانچ نام ہیں۔ انگریزی دان طبقہ اس کو یونائیٹڈ کرسچین ہوسپٹل کے نام سے پکارتا ہے۔ دوسرا نام پہلے نام کو مختصر کر کے یو۔سی۔ہسپتال کر دیا گیا۔ تیسرا نام دوسرے نام کو اور مختصر کر کے یو۔سی۔ایچ رہ جاتا ہے۔ یہاں تک تو نام کے ساتھ الجبرے کا فارمولا استعمال کیا گیا ہے۔ چوتھا نام اس کا ثقیل اردو میں متحدہ مسیحی شفاخانہ ہے۔ ان الفاظ کو ادا کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا انگریزی الفاظ کو جو پہلے نام کے ساتھ ہیں۔ اکثر اوقات اردو میں نام لیتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے "متحدہ مسیحی شفاخانہ" "متحدہ عرب جمہوریہ" کا کوئی رشتہ دار ہو۔ مگر ایسی کوئی رشتہ داری نہیں ہے۔ پانچواں اور مشہور نام جو عام لوگ، ٹیکسی والے، تانگے والے، غریب اور مزدور لوگ اس ہسپتال کو دیتے ہیں، وہ امریکن ہسپتال ہے۔ یہ سب سے آسان نام ہے۔ تانگے والوں میں خاص کر یہ خوبی ہے کہ وہ اپنی آسانی کے لئے اکثر جگہوں کے نام خود ہی رکھ دیتے ہیں۔ کسی زمانے میں گلبرگ کا نام 'رشوت پورہ' رکھ دیا تھا۔

۱۹۴۷ء میں فسادات کا دَور دورہ تھا۔ بھارت سے مہاجر پاکستان چلے آرہے تھے۔ حالت اُن کی خستہ اور خراب تھی اور زیادہ تر بیماری میں مبتلا تھے۔ اس لئے ۱۹۴۷ء میں مہاجروں کے طبی علاج کے لئے یہ ہسپتال قائم کیا گیا۔ اُس وقت یہ بہت چھوٹا سا ہسپتال تھا تاہم اس نے اُس وقت مہاجروں کی بہت خدمت کی اور پھر اس کے بعد دن بدن ہسپتال ترقی کرتا گیا اور اسے شہرت حاصل ہوتی رہی۔ ۱۹۶۵ء میں ہسپتال گلبرگ کی نئی عمارت میں منتقل ہو گیا۔ تب سے گلبرگ میں ہے اور انشاءاللہ

گلبرگ میں ہی رہے گا۔

ہسپتال کے چاروں طرف اچھے کشادہ دلکش لان ہیں۔ ان میں پھولوں کے علاوہ سرسبز گھاس بھی ہے۔ ایک بڑے لان کے باہر جس میں پھول نہ ہونے کے برابر ہیں، لکڑی کا ایک چھوٹا سا بورڈ ہے جس پر لکھا ہے "پھول توڑنا منع ہے" کسی من چلے نے جو شاید دل کا آپریشن کرانے آیا تھا، بورڈ پر سے پھول کا 'پھ' مٹا دیا ہے اور پھول کی 'و' کو 'د' بنا دیا ہے۔ اس سے پڑھا جاتا ہے "دل توڑنا منع ہے"۔ اس بورڈ کے پاس سے راستہ چائے کی کینٹین کی طرف جاتا ہے۔ ہر جنس کے ڈاکٹر لوگ، سسٹرز اور نرسیں اسی راستے سے بورڈ کی عبارت پر نظر ڈالتے ہوئے چائے پینے کے لئے جاتی ہیں۔

صدر دروازے سے بلڈنگ میں داخل ہوں تو دائیں طرف انکوائری آفس ہے۔ تمام مریض خاص VIP (VERY IMPORTANT PERSONS) عام اور VIP (VERY INFERIOR PERSONS) بلا امتیاز مذہب و ملت، رنگ و نسل داخلہ لینے کے لئے پہلے اسی آفس میں آتے ہیں: داخلہ حاصل کرنے کا یہی ایک واحد دروازہ ہے۔ چور دروازہ ابھی تک بنا نہیں۔ انکوائری آفس میں مسٹر منور سنی، مسٹر کنگزلی، مسٹر کوثر اور مسٹر گل باری باری ڈیوٹی دیتے ہیں۔ منور سنی نہایت سمارٹ، با اخلاق اور ہمدرد قسم کے نوجوان ہیں۔ باقی حضرات بھی انہی خوبیوں کے حامل ہیں۔ یہاں پر اس بات کی وضاحت غلط فہمی دور کرنے کے لئے ضروری ہے، وہ یہ کہ منور کے ساتھ سنی کا لفظ انگریزی لفظ سَن بمعنی سورج سے نکلا ہے۔ اس لئے سنی کو غلطی سے سُنّی نہ سمجھ لیا جائے، منور کرسچین ہیں۔

ہسپتال میں جدید بہترین آلات موجود ہیں۔ اس کا اپنا دواخانہ ہے جہاں پر ڈاکٹر کی تجویز کردہ ادویات مناسب قیمت پر ملتی ہیں۔ یہ ایک ایسی ضرورت ہے جو ہسپتال میں فوری طور پر پوری ہو جاتی ہے۔ ورنہ عام ہسپتالوں میں ایسا بندوبست نہیں۔ ادھر

مریض دم توڑ رہا ہوتا ہے اُدھر ڈاکٹر صاحب دوا لکھ دیتے ہیں کہ باہر سے جا کر لائی جائے۔ لیکن یہاں ایسی بات نہیں۔

جس طرح زمین گول ہے' یہ ہسپتال بھی گول ہے۔ بلکہ ایک گول چکر ہے جس سے عام آدمی پہلی بار چکر کھا جاتا ہے۔ چھوٹی سی جگہ میں بلڈنگ ہے مگر ضروریات کی تمام منزلیں موجود ہیں۔ سب سے نچلی منزل پر ہسپتال کے دفاتر' ڈاکٹروں کے کمرے' زچہ بچہ وارڈ' ایمرجنسی وارڈ' دواخانہ' ایک چھوٹی سی کاسمیٹک کی دکان اور اُس کے ساتھ عبادت کا کمرہ ہے۔ ہر مذہب و ملت کے لوگ اس میں عبادت کر سکتے ہیں۔ لیکن اکثر اس کمرے کو خالی ہی دیکھا۔ پہلی منزل میں آپریشن تھیٹر' ریکوری روم اور لگاتار نگہداشت کا کمرہ ہے۔ دوسری منزل میں پرائیویٹ وارڈ اور اس وارڈ کا دفتر ہے۔ جہاں پر سسٹر اور نرسیں چوبیس گھنٹے مریضوں کی دیکھ بھال کے لئے موجود رہتی ہیں۔ تیسری منزل میں بچوں کا وارڈ ہے۔ بچے پاک صاف اور معصوم ہوتے ہیں' اس لئے ان کے وارڈ کے اوپر چیپل (CHAPEL) ہے اور اس چیپل کے اوپر اللہ تعالیٰ' جو ہر جگہ موجود ہوتا ہے۔ ہر صبح کام شروع کرنے سے پہلے تمام نرسیں اور دیگر سٹاف اس چیپل اور اپنے اپنے وارڈ میں سازو سوز کے ساتھ دُعا کرتا ہے۔ چیپل سب سے اُوپر کی منزل میں اس لئے ہے کہ زیادہ سے زیادہ اللہ تعالیٰ کی قُربت حاصل ہو۔ اس چیپل کے سامنے ایک چھوٹا سالان ہے جس میں پھُول اور پودے لگے ہوئے ہیں۔ پودے اتنے بڑے ہیں کہ نیچے سڑک سے صاف نظر آتے ہیں۔ یہ باغ آسمان پر اس لئے بنایا گیا ہے کہ اہلِ زمین کی تیئیس سالہ دست بُرد سے محفوظ رہے۔ ایک منزل زمین کے نیچے ہے' یہاں پر نرسوں کے کھانے پینے کا بندوبست ہے۔ اس منزل سے سب سے اُوپر والی منزل تک سیڑھیاں بھی جاتی ہیں اور سیمنٹ کی ایک گول سڑک بھی چکر کھاتی ہوئی۔ سب سے اوپر کی منزل سے تمام گلبرگ اور لاہور شہر کے کچھ حصّوں کا بخوبی نظارہ ہوتا ہے۔

چونکہ یہ مسیحی ہسپتال ہے اس لئے ہسپتال میں زیادہ تر سٹاف مسیحی ہے اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے مریض تمام تر یا زیادہ تر مسلمان ہیں۔ اس حساب سے اکثریت مسلمانوں کی ہے یہی وجہ ہے کہ یہاں پر اسلام علیکم کہنے کا عام رواج ہے۔

اپنا ملک ابھی تک خودکفیل نہیں لیکن تعجب ہے کہ یہ ہسپتال خودکفیل ہے اور اپنا خرچ خود پورا کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اس ہسپتال کو کسی اور ذریعہ سے امداد نہیں ملتی ورنہ اس کا بھی وہی حال ہوتا جو دیگر امداد یافتہ ہسپتالوں کا ہے جن کے حسن سلوک سے عوام نالاں ہیں اور خدا ہی جانتا ہے کب تک نالاں رہیں گے۔

یہاں پر ڈاکٹروں میں آپس میں اتفاق دیکھا گیا۔ میں نے ڈاکٹر قمر زمان، ڈاکٹر صباحت، ڈاکٹر خالدہ، ڈاکٹر تسنیم اور ڈاکٹر شاہدہ کو ہمیشہ اکٹھے ہر جگہ آتے جاتے دیکھا۔ بعض اوقات تو ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے باسکٹ بال کی ٹیم جا رہی ہو۔ اتفاق کی اس سے اچھی مثال اور کیا ہوگی کہ یہ سب کینٹین کے لان میں اکٹھے بیٹھے ہوئے چائے بھی پیتے ہیں۔ اکثر اداروں میں تو سینئر اور جونیئر کا امتیاز آڑے آجاتا ہے اور مجھے یقین ہے کہ بل بھی سب مل کر ادا کرتے ہوں گے۔ مجھے ان ڈاکٹروں سے واسطہ پڑا تھا اس لئے ان کے متعلق مختصر طور پر سُن لیجئے۔

ڈاکٹر قمر زمان سرجن ہیں۔ ان کا تعلق پشاور سے ہے جہاں کے لوگ مہمان نوازی کے لئے دُور دُور تک مشہور ہیں۔ اگر کوئی پیر ان کے ہتھے چڑھ جائے تو وہ اُس کا اتنا احترام کرتے ہیں کہ اپنے شہر سے جانے نہیں دیتے۔ اور بے پناہ عقیدت کے جذبہ کے تحت مستقل طور پر اس کا مقبرہ بھی وہاں بنا دیتے ہیں۔ ڈاکٹر قمر زمان نے لندن سے بھی دو ڈگریاں حاصل کی ہیں۔ نہایت خوش اخلاق، سنجیدہ اور قابل سرجن ہیں۔ ان کے ہاتھ میں اللہ تعالیٰ نے شفا رکھی ہے۔ ان کے علم اور تجربہ سے ہمیں جو فائدہ پہنچا اُس کا بدلہ دینا اپنے بس کی بات نہیں۔ لیکن پھر بھی ۲۷ سالہ ازدواجی زندگی

کے اپنے تجربے سے میں نے اُن کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کی۔ وہ اس طرح کہ اپنی کتاب "یہ بیویاں یہ کلرک" کی ایک کاپی اُن کی خدمت میں پیش کی۔ اس کتاب میں بیویوں کے متعلق ایک مفصل مضمون ہے جو زیادہ تر اپنے دوست احباب اور اپنے ۲۷ سالہ ازدواجی زندگی کے تجربہ کی بنا پر لکھا گیا ہے۔ اس میں بیویوں کے اوصاف، عادات واطوار اور خصائل کا ذکر کیا گیا ہے۔ ڈاکٹر زمان نے شکریہ کے ساتھ کتاب قبول کرتے ہوئے انکشاف کیا کہ یہ کتاب اُن کو بروقت ملی ہے کیونکہ اگلے ہفتے ان کی شادی ہو رہی ہے۔ وہ یہ کتاب پڑھ کر شادی کے بعد جو حالات اور واقعات پیش آئیں گے ان کا مقابلہ کرنے کے لئے پہلے ہی تیار ہوں گے۔

ڈاکٹر صباحت احسن ایم بی بی ایس ہیں۔ دُبلی پتلی مگر صحت اچھی ہے۔ سنجیدہ قسم کی اور خاموش خاموش ہیں۔ بہت آہستہ بات کرتی ہیں اور سانس بھی بہت آہستہ آہستہ لیتی ہیں۔ بعض اوقات شک گزرتا تھا کہ شاید سانس لیتی بھی ہیں یا نہیں۔ جس طریقہ سے مریض سے پیش آتی ہیں اور اپنا فرض پورا کرتی ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے آیندہ بہت ترقی کریں گی اور قابل لیڈی ڈاکٹر بنیں گی۔

ڈاکٹر خالدہ بھی ایم بی بی ایس ہیں۔ یہ بھی دُبلی پتلی ہیں۔ یہ بھی انہیں صفات کی حامل ہیں جو ڈاکٹر صباحت میں ہیں۔ یہ بھی بہت آہستہ بات کرتی ہیں۔ اگر موقع ملے تو بات ہی نہیں کرتیں۔ ان کا سلوک بھی مریضوں سے ہمدردانہ ہے۔

ڈاکٹر تسنیم ایم بی بی ایس ہیں۔ ماشاء اللہ اچھی وجیہہ اور اعلیٰ صحت کا نمونہ ہیں۔ ان کی شخصیت (PERSONALITY) دیکھ کر مریض خود بخود صحت مند ہونے لگتا ہے۔ وہ اس ڈر سے صحت مند ہونے کی کوشش کرتا ہے کہ کہیں ڈانٹ ڈپٹ نہ دیں۔ بطور ڈاکٹر خوب سجتی ہیں۔ اچھی قابل اور ہمدرد ڈاکٹر ہیں۔ ان کی خوبیاں ڈاکٹر صباحت اور ڈاکٹر خالدہ کی خوبیوں سے کسی طرح کم نہیں۔ بلکہ اُن کی خوبیاں اور

وزن دونوں کے برابر ہیں۔ میرا خیال تھا کہ آپریشن سے پہلے مریض کو بے ہوش کرنے کا کام ان کے سپرد ہوگا اور وہ بغیر کسی دوا کے مریض کو بے ہوش کر دیتی ہوں گی۔ ان کا رُعب اور دبدبہ اتنا ہے کہ اگر وہ مریض کو اتنا کہہ دیں کہ آدھ گھنٹے کے لئے بیہوش ہو جاؤ۔ خبردار جو آنکھ کھولی یا ہلے جُلے " مجھے یقین ہے کہ مریض ان کے پُروقار اور رُعب دار چہرے سے مرعوب ہو کر بے ہوش ہونے پر مجبور ہو جائے گا۔ اگر بے ہوش نہ بھی ہو مگر آنکھیں نہ کھولے گا اور ہلے جُلے گا بھی نہیں لیکن میرا قیاس غلط نکلا کیونکہ بے ہوش کرنے کا کام کسی اور ڈاکٹر کے ذمے تھا۔ ان کا کام تو علاج کرنا اور مریض کو ہوش میں لانے کا تھا۔

ڈاکٹر شاہدہ بھی ایم بی بی ایس ہیں۔ ان کا جغرافیہ اور حدود اربعہ ڈاکٹر صباحت اور ڈاکٹر خالدہ سے بالکل ملتا جلتا ہے اور صفتیں بھی ملتی جلتی ہیں۔ ان کو تو کبھی بات چیت کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ یہ ان چاروں ڈاکٹروں کے ساتھ بالکل اس طرح تھیں جیسے کار کے ساتھ سٹپنی ہوتی ہے۔

تاہم ان ڈاکٹروں کی ٹیم بہت اچھی ہے اور ان کا ٹیم ورک بھی بہت اچھا ہے۔ سسٹرز اور نرسوں کا سلوک قابلِ تعریف ہے۔ ان کو بلایا جائے تو فوراً حاضر۔ اِدھر گھنٹی بجائی اُدھر آن کی آن میں آن موجود۔ امتیازی بات یہ دیکھی گئی کہ دیگر ہسپتالوں کا سٹاف جس کام کو ہاتھ لگانا عار سمجھتا ہے' یہ خدمت اور فرض سمجھ کر اس کام کو انجام دیتی ہیں۔ خاص بات یہ بھی دیکھی گئی کہ پرائیویٹ وارڈ کے مریضوں اور جنرل وارڈ کے مریضوں کے علاج کی طرف توجہ بالکل ایک جیسی ہوتی ہے۔ ہر ہسپتال میں عام طور پر پرائیویٹ وارڈ کے مریض کو جنرل وارڈ کے مریض پر ترجیح دی جاتی ہے۔ لیکن یہاں پر سب مریض برابر ہیں۔ کسی بڑے صاحب کا باوردی ڈرائیور اس لئے ناراض ہو کر چلا گیا کہ اُسے اوروں سے پہلے کیوں نہیں دیکھا گیا۔ اس کے مقابلے میں جنرل وارڈ

کے ایک مریض کی حالت اچانک خراب ہو گئی ۔ اُس وقت ڈیوٹی نرس مس ڈین کی گھبراہٹ اور بھاگ دوڑ دیکھنے کے قابل تھی ۔

ہسپتال میں ایک سفید ریش امریکن بزرگ بھی تشریف لاتے ہیں ۔ مریضوں کے پاس جا کر ان کی عیادت کرتے ہیں، ان کے لئے دُعا کرتے ہیں، ان کو تسلی دیتے ہیں ۔ ایک دن ہمارے کمرے میں بھی آ گئے ۔ میں نے ان سے انگریزی میں بات چیت کرنے کی کوشش کی مگر وہ بغیر کسی کوشش کے مجھ سے پنجابی بولنے لگے اور پھر پنجابی میں مریضہ کے لئے دُعا مانگی اور اُس کو تسلی دی ۔ کاش ہمارے مولوی حضرات بھی ہسپتالوں کے چکر لگایا کریں، مریضوں کی عیادت کریں، ان کی صحت کے لئے دُعا مانگیں، ان کو تسلی دیں ۔ مگر افسوس وہ تو مریضوں کے سوئم اور چہلم کا انتظار کرتے رہتے ہیں ۔

یونائیٹڈ کرسچین ہسپتال کی کارکردگی ہمارے دوسرے ہسپتالوں کی نسبت بہت بہتر ہے ۔ لیکن اس سے یہ اندازہ نہ لگایا جائے کہ اس میں خوبیاں ہی خوبیاں ہیں ۔ اس میں خامیاں بھی ہیں ۔ اس کا اندازہ میں نے اس بات سے لگایا کہ یہاں پر بھی لوئر سٹاف کی ایک ایسوسی ایشن یا یونین بن گئی ہے ۔ یونین بنانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ لوئر سٹاف کی مشکلات اور مطالبات کی طرف انتظامیہ توجہ نہیں دیتی ۔ مشکلات اور مطالبات یہ اُن کا ذاتی معاملہ ہے جو دونوں طرف سفارتی تعلقات بہتر پیدا کرنے پر طے ہو سکتا ہے ۔

چند ایک معمولی باتیں ہیں جن کی طرف انتظامیہ کو توجہ دینی چاہیئے ۔

ہفتہ اور اتوار کے دن مریضوں سے ملاقات کے لئے بچّوں کو ساتھ لانے کی عام اجازت ہے ۔ پہلے تو تندرست بچّوں کو ہسپتال میں آنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیئے ۔ بچّے بہت حسّاس ہوتے ہیں اور بیماری کا اثر جلدی قبول کرتے ہیں ۔ دوسری بات یہ ہے کہ بچّے مریض کو دیکھنے کم آتے ہیں، ان کا مقصد ہسپتال کے چکّر کی گول سڑک

پر نیچے سے اُوپر اور اُوپر سے نیچے بھاگنے دوڑنے کا ہوتا ہے۔ بچے کھیلنا کودنا اور شور مچانا شروع کر دیتے ہیں۔ جس سے مریض کا تو ایک طرف اچھے بھلے تندرست آدمی کا آرام اور سکون جاتا رہتا ہے۔ اگر بچوں کا آنا اتنا ہی ضروری ہے تو میری رائے میں ایسے وقت میں عملے کا ایک آدمی ڈیوٹی پر مقرر کیا جانا چاہیئے جو بچوں کو کھیل کود اور شور کرنے سے روکتا رہے۔

ملاقات کے لئے جو خواتین و حضرات روزانہ آتے ہیں وہ بھی اکثر کمروں کے باہر کھڑے ہو کر بات چیت، بحث مباحثہ شروع کر دیتے ہیں۔ انتظامیہ کو ایسا بندوبست کرنا چاہیئے کہ مریضوں کے آرام میں خلل نہ ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خواتین، مریضوں سے ملاقات کے بہانے نت نئے فیشن کا لباس دکھانے آتی ہیں۔ ہسپتال میں انکوائری آفس کے ساتھ ایک گلی ہے۔ اس گلی میں پبلک کال کے لئے فون کی سہولت مہیا کی گئی ہے۔ یہ بڑی خوشگوار بات ہے۔ لیکن ناگوار بات یہ ہے کہ فون کے ساتھ 'باتھ روم' ہے جس کا دروازہ سدا کھلا رہتا ہے اور باتھ روم کی مہک سے دماغ معطر رہتا ہے۔ اس طرف صفائی کا خاص خیال ہونا چاہیئے۔ بعض اوقات مہک بہت تیز ہوتی ہے بلکہ ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ پبلک کال کا خرچ فی لوکل کال ۲۰ پیسہ ہے۔ اگر پبلک فون خراب ہو جائے تو استعمال ہو رہا ہو تو انکوائری آفس کے فون کے استعمال کی اجازت ہے۔ لیکن یہاں پر لوکل کال کے ۲۵ پیسے وصول کئے جاتے ہیں۔ ۵ پیسے شاید اس لئے زائد لیئے جاتے ہیں کیونکہ یہاں پر انسان باتھ روم کی مہک سے محفوظ ہوتا ہے۔

ایک عجیب بات اور ہے کہ انکوائری آفس سے ٹرنک کال کرنے کی کال کی قیمت کے علاوہ ۵۰ پیسے فی کال زائد وصول کئے جاتے ہیں۔ اس کا جواز یہ پیش کیا جاتا ہے کہ یہ فون استعمال کرنے کے ہیں۔ میں نے کبھی ایسا نہیں دیکھا کہ کسی نے

ٹرنک کال بُک کی ہو اور فون کو ہاتھ لگائے بغیر یا استعمال کئے بغیر بات چیت کر لی ہو۔ اگر یہ بھی مان لیا جائے کہ ۵ پیسے فون کو ہاتھ لگانے کے ہیں تو پھر تعجب ہوتا ہے کہ لوکل کال کے صرف ۵ پیسے لئے جائیں۔ حالانکہ فون دونوں صورتوں میں ایک جیسا استعمال ہوتا ہے۔ بلکہ ٹرنک کال سے فون کے گھِسنے کا امکان بہت کم ہے۔ ٹرنک کال زیادہ سے زیادہ انسان تین منٹ کے لئے کرتا ہے اور لوکل کال پر تو لوگ اکثر پانچ دس منٹ تک صرف حال چال پوچھتے رہتے ہیں۔ انتظامیہ کو صرف ریسیور کو ہاتھ لگانے کے ۵۰ پیسے وصول کرنے کے متعلق ضرور سوچنا چاہیئے کہ کہیں یہ زیادتی تو نہیں

بڑے دروازے کے بعد ایک چھوٹا دروازہ آتا ہے۔ ملاقات کے مقررہ وقت کے علاوہ یہاں سے اندر جانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ لیکن مشاہدہ یہ ہے کہ اگر کوئی بے پردہ فیشن ایبل خاتون آتی ہے، تو بغیر روک ٹوک کے اندر چلی جاتی ہے اور اگر کوئی ریشمی سیاہ بُرقعے میں آئے تو اُسے صرف اتنا پوچھ کر کہ کہاں جانا ہے اندر جانے کی اجازت مِل جاتی ہے۔ اگر کوئی خاتون خدانخواستہ سفید برقعے میں ہوتی ہے تو اُسے بتا دیا جاتا ہے۔ "بی بی! ٹیم (ٹائم) نہیں"۔ یہ سہ رنگا سلوک یک رنگ کر دینا چاہیئے۔

آنکھ، ناک اور کان قریبی ہمسائے ہیں۔ بلکہ ناک اور کان تو ایک ہی چیز ہیں۔ اگر ناک کو اُلٹ دیا جائے تو کان بن جاتا ہے اور اگر کان کو اُلٹ دیا جائے تو ناک بن جاتی ہے معلوم ہوا کہ یہاں پر آنکھ، ناک اور کان کے علاج کا بندوبست نہیں ہے۔ یہ ضرور ہونا چاہیئے

ہسپتال کا کھانا ٹسٹ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ لیکن جنہوں نے ٹسٹ کیا انہوں نے عجیب سا مُنہ بنایا۔ کھانا دو قسم کا ہوتا ہے۔ درجہ اوّل ساڑھے آٹھ روپے یومیہ اور درجہ دوم اڑھائی روپے یومیہ۔ ریٹ میں نمایاں فرق ہے۔ وہی فرق جو لوکل کال اور ٹرنک کال کے لئے فون کو ہاتھ لگانے کے ریٹ میں۔

آخر میں مجھے اس بات کا اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں کہ یونائیٹڈ کرسچین ہسپتال کے سٹاف کی اعلیٰ کارکردگی، حسنِ سلوک اور جذبۂ انسانیت دیکھ کر اس کے مقابلے میں اپنے ہسپتالوں کے سٹاف کا حسنِ سلوک دیکھ کر انتہائی دُکھ ہوتا ہے اور سر ندامت سے جھک جاتا ہے۔

یو۔سی۔ایچ عرف امریکن ہسپتال مجموعی طور پر ہر لحاظ سے بہت بہتر اور بہت آگے ہے اور ہمارے اپنے ہسپتال بہ اندازہ دیگر اس سے بہت آگے ہیں۔

نوٹ :۔ یہ تمام حالات سنہء کے آخیر میں لکھے گئے تھے

ہم بھی منہ میں پان رکھتے ہیں

(حاجی محمد یوسف مالک دارالسرور کی نذر)

پان کب دریافت ہوا اسے کس نے دریافت کیا اور دریافت کرنے والے کو کیا تکلیف تھی؟ اس بات کا جواب مجھے پان کھانے والے حضرات بھی نہ دے سکے۔ لیکن اتنی بات ضرور کسی شک کے بغیر کہی جا سکتی ہے کہ پان بہت قدیم زمانے سے کھایا جا رہا ہے۔ کم از کم رامائن اور مہابھارت کے زمانے سے۔ میرے اس خیال کو اس بات سے تقویت پہنچتی ہے کہ اکثر کورو پانڈو جب کسی مشکل کام کو سرانجام دینے کا عہد کرتے تھے تو کہا کرتے تھے کہ فلاں کام کو سرانجام دینے کا میں بیڑا اُٹھاتا ہوں۔ یعنی پان کا بیڑا ہاتھ میں اُٹھا کر قسم کھائی جاتی تھی اور قسم کھانے کے بعد اُس پان کے بیڑے کو بھی کھا جاتے تھے۔ ایک بیڑے میں سات پان ہوتے تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اُس زمانے میں پان ہوتا تھا تب ہی اس کی قسم کھاتے تھے۔ دوسری بات اس سے یہ ثابت ہوتی ہے کہ پان کو بہت متبرک درجہ دیتے تھے۔

دراصل پان ایک خاص مشرقی تہذیب اور تمدن کا علمبردار ہے۔ پان بنانا اور بنا کر پیش کرنا ایک آرٹ ہے۔ اسی طرح سے پان کھانا پان بنانے سے بھی ایک بڑا آرٹ ہے۔ کس طرح انگلیوں میں نزاکت سے پکڑ کر اور کس زاویے سے منہ میں رکھا جائے کس طریقے سے اور کتنی دیر تک چبایا جائے۔ یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

اہلِ زبان یعنی اہلِ لکھنؤ اور دِلّی والے تو بڑے قاعدے کے ساتھ اور مروّجہ طریقے سے پان بناتے اور پان کھاتے ہیں۔ اور پان بنا کر خاص انداز سے مہمان کو پیش کرتے ہیں۔ لیکن بعض حضرات بڑی بے تکلفی سے پان کھاتے ہیں جیسے آم چوس رہے ہوں۔ آدھا پان مُنہ میں ہوتا ہے اور آدھا مُنہ سے باہر۔ اور ہونٹوں پر سُرخ رنگ اس طرح چڑھاتے ہیں جیسے پنجابی فلم میں ایکسٹرا اپنے ہونٹوں پر لپ سٹک کا فراخدلی کے ساتھ ناجائز استعمال کرتی ہے۔ جب کبھی مجھے ایسی صورت نظر آتی ہے تو ساتھ ہی علامہ اقبال کا ملاوٹ شدہ مصرع یاد آجاتا ہے ؎

پان کھانے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو

کہتے ہیں جتنی سانپوں کی قسمیں ہیں اتنی ہی پانوں کی قسمیں ہیں۔ لیکن سانپوں کی کتنی قسمیں ہیں نہ مجھے معلوم ہے اور نہ معلوم کرنے کی خواہش ہے۔ ہاں اگر مجھے یہ معلوم ہو جائے کہ پانوں کی کتنی قسمیں ہیں تو پھر میں فوراً بتا سکتا ہوں کہ سانپوں کی کتنی قسمیں ہیں۔ عام طور پر مشہور ہے کہ جہاں پان کا پودا ہوتا ہے وہاں پر سانپ بھی ضرور ہوتا ہے۔ بے شمار جگہیں ایسی دیکھی گئی ہیں کہ جہاں پر سانپ تو ضرور ہے مگر پان کے پودے کا نشان بھی نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ جس قسم کا پان ہو اُسی قسم کا سانپ بھی وہاں موجود ہو۔ تاہم پان کی مشہور قسمیں جو مجھے معلوم ہو سکیں یہ ہیں۔

۱ ـ سانچی پان ۲ ـ دیسی پان ۳ ـ بنگلہ پان، (میٹھا بھی ہوتا ہے اور کڑوا بھی۔ ۱۹۷۱ء سے پہلے میٹھا ہوتا تھا، بعد میں کڑ… گیا) ۴ ـ بنارسی پان ۵ ـ پستی پان ۶ ـ بیگمی پان ۷ ـ مدراسی پان ۸ ـ کلکتیہ پان : مہوبا پان یہ پان کی اعلیٰ ترین قسم ہے ۱۰ ـ کپوری پان، بہت اعلیٰ اور خوش ذائقہ ہوتا ہے۔

پان کے پرسنل سٹاف یعنی لوازمات میں عام طور پر کتھہ، چُونا، چھالیہ، لونگ، الائچی، زردہ، قوام وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ میٹھے پان میں سونف، ملٹھی وغیرہ استعمال

ہوتی ہے۔ لکھنؤ اور بھوپال میں خاص موقعوں پر ناریل، پستہ، بادام، دھنیا وغیرہ بھی پان کے ساتھ استعمال کرتے ہیں اور اس کو گٹکا کہتے ہیں۔ اور یہ گٹکا محرم کے دنوں میں استعمال میں لایا جاتا ہے۔

بعض اوقات ایسا موقع بھی آجاتا ہے کہ پان نایاب ہو جاتا ہے۔ اگر مشکل سے دستیاب ہوتا ہے تو بہت مہنگا۔ کبھی تین روپے کا ایک پتہ اور کبھی پانچ روپے کا۔ پھر اس قیمتی پان کے بے شمار ٹکڑے کر کے پان کی بجائے پان کا ٹریلر کھانے کو میسر آتا ہے۔ جسے عام زبان میں گزارہ کرنا کہتے ہیں۔ کبھی ایسا موقع بھی آجاتا ہے کہ پان ملتا ہی نہیں کسی بھی قیمت پر۔ جیسے ۱۹۶۵ء کی جنگ میں پان ایسے غائب ہوا تھا جیسے فرنٹ پر چلا گیا ہو۔ ایسے موقع پر پان کا نعم البدل امرود کے پتے، پالک کے پتے، انگور کے پتے اور بیری کے پتے دریافت کیے گئے تھے اور چھالیہ کی جگہ کھجور کی گٹھلی نے لے لی تھی۔ اللہ کا شکر ہے کہ جنگ جلد ختم کرا دی گئی۔ اگر خدانخواستہ زیادہ عرصہ جاری رہتی تو امرود اور بیری کے درخت بغیر پتوں کے دیکھنے میں آتے اور میتھی بھی اپنے جیون ساتھی پالک سے محروم ہو جاتی اور کھجور کی گٹھلیاں آیت کریمہ پڑھنے کے لئے بھی نہ ملتیں۔

پان جس برتن میں رکھے جاتے ہیں وہ مقبرے کی طرز کا گنبد نما ہوتا ہے، بالکل ایسے جیسے وائسریگل لاج دہلی کا گنبد ہے۔ اس برتن کو پاندان کہتے ہیں۔ پاندان میں الگ الگ خانے ہوتے ہیں۔ ان خانوں میں پان کا پرسنل سٹاف یا خاندان کے عزیز و اقارب یعنی لوازمات بستے ہیں۔ پان کے فلش سسٹم کو اگالدان کہتے ہیں اور یہ گلدان کی شکل کا برتن ہوتا ہے۔ لیکن قسمت گلدان جیسی نہیں ہوتی۔ اپنی اپنی قسمت اور اپنا اپنا مقدر۔ اکثر اگالدان دونوں طرف سے ایک جیسے ہوتے ہیں۔ جیسے مداری کی بڑے سائز کی ڈگڈگی ہو۔

یہ بات تو ظاہر ہے کہ جب پان کو اس کے پرسنل سٹاف کے ساتھ اتنے بڑے لاج میں رکھا جاتا ہے اور پھر بڑے بڑے گھروں میں کیوڑے میں بسایا جاتا ہے اور نقرئی ورق میں لپیٹ کر چاندی یا سونے کی طشتری میں رکھ کر ادب کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے اور مہمان ماتھے تک ہاتھ لے جا کر اور 'آداب' کہہ کر وصول کرتا ہے اور پھر نفاست کے ساتھ منہ میں رکھتا ہے تو یقیناً اس کے فوائد بھی ضرور ہوں گے۔ چند فائدے جو مجھے پان کھائے بغیر معلوم ہو سکے' یہ ہیں۔

ایک فائدہ یہ ہے کہ انسان مصروف رہتا ہے۔ اس کا منہ ہر وقت ہلتا رہتا ہے۔ دور سے ایسا دکھائی دیتا ہے جیسے وظیفہ پڑھ رہا ہو۔ منہ' زبان' لب اور دانتوں کی ایکسرسائز ہوتی رہتی ہے۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس کے کھانے سے دانت تیز اور مضبوط ہوتے ہیں دانت کس کو کاٹنے کے لئے تیز کئے جاتے ہیں یہ معلوم نہیں۔ شادی شدہ حضرات کا دانت تیز کرنا تو سمجھ میں آسکتا ہے مگر غیر شادی شدہ کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا جو دانت سخت چھالیہ توڑ سکتا ہے وہ روغن کی ہڈی جسے پنجابی میں مال کی ہڈی کہتے ہیں' اس کو کب خاطر میں لائے گا۔

تیسرا فائدہ یہ ہے کہ دانتوں پر کتھے کی تہ پر تہ چڑھ جانے سے دانت بالکل محفوظ ہو جاتے ہیں۔ بالکل ایسے جیسے دروازے پر وارنش کر دی گئی ہو اور دروازہ محفوظ ہو گیا ہو۔

چوتھا فائدہ یہ ہے کہ پان اکثر کھانے کے بعد کھایا جاتا ہے اس لئے کھانا ہضم کرتا ہے۔ کھانے سے پہلے اگر کھا لیا جائے تو پھر پتہ نہیں کون سی چیز ہضم کرتا ہے۔

پانچواں فائدہ یہ ہے کہ مسوڑھوں کو مضبوط کرتا ہے۔ اگر کسی وجہ سے مسوڑھے

مضبوط نہ ہوں تو یہ پان کھانے والے کی بدقسمتی ہے پان کا قصور نہیں۔

چھٹا فائدہ یہ ہے کہ پان کھانے والے کے منہ سے خوشبو آتی ہے۔ سانس کو صاف کرتا ہے۔ خوشبو یا تو روزہ دار کے منہ سے آتی ہے یا پھر پان کھانے والے کے منہ سے۔ اس حساب سے ظاہر ہے کہ فضیلت کے اعتبار سے روزہ دار کے بعد پان خور کا دوسرا نمبر ہے۔

ساتواں فائدہ یہ ہے کہ عام پان اور خاص کر سونف ملٹھی والا پان کھانسی نہیں ہونے دیتا۔ اگر اس کے باوجود کھانسی چھڑ جائے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت کھانسی کو روک نہیں سکتی۔

آٹھواں فائدہ یہ ہے کہ گلے کو صاف اور ملائم کرتا ہے۔ گلوکار یا گلوکارہ کے لئے نہایت مفید اور کارآمد ہے۔ ملٹھی اور سونف والا پان آواز کو شیریں اور ملائم کرتا ہے۔

نواں فائدہ یہ ہے کہ چونے سے سوز پیدا ہوتا ہے اور اگر چونا زیادہ لگ جائے تو آواز میں سوز کی جگہ سوزش پیدا ہو جاتی ہے اس لئے چونا لگوانے میں خاص احتیاط کی ضرورت ہے۔

دسواں فائدہ یہ ہے کہ اس میں کوکین چھپا کر کھائی جاتی ہے یعنی کسٹم والوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے کام آتا ہے۔

گیارہواں فائدہ یہ ہے کہ جیسا کہ میں نے پہلے کہا تھا کہ مشرقی تہذیب کا حامل ہے۔ بطور برگ سبز پیش کیا جاتا ہے۔ اسے تحفۂ درویش بھی کہا جاتا ہے۔ کسی درویش سے تحفہ ملنا تو ایک بہت بڑی بات ہے۔

بارھواں فائدہ یہ ہے کہ اس کی وجہ سے بہت سے لوگوں کا کاروبار لگا ہوا ہے۔ کئی خاندان پاندان کی بدولت پل رہے ہیں۔ جو لوگ پان کا کاروبار کرتے ہیں

ان کو پان فروش کہتے ہیں۔ اور جب پان نایاب ہو جاتا ہے اور یہی لوگ پان کا ایک ایک پتہ پانچ پانچ روپے میں بیچتے ہیں تب بھی ان کو پان فروش ہی کہا جاتا ہے حالانکہ انہیں گوہر فروش کہنا چاہیئے۔ دیکھا گیا ہے کہ ہر شہر میں پان کی دکانیں خوب چلتی ہیں۔ اور اگر دُکان جناب شورش کاشمیری کے "اُس بازار میں" یا اُس کے قریب ہو تو بہت زیادہ آمدنی کا باعث ہوتی ہے۔

اس کا ایک زنانہ فائدہ یہ بھی ہے کہ صنفِ نازک جیب خرچ کے علاوہ اکثر خاندانوں میں پان کے نام سے پاندان کا خرچ بھی وصول کرتی ہیں جو جیب اور پاندان کی جسامت دیکھتے ہوئے جیب خرچ سے ہر صورت میں زیادہ ہوتا ہو گا۔

سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ کیلشیم کی کمی کو پورا کرتا ہے۔ اگر کیلشیم کی مقدار پہلے ہی پوری ہو تو پھر مقدار کو دوگنا کرتا ہے۔

اگر آپ پان کھاتے ہیں تو باقی کے فوائد کا آپ کو خود علم ہو گا۔ اگر آپ پان نہیں کھاتے تو پھر اتنے فائدے آپ کے لئے کافی اور فائدہ مند ہیں۔

جیسے بعض ڈاکٹروں کے ہاتھ میں شفا ہوتی ہے اور وہ مشہور ہو جاتے ہیں اسی طرح پان کی خاص خاص دکانیں بہت مشہور ہوتی ہیں۔ ان دکانوں پر خوب رش ہوتا ہے۔ ان دکانوں کے مالکوں کا پان بنانے کا خاص سلیقہ ہوتا ہے۔ لاہور میں ریگل سینما کے قریب مولا بخش کی دکان بہت مشہور ہے۔ اس دکان پر دُور دُور سے پان کے دِلدادہ پیدل اور کاروں میں آتے ہیں۔ ایک پان کی خاطر جو بیس روپے گیلن کا پٹرول پھونک سکتے ہیں تو سمجھ لیجیئے مولا بخش کے ہاتھ کا پان کتنا لذت آور، سرور بخش اور اعلیٰ قسم کا ہے۔ اسی طرح راولپنڈی کے ایک علاقے لالکڑتی میں پان کی ایک مشہور دکان "دارالسرور" ہے۔ یہ دکان بہت صاف ستھری ہے۔ اس دکان سے ہر وقت خوشبو کی مہک آتی ہے۔ یہاں پر قسم قسم کے پان

ملتے ہیں۔ پانوں کی قیمت ۵۰ پیسے سے لے کر ۵۰ روپے تک ہوتی ہے۔ اس دکان کے مالک حاجی محمد یوسف ہیں۔ پانوں کے زور پر انشاء اللہ کے فضل سے حج کا فریضہ بھی ادا کر آئے ہیں۔ حاجی صاحب کے پانوں کے اتنے نام ہیں کہ اتنے نام باٹا کے جوتوں کے بھی نہیں۔ پانوں کے نام حاجی صاحب خود نہیں رکھتے بلکہ پانوں کے نام تجویز کرنے کے لئے ایوب پارک میں ایک سنڈیکیٹ سبزہ زار پر تشریف رکھتی ہے۔ تجویز کردہ ناموں پر گرما گرم بحث ہوتی ہے اور کافی غور و خوض کے بعد تجویز کردہ ناموں میں سے چند ناموں کا انتخاب کیا جاتا ہے۔

حاجی محمد یوسف صاحب نے پانوں کو ان چار حصوں میں بانٹا ہے۔

۱۔ سادہ پان ۲۔ میٹھا پان

۳۔ تمباکو والا پان ۴۔ بچوں کے لئے پان

ہر حصے میں پانوں کو جو نام دیئے گئے ہیں، اطلاعاً سن لیجئے۔

۱۔ سادہ پان :۔ اس حصہ میں پانوں کو جو نام دیئے گئے ہیں وہ یہ ہیں۔ مغلِ اعظم۔ تسکینِ قلب۔ شب بخیر۔ عمر خیام۔ نیلوفر۔ بغاوت۔ حسرت۔ زینتِ لب۔ شامِ اودھ۔ ابنِ بطوطہ۔ ہم سے مت بولو اور موں ہوں۔

ان پانوں میں ان ناموں کو مدِ نظر رکھ کر لوازمات کم و بیش کر کے ڈالے جاتے ہیں۔ ہر پان کا ذائقہ دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ ان ناموں کے سلسلے میں چند مزید نام سنڈیکیٹ کی منظوری کے لئے پیش کرتا ہوں۔

مغلِ اعظم کی نسبت سے ٹوڈر مل۔ رانا سانگا۔ ملا دو پیازہ۔ بیربل۔ ابوالفضل فیضی، بیرم خان۔ انارکلی۔ لیڈر۔ چمچہ۔ یہ نام بھی مناسب ہیں۔ اگر پان کے کسی شوقین کی نظر کمزور ہو تو اسے وہ پان دیا جائے جس کا نام 'رنجیت سنگھ' رکھا گیا ہو۔ اگر شوقین کی ٹانگ میں نقص ہو تو اس کے لئے 'تیمور لنگ' پان مناسب رہے گا۔

'حسرت' کے ساتھ مایوسی، ناکامی، نامرادی اور خودکشی اچھے نام رہیں گے۔ شام اودھ کے ساتھ ایک پان کا نام 'صبح بنارس' بھی ہونا چاہیئے۔

'ابن بطوطہ' کے تعلق سے 'ہون سانگ' فرشتہ' بھی ایک پان کا نام ضرور رکھنا چاہیئے

ہم سے نہ بولو' نام ناراضگی ظاہر کرتا ہے۔ لیکن اگر بہت زیادہ غصہ آجائے اور بہت زیادہ ناراضگی ہو جائے تو پھر ایک پان کا نام 'بکومت' رکھ دینا چاہیئے۔

۲۔ میٹھا پان۔ میٹھے پانوں میں ان پانوں کے نام آتے ہیں۔ سلام محبت پیغام محبت اقرار محبت۔ ٹیڈی۔ باغ و بہار۔ دربار عام۔ ٹوسٹ۔ ملکہ عالم۔ ملکہ ترنم اور آئے بھی رہ گئے بھی رہ۔

میری رائے میں 'پیغام محبت' کے ساتھ' ناکام محبت' نام بھی اچھا رہے گا۔ پان 'اقرار محبت' غیر شادی شدہ کے لئے اچھا اور درست ہے۔ لیکن جب شادی کو پنتیس سال کا عرصہ گذر جائے تو میاں بیوی کے لئے ایک پان کا نام 'بیزار محبت' اچھا رہے گا۔ اور جو شخص شادی سے بالکل گریز کرے اس کے لئے 'انکار محبت' 'نفرت' اور خودکشی پان مناسب رہیں گے، اور پچھتر سالہ جوڑے کے لئے 'بے کار محبت' اور 'لب گور' پان نہایت مناسب ہیں۔ اور جس شادی شدہ جوڑے کی زندگی لڑائی جھگڑے میں گذری ہو اس کے لئے پان کا نام 'جدائی' یا' طلاق' رکھنا چاہیئے۔ 'ٹیڈی' پان کے ساتھ 'بیل باٹم'، پان کا جوڑا اچھا رہے گا۔ ایک پان کا نام' ملکہ ترنم' ہے اس نام کی مناسبت سے 'ملکہ موسیقی' ملکہ ٹھمری۔ تان سین۔ بیجو باورا۔ داورا۔ میاں کی ٹوڈی۔ مہدی حسن اور اعجاز حسین حضروی۔ پانوں کے نام ضرور رکھنے چاہیں۔

جہاں پر ایک پان کا نام' آئے بھی رہ گئے بھی رہ' جیسا لمبا نام ہے۔ وہاں پر اس سے لمبا ایک پان کا نام" آکے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے' یا ہم جان ڈھونڈتے تیری محفل میں رہ گئے۔ یا پھر 'بہت بے آبرو ہو کر تیرے کوچے سے ہم نکلے' ہونا چاہیئے

باغ و بہار کے مقابلے میں 'قصہ چہار درویش' پان خوب رہے گا۔ اور دربار علم کی نسبت سے ایک پان کا نام 'کھلی کچہری' کیسا رہے گا۔ ٹوسٹ۔ پان کے ساتھ فوکس ٹراٹ۔ رمبا سمبا مناسب پان ہیں۔

۳۔ تمباکو والا پان۔ اس حصے میں ان پانوں کے نام آتے ہیں۔ فلک سیر۔ رہبر۔ راکٹ۔ غالب۔ بلبل۔ آب حیات۔ میں نشے میں ہوں۔ اور جلوس۔ یہ تمام پان تمباکو کی وجہ سے نشے کی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ ان ناموں میں مزید ناموں کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ رہبر پان کے ساتھ اگر ایک پان 'گمراہ کن' ہو تو مناسب رہے گا۔ راکٹ کے ساتھ بوئینگ بھی ایک اچھا نام ہے۔ جہاں پر ایک پان 'غالب' ہے وہاں پر سودا اور 'ذوق' بھی پان ہونے چاہئیں۔ جب ایک پان 'بلبل' ہے تو پھر 'ہنگامہ' 'بلوہ' پان نظر انداز نہیں ہونے چاہئیں۔ 'آب حیات' کی نسبت سے 'وسکی' 'وائٹ ہارس' 'بلیک اینڈ وائٹ'، 'واٹ ۶۹' مناسب نام ہیں۔

'میں نشے میں ہوں' بہت اچھا نام ہے۔ اگر اس کے ساتھ ایک پان کا نام 'نالی بنا صاف رکھو' رکھ دیا جائے تو کیا بات ہے۔ اسی سلسلے میں 'خمار' اور 'مدہوش' بھی اچھے نام ہیں 'جلوس' اس پان کا نام ہے جسے کھا کر کھانے والے کا جلوس نکل جاتا ہے جلوس میں یہ ضروری نہیں کہ ہمیشہ گلے میں پھولوں کے ہار ہی ڈالے جائیں بعض اوقات جس کا جلوس نکل رہا ہو اس پر ٹماٹر اور نئی تہذیب کے انڈے بھی پھینکے جاتے ہیں تو میری رائے میں 'جلوس' نام کے ساتھ ایک پان کا نام 'لاٹھی چارج' مناسب رہے گا۔ اور اگر کسی شخص کا بالکل بھٹہ بٹھانا ہو تو پھر ایک پان کا نام 'یاروں کا جنازہ' رکھ دینا چاہیئے اس سے بھی ایک قدم آگے اگر ایک پان کا نام 'چہلم' رکھ دیا جائے تو کیا خیال ہے آپ کا اس نام کے بارے میں۔

۴۔ بچوں کے لئے اس حصے میں صرف دو نام دیئے گئے ہیں۔ ایک چندا ماموں اور

دوسرا گڈاگڈی ۔میرے خیال میں یہ بچوں کے لئے بہت کم پان ہیں۔ ان کی تعداد بڑھا دینی چاہیئے۔ مزید نام یہ ہو سکتے ہیں کھلونا، ٹافی، کھٹی مٹھی گولی، منا منی۔ اکڑبکڑ، بیج گپ جیک اینڈ جل اور پپلے بہ سنے۔

یہ تو ہیں ان پانوں کے نام جو چار حصوں میں تقسیم کئے گئے ہیں۔ اور ان ناموں کے ساتھ میرے تجویز کردہ نام ہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ جہاں پر بچوں کے لئے پانوں کے نام ہیں وہاں پر بزرگوں یعنی ستر ستر سالہ لوگوں کے لئے بھی چند پان ہونے چاہئیں اور ان پانوں کے نام اسی قسم کے رکھے جائیں۔ 'بڈھا بڈھی' دادا دادی۔ نانا نانی۔ نگڑ دادا۔ جد امجد بزرگوار اور قریب المرگ۔ اور پنجابی بزرگ کے لئے پان کا نام ہونا چاہیئے 'منجی کتھے ڈھواں' یہ پان نرم۔ ملائم اور خستہ ہوں۔ ان میں تھوڑا چونا۔ بہت سا کتھہ اور چھالیا بالکل نہیں ہونا چاہیئے۔

میری ایک تجویز یہ بھی ہے کہ چند پان ایسے ہونے چاہئیں جو صرف خواتین کے لئے مخصوص ہوں اور مردوں کیلئے ان کا استعمال ممنوع قرار دے دیا جائے۔ یہ نام ہر قسم کی خواتین کی نیت طبیعت اور مزاج کے مطابق ہونے چاہئیں۔ مثلاً عفیفہ۔ پاکدامن۔ زاہدہ۔ اور ان ناموں کے مقابلے میں جھگڑالو۔ لڑاکا۔ اور پنجابی میں کپتی مناسب نام ہیں۔ دوسرے نام بی جمالو۔ ایکٹرلیس۔ سب کی خالہ کالج گرل۔ ماڈل گرل میرے حسن کا سنگار، اور جنرل رانی، نہایت مناسب نام ہیں۔ پنجابی کے یہ دو نام بھی شامل کرنے مناسب رہیں گے۔ ایک نام نوں سس، اور دوسرا نناں بھرجائی، ان دونوں پانوں میں مناسب توازنات کے ساتھ کافی حد تک لال مرچیں بھی شامل کی جائیں جو ان پانوں کا مطلب بھی سمجھا دیں گی۔ بلکہ تصویر کھینچ کر رکھ دیں گی۔ میں امید کرتا ہوں کہ جب کبھی حاجی۔ محمد یوسف صاحب ڈسٹرکٹ ایوب پارک کے سبزہ زار پر اپنا ہنگامی اجلاس کریں تو میرے تجویز کردہ ناموں پر بھی ضرور غور کر لیں۔ تاکہ میں جو پان کھانے کا سلیقہ نہیں رکھتا اور اس نعمت سے محروم ہوں کم از کم ثواب دارین کا حق دار تو بن جاؤں۔

سیاسی فٹ بال میچ

(وہ میچ جو جنوری ۲۰۰۳ء کو دیکھا گیا)

سٹیڈیم کھچا کھچ بھر گیا تھا۔ سٹیڈیم کے اردگرد کے درخت بھی لوگوں سے بھر گئے تھے۔ دراصل آج پیرزادہ الیون اور مفتی الیون کے درمیان فٹ بال کا فائنل میچ ہے مہمانِ خصوصی کی لمبی کار جھنڈا لہراتی ہوئی سٹیڈیم میں اُن کی تختِ نما کرسی کے سامنے آ کر رک گئی۔ جو حضرات بیٹھے تھے وہ تعظیم کے لئے کھڑے ہو گئے اور جو کھڑے تھے وہ تعظیم کے لئے جھک گئے۔ ایوب خان بھی اسی قسم کی کار میں آیا کرتے تھے۔ فرق صرف اتنا ہے۔ وہ اُن کی ذاتی سرکاری کار ہوتی تھی۔ اور یہ عوامی سرکاری کار تھی۔

معمول کے مطابق انتظامیہ ایک لائن میں کھڑی ہو گئی۔ مہمانِ خصوصی انتظامیہ سے متعارف ہو رہے تھے۔ لائن میں خورشید جیولر عرف "خورشید جیولری ہاؤس" بھی کھڑے نظر آئے۔ پاکستان بننے کے ابتدائی زمانہ میں جب کبھی خورشید صاحب اپنا تعارف کرایا کرتے تھے تو ہاتھ ملاتے ہوئے یہ ضرور کہا کرتے تھے۔ "جناب میں خورشید جیولری ہاؤس"۔ اس وقت انہوں نے سر پر سولا ہیٹ پہن رکھا تھا۔ انہوں نے فٹ بال کبھی نہیں کھیلا تھا۔ مگر وہ ہر میچ میں خورشید جیولر ہاؤس کی طرف سے ایک ٹرافی بطورِ انعام ضرور دیتے تھے۔ لاؤڈ سپیکر سے اعلان ہوا: "حضرات مہمانِ خصوصی دونوں ٹیموں کے کھلاڑیوں کو گذشتہ ۲۵ برس سے ذاتی طور پر اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس لئے ان سے

تعارف نہیں کرایا جائے گا۔ اور اب میچ شروع ہوتا ہے۔

دونوں ٹیموں کے کھلاڑی میدان میں جا چکے تھے۔ میں مہمانِ خصوصی کے شامیانے کے دائیں طرف اگلی قطار میں عوام میں گھرا کھڑا تھا۔ اس طرف پی پی پی کے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ میرے دونوں طرف کھڑے ہوئے زندہ دل عوام ساتھ ساتھ کمنٹری کر رہے تھے ہمارے سامنے میدان کے دوسری طرف کئی قسم کے رنگ برنگے جھنڈے لہرا رہے تھے۔ پیرزادہ الیون کے حامی سب ایک جگہ جمع تھے۔ لیکن مخالف ٹیم کے ہر کھلاڑی کے حامی گروہ کی صورت میں اپنے اپنے جھنڈے کے نیچے کھڑے تھے۔

اس میچ میں ایک خاص بات تھی کہ فٹ بال کھیلنے کا لباس پیرزادہ الیون کے بہت کم کھلاڑیوں نے پہن رکھا تھا۔ اور مفتی الیون کے ہر کھلاڑی نے روزمرہ کا یا مختلف قسم کا لباس پہن رکھا تھا۔

پیرزادہ الیون کے کپتان حفیظ پیرزادہ تھے۔ ان کے کھلاڑیوں کی ترتیب میدان میں اس طرح تھی۔ سردار عطا اللہ مینگل گول میں ڈٹے ہوئے تھے۔ ان کے آگے دائیں طرف خان قیوم خان اور بائیں طرف غوث بخش رئیسانی بطور فل بیک کھڑے تھے۔ قیوم خان کا سر چمک رہا تھا۔ انہوں نے خاکی قمیص اور بڑے گھیر والی خاکی نیکر پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں پشاوری چپل تھے۔ ان کی ڈھیلی ڈھالی نیکر دیکھ کر میرے دائیں طرف سے آواز آئی "اے ڈبل بیرل خان بابا نے یہ کیا پہن رکھا ہے تمبو سا"

دوسری آواز آئی۔ میرے خیال میں نیکر سے ملتی جلتی کوئی چیز ہے۔ شاید نیکری ہو۔

تیسری آواز گونجی۔ اچھا نیکر ہے میں سمجھا تھا ٹانگوں پر بستر بند باندھ رکھا ہے۔

ایک اور آواز آئی۔ انہیں ڈبل بیرل شاید اسی لئے کہتے ہیں کہ دونوں ٹانگوں سے فٹ بال کھیلتے ہیں۔ میرا مطلب ہے ایک جیسی کک لگاتے ہیں۔

غوث بخش رئیسانی نے پتلون اور بنیان پہن رکھی تھی۔ اور بنیان پر سامنے سینے

پر اور پیچھے کمر پر رومی کا نشان بنا ہوا تھا۔ سر سے ننگ تھے۔ ان کے آگے مولانا کوثر نیازی سنٹر اُف تھے۔ ان کے دائیں طرف جے اے رحیم اور بائیں طرف محمود علی قصوری تھے مولانا نیازی اچکن اور شلوار پہنے ہوئے تھے اور سر پر ٹوپی تھی۔ جے اے رحیم پورے سوٹ میں ملبوس تھے اور اوور کوٹ بھی پہنا ہوا تھا۔ اور سر پر سولا ہٹ تھا۔ ان کے مقابلے میں میاں محمود علی قصوری ململ کا کرتہ اور ململ کا پاجامہ پہنے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھ میں ایک پمفلٹ تھا اس پر قیاس آرائیاں ہونے لگیں۔

ایک آواز آئی "یہ قصوری کے ہاتھ میں کوئی قانون کی کتاب ہے"۔

دوسری آواز آئی "فٹ بال کی کانسٹی ٹیوشن ہوگی"۔

تیسری آواز آئی "جی نہیں قصور کی میتھی کا پیکٹ ہے۔ میتھی کا نمونہ ہے۔ اشتہار بازی کا یہ اچھا موقع ملا"۔

فارورڈ لائن میں پیرزادہ حفیظ سنٹر فارورڈ تھے۔ انہوں نے صرف بنیان اور انڈرویر پہن رکھا تھا۔ پاؤں میں ہوائی چپل تھی۔ ان کو دیکھ کر ایک نے کہا پیرزادہ تو خوبصورت سوٹ پہنتا ہے آج اس نے یہ کیا پہن رکھا ہے۔ ایک بنیان اور ایک انڈرویر اور ہوائی چپل دوسرے نے کہا سنٹر فارورڈ ہے نا ہلکے پھلکے لباس میں آدمی تیز بھاگ سکتا ہے"۔

تیسرے نے کہا۔ نہیں یار یہ بات نہیں۔ دراصل اس کے پاس کپڑے نہیں ہیں۔ بے چارے کے گھر چوری ہو گئی ہے۔ چور سارے سوٹ لے گئے پہرے دار پہرہ دیتے رہ گئے۔ معلوم ہوتا ہے تم لوگوں نے اخبار نہیں پڑھا۔ کل کی خبر ہے۔

ایک اور آواز آئی۔ اب سوٹ کہاں ملیں گے اگر ایک آدھ مل گیا تو پولیس پہن لے گی۔ اتنے میں کسی کی نظر حسن میر پر پڑ گئی۔ جو گراؤنڈ سے باہر ٹہل رہے تھے۔ ایک طرف سے آواز آئی "کیا حسن میر نہیں کھیل رہا وہ تو پرائمری سکول میں فٹ بال کا کپتان ہوتا۔

دوسری طرف سے کوئی بولا۔ "حسن میر بارہواں کھلاڑی ہے۔"

پہلی آواز ابھر آئی۔ کالج میں بہت اچھا فٹ بال کھیلا کرتا تھا۔ اس کا ڈاج (Dodge) مشہور ہے اسے کیوں موقع نہیں دیا گیا۔

ایک اور آواز آئی۔ اصل میں اس کے پاس محکمہ کوئی نہیں ہے۔ اس لئے باہر کھڑا کر دیا ہے۔ باقی سب کھلاڑی اپنے اپنے محکموں کے حساب سے کھڑے ہیں اور یہ بے محکمہ باہر ادھر ادھر چکر لگا رہا ہے۔ پیرزادہ کے دائیں طرف ڈاکٹر مبشر حسن اور شیخ رشید کھڑے تھے اور بائیں طرف معراج محمد خان اور محمد حنیف کھڑے تھے۔

مبشر حسن کی بنیان پر ٹیڈی پیسے کا نشان بنا ہوا تھا۔

ایک آواز آئی۔ مبشر کی بنیان پر ٹیڈی پیسے کا نشان کیسا ہے۔

کسی نے کہا۔ "مبشر حسن وزیر خزانہ ہیں اور ٹیڈی پیسہ خزانہ خالی ہونے کی نشانی ہے۔"

شیخ رشید بھی بنیان اور نیکر میں تھے۔ ان کی بنیان پر ایک پہلوان کی تصویر بنی ہوئی تھی اور ہاتھ میں گرز تھا۔

ایک آواز ابھری۔ شیخ صاحب تو بہت دبلے پتلے ہیں اور بنیان پر پہلوان کا نشان کیا بات ہوئی۔

کسی نے کہا۔ نشان وزیر صحت کا ہے۔ اور خود دبلے پتلے اس لئے ہیں کہ دوسروں کے لئے اپنی صحت کی زکوٰۃ دے رہے ہیں۔

ایک اور آواز گونجی۔ ماشاء اللہ کیا صحت ہے۔ انہیں تو ایکس رے کرانے کی ضرورت نہیں بذات خود مکمل ایکس رے نظر آ رہے ہیں۔

معراج محمد خان عوامی لباس میں تھے۔ جوگیا رنگ کا پاجامہ اور ململ کا کرتا۔ ایک کمبل نما مفلر آدھا ایک طرف اور آدھا دوسری طرف لٹک رہا تھا۔ دونوں سرے ایک سطح پر تھے

جیسے ہائی کورٹ کی پیشانی پر ترازو۔

مفتی الیون کے کپتان مفتی محمود تھے۔ ان کے کھلاڑیوں کی ترتیب عجیب بے ترتیب سی تھی۔ مفتی صاحب خود گول میں چوکڑا مار کر بیٹھے تھے۔ جیسے کسی کے "ختم" کے لئے بیٹھے ہوں انہوں نے ڈھیلا ڈھالا شرعی لباس پہن رکھا تھا۔ پاجامہ نیکر سے ذرا نیچا تھا۔ سر پر بڑا سا پگڑ تھا۔ عینک لگی ہوئی تھی۔ اور کندھے پر ایک بیلا رومال تھا جو میلاد شریف کے لڈو باندھنے کے لئے ہوتا ہے۔ ان کا منہ ہل رہا تھا۔ کسی نے کہا وظیفہ پڑھ رہے ہیں ایک نے کہا۔ وظیفہ کہاں۔ تمباکو والا پان ہے۔

ان کی ٹیم کے کھلاڑی زیادہ تر مجمع لگائے کھڑے تھے۔ جیسے کوئی سکیم بنا رہے ہوں۔

فل بیک میں اکیلی جنرل رانی مفتی صاحب کے قریب کھڑی نظر آئی۔ ریشمی شلوار اور آدھی باہوں کی ریشمی قمیص پہنے کھڑی تھی۔ لباس جسم پر فٹ تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُس نے پہنا نہیں بلکہ اُس میں کسی طرح گھس گئی ہے۔ دوپٹہ کمر کے ساتھ کس کر باندھا ہوا تھا۔ جیسے پستول کے کارتوسوں کی بیلٹی پہنتے ہیں۔ سر کے بال گوبھی کے پھول کی طرح کھلے ہوتے تھے۔ گلے میں ایک بہت بڑا توے کے برابر سونے کا لاکٹ تھا۔ اور دائیں کلائی پر ٹائم پیس کے برابر سونے کی ایک گھڑی لگی ہوئی تھی جو انٹرنیشنل ٹائم دے رہی تھی۔

کسی نے پوچھا "یہ کون خاتون ہے۔ جو اکیلی ڈیفنس لائن میں بلو رفل بیک مورچہ سنبھالے کھڑی ہے۔

کسی نے جواب دیا "ارے اسے نہیں جانتے۔ کمال کر دیا۔ یہ جنرل رانی ہے رانی۔ یحییٰ خان کی موٹی بھتیجی۔

[illegible] غلام جیلانی، سردار شوکت حیات اور ولی خان نظر آئے بلکہ

غلام جیلانی نفیس سوٹ پہنے ہوئے تھے۔ سردار شوکت حیات نے پتلون پر اچکن پہن رکھی تھی۔ جو ان کے دورِ وزارت کی یادگار تھی۔ ولی خان اپنے روزمرہ کے لباس میں تھے۔ باقی سب کھلاڑی ایک مجمع کی صورت میں کھڑے تھے۔ جیسے فٹ بال کھیلنے کی بجائے جلوس نکالنے یا بلوہ کرنے کی تیاری کر رہے ہوں۔ ان میں نمایاں طور پر نوابزادہ نصر اللہ خان فراک کوٹ اور لال ٹوپی پہنے ہاتھ میں حقہ لئے کھڑے تھے۔ اور لمبے لمبے کش اس طرح لے رہے تھے۔ جیسے کوئی آخری وقت لمبے لمبے سانس لیتا ہے۔ اسی گروہ میں احمد سعید کرمانی خوبصورت اچکن پہنے کھڑے تھے۔ وہی اچکن جسے پہن کر وہ ایوبی جلوس کی قیادت کیا کرتے تھے۔ اچکن کی باہر کی جیب میں ایک سٹین لیس سٹیل کا چمچہ تھا۔ اور بائیں ہاتھ کے گرد بجلی کی تار لپٹی ہوئی تھی۔

کسی نے کہا۔ کرمانی کی جیب میں چمکدار چمچہ اور ہاتھ پہ بجلی کی تار کیوں لپٹی ہوئی ہے

ایک نے کہا۔ چمچہ ان کا ذاتی نشان ہے یا ان کی پارٹی کا نشان ہے۔

ایک اور نے کہا۔ چمچہ ان کا ذاتی نشان ہے۔ اور ان کی اچکن کی جیب میں بیٹری (Battery) بھی ضرور ہوگی۔ جب ہارنے کا امکان ہوتا ہے تو بیٹری سے تار جوڑ کر مخالف ٹیم کے میدان میں پھینک دیتے ہیں تاکہ میدان میں بجلی کی کرنٹ آ جائے اور مخالف ٹیم کھیل نہ سکے۔

ایک مزید آواز گونجی۔ "ماجھے یاد ای۔ اک واری لاہور میدان وچ ایناں نے پانی تے نال بجلی دی کرنٹ چھڈ دتی سی۔"

اتنے میں شور سا اٹھا تو لوگوں کی نظر منتی صاحب کے گول کی طرف گئی تو دیکھا گول کے پیچھے باہر جنرل رانی اور نور جہاں بغل گیر ہو رہی تھیں۔ اور پھر ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے کچھ باتیں کرنے لگیں۔ دور سے ایسا نظر آتا تھا جیسے زمین پہ انگریزی میں ۸۰ کے ہندسے کھڑے ہوں۔

ایک آواز آئی۔ "لو بھئی ان کی آخر صلح ہو گئی۔"

دوسری آواز آئی۔ صلح کہاں میز فائر ہے۔

ایک اور آواز آئی۔ پہنچی وہیں یہ خاک جہاں کا خمیر تھا۔

ایک نے اس کا پنجابی ترجمہ کیا۔ جتھے دی کھوتی اوتھے آن کھلوتی۔

مفتی صاحب نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ جنرل رانی نورجہاں سے دوبارہ لعل گیر ہو۔ سیدان کی طرف آگئی۔ جنرل رانی مڑ مڑ کر نورجہاں کو دیکھتی جاتی تھی۔ جیسے نورجہاں حج پر جا رہی ہو۔

ایک طرف کنارے پر گراؤنڈ کے اندر اصغر خان اور گراؤنڈ کے باہر نور خان باتیں کرتے نظر آئے۔ اصغر خان بُش شرٹ اور سفید پتلون پہنے ہوئے تھے۔ اور نور خان کمبل اوڑھے ہوئے تھے۔ وہ مفتی ٹیم کے بارھویں کھلاڑی تھے۔ کیونکہ وہ آج کل گیم میں بہت کم حصہ لے رہے تھے۔

جی ایم سید عوامی کرتہ پاجامہ پہنے کسی گہری سوچ میں ڈوبے کھڑے تھے۔ مولانا محمود الحق عثمانی اور مولانا شاہ احمد نورانی ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے ایک دوسرے کو اپنی طرف کھینچ رہے تھے یا ایک دوسرے سے ہاتھ چھڑا رہے تھے۔ دونوں نے شرعی لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔

ایک آواز آئی۔ "بھئی یہ کون ہیں"

ایک نے کہا۔ سچا محمود الحق عثمانی

دوسرے نے کہا۔ کھتا شاہ احمد نورانی۔

کسی نے زور سے پکارا واہ وا کیا خوب شعر کہا ہے مکرّر مکرّر

جناب نور الامین منہ بسیٹی لئے بطور ریفری کھڑے تھے۔ . . . کسی نے پوچھا ان کا تعلق تو بیرزادہ کی ٹیم سے ہے یہ ریفری کیسے بن گئے۔

کسی نے جواب دیا۔ یہ نہ اس طرف کے ہیں اور نہ اُس طرف کے غیر جانبدار ہیں۔ ہومیو پیتھک ریفری سمجھ لو۔ دونوں ٹیموں نے ان کو ریفری مان لیا ہے۔

ریفری نے گھڑی دیکھ کر سیٹی بجائی اور میچ شروع کرنے کا اعلان کیا۔ پیرزادہ نے پہلی ہٹ لگائی بال مبشر حسن کے پاس گئی وہ لے کر آگے بڑھے۔ اُدھر سے تمام گروہ کا گروہ مبشر حسن کی طرف لپکا جیسے وہ تبرک بانٹنے لگے ہوں۔ ملک غلام جیلانی نے بال چھین کر اونچی ہٹ لگا کر بال کو دوسرے ہاف میں پھینک دیا۔ بال اونچی تھی قیوم خان نے آگے بڑھ کر بڑے زور سے ہیڈ کیا۔ بال چکرا گئی اور نوابزادہ نصراللہ خان کے پاس جا گری۔ نصراللہ خان نے حقہ زمین پر رکھا لیکن نے ہاتھ میں پکڑے رکھی اور ساتھ ہی بال پر ایک پاؤں رکھ کر کھڑے ہو گئے۔ بالکل ایسے جیسے شکاری کسی اور کے مارے ہوئے شیر پر پاؤں رکھ کر تصویر کھنچوانے کے لئے کھڑا ہوتا ہے۔ اس پر ایک طرف سے نعروں کی آواز آئی "نصر من اللہ" لوگوں نے شور کیا "فتح قریب" دوسری طرف سے لوگوں نے نصراللہ خان کا عوامی نعرہ لگا دیا۔ چند منٹ یہ نعرے بازی ہوتی رہی۔ اتنے میں معراج محمد خان بجلی کی تیزی کے ساتھ پہنچے۔ نصراللہ خان سے بال چھین کر بڑے زور سے ہٹ لگائی بال اُڑتی ہوئی بہت دور جا گری اور ساتھ ہی حقے کی چلم بھی لے اڑی۔ چلم تو گرتے ہی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ کسی نے آواز دی۔ "اس دل کے ٹکڑے ہزار ہوئے"

دوسرے نے پکارا۔ کوئی یہاں گرا کوئی وہاں گرا۔

راکھ اور کوئلے اِدھر اُدھر بکھر گئے۔ کسی نے آوازہ کسا۔ "کیا موتی بکھیرے ہیں۔" دوسری طرف سے آواز آئی۔ "ان کے بیانوں میں بھی ایسے ہی موتی جڑے ہوتے ہیں۔"

حقہ الٹ گیا اس کا پانی بہنے لگا اور میدان میں حقے کے پانی کی خوشبو پھیل گئی اِدھر بال مولانا عثمانی نے روکی اور مولانا نورانی کو پاس دیا۔ مولانا نورانی نے پھر مولانا

عثمانی کی طرف بال پھینکی اور مولانا عثمانی نے پھر مولانا نورانی کو پاس دیا۔ کسی نے پھبتی کر کہا "یہ کیا آپس میں ریوڑیاں بانٹ رہے ہیں"۔

اب مولانا نورانی نے کچھ پڑھ کر بال پر دم کیا اور کک لگانے کی کوشش کی مگر کک مس ہو گئی۔ اور مبشر حسن بال لے اڑے۔ انہوں نے بال محمد حنیف کی طرف پھینکی۔ راستے میں سردار شوکت حیات نے رکاوٹ ڈالی۔ لو گھبرا کر ایسی کک لگائی کہ بال گراؤنڈ سے باہر جا گری۔ لوگوں نے ان کی گھبراہٹ پر بہت شور کیا۔

ایک آواز گونجی۔ سردار صاحب بغیر سوچے سمجھے کک لگاتے ہیں۔

دوسری آواز آئی۔ جیسے سوچے سمجھے دوسروں پر الزام لگاتے ہیں۔ اسمبلی میں بھی فٹبال کھیلتے ہیں۔"

ٹی وی کے کیمرے پوری طرح حرکت میں آچکے تھے۔ مولانا کوثر نیازی کے پاس یقیناً مقناطیس تھا کیونکہ کیمرے گھوم پھر کر پھر ان کی طرف ہو جاتے تھے۔ ریڈیو سے کمنٹری بھی ہو رہی تھی۔ قریب ہی ایک شوقین نے ٹرانسسٹر لگا رکھا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مولانا کا نام ضرور سنا جاتا تھا۔ جیسے قوالی میں ایک مصرعے کو بار بار دہرایا جاتا ہے۔ "اب گیند مولانا سے بہت دور ہے۔ پندرہ گز کے فاصلے پر ہے۔ اور اب مولانا گیند سے پانچ گز دور ہیں۔ لو گیند پھر مولانا سے دور چلی گئی۔ اب پھر گیند مولانا کے قریب آرہی ہے۔ گیند مولانا کے سر کے اوپر سے گزر گئی۔

ایک آواز آئی "جتنا مولانا ٹی وی اور ریڈیو والوں سے بچنا چاہتے ہیں اتنا ہی وہ ان کو گھیرے میں لیتے ہیں۔

دوسری آواز آئی۔ ریڈیو والوں کی کارروائی ڈالتے اور ذکر بنانے کی پچیس سالہ پرانی عادت ایک دن میں کیسے ختم ہو سکتی ہے۔

بال اب جی ایم سید کے پاس آئی انہوں نے ولی خان کو پاس دیا۔ ولی خان

نے جھک کر بال کو ہیڈ کیا ۔ بال اصغر خان کے پاس جا پہنچی ۔ اصغر خان سے بال غوث بخش رئیسانی نے چھین لی ۔ اس وقت مفتی الیون کے حامیوں نے شور کیا: "آثار ردنی زندہ باد" غوث بخش نے فوراً ہی بال جے اے رحیم کی طرف لڑھکا دیا ۔ اب پھر نعرے لگے "پیرزادہ ہمارا" احمد سعید کرمانی نے رکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی اور اس کوشش میں ان کی جیب سے چمچ گر گیا وہ ۔ چمچ اٹھانے کے لئے جھکے قیوم خان کو موقع مل گیا ۔ انہوں نے آگے بڑھ کر اس زور سے نشانہ باندھ کر کک لگائی کہ بال کرمانی کی "تشریف" سے ٹکراتی ہوئی محمد حنیف کے پاس جا پہنچی ۔ محمد حنیف نے بال کو روکا اور ادھر ادھر دیکھنے لگے کہ اب بال کس کو پاس کریں ۔ پھر ایک گروہ کی طرف سے نعرے بلند ہوئے "جھگی دو ۔ کوٹھا دو" ۔ محمد حنیف نے بال فوراً قصوری صاحب کو پاس کر دی ۔ جیسے کوئی قانونی پوائنٹ آ گیا ہو ۔ جس کی وضاحت صرف قصوری صاحب کر سکتے ہوں ۔ قصوری بال کے پاس بیٹھ کر پمفلٹ کھول کر دیکھنے لگے کہ کونسے ضابطے کے مطابق بال کس کو پاس کی جا سکتی ہے ۔ موقع دیکھ کر سردار شوکت حیات بال چھیننے کے لئے جھپٹے ۔ مگر قصوری صاحب نے بال کو ہاتھ میں لے کر زور سے ایک قانونی مکا مار کر بال اپنی سائیڈ کی طرف پھینک دیا ۔ ریفری نے فاؤل کی سیٹی بجائی ۔ قصوری صاحب اس بات کے قصوروار تھے کہ انہوں نے بال کو پاؤں کی بجائے ہاتھ کیوں لگایا ۔ پاؤں کی جگہ ہاتھ کا استعمال اور ہاتھ کی جگہ پاؤں کا استعمال قانوناً غلط ہے ۔
اب ملک جیلانی نے فاؤل کی اونچی کک لگائی ۔

مفتی الیون کے سب کھلاڑی دھاوا بولنے کے لئے بال کے پیچھے دوڑے ۔ اس ٹیم میں ایکا بہت تھا ۔ جس طرف بال جاتی تھی سب باجماعت اس کے پیچھے دوڑتے تھے ۔ جیسے فٹ بال نہ ہوا اقتدار کی کرسی ہو ۔ بال گر کر اچھلی تو ولی خان نے ہیڈ کیا ۔ دیکھا گیا تھا کہ ولی خان زیادہ تر سوار رہتے تھے یا قیوم خان ۔ ملک جیلانی بال کے پاس پہنچ گئے ۔ اور انہوں نے زور سے گول کی طرف کک لگائی زبردست شور اٹھا ۔ گول ہونے کا اندیشہ

ہے۔ مگر سردار مینگل نے بغیر کسی گھبراہٹ کے بال کو سینے پر اس طرح روک لیا جیسے گول سینے پر روکتے ہیں۔ اس طرح روکنے پر زبردست شور ہوا واہ وا کے نعرے لگنے لگے۔ مہمانِ خصوصی سراچے منظا ہرے پر داد دیتے تھے اور زور سے تالی بجاتے تھے۔ سردار مینگل نے بال کو زور سے ٹھوکر ماری۔ اور بال مولانا کوثر نیازی کی گود میں تھی۔ وہ بال لے کر آہستہ آہستہ آگے بڑھے جنرل رانی ٹمکتی ہوئی آئیں اور اشارے سے روکنے کی کوشش کی مگر مولانا مسکراتے ہوئے نہایت چابکدستی سے پہلے اپنے آپ کو اور پھر بال کو بچاتے ہوئے اس کے پاس سے آگے نکل گئے۔ سامنے نصراللہ خان کھڑے تھے۔ انہوں نے حقے کی نے اتاری اور روکاوٹ ڈالنے کی کوشش کی۔ مولانا پرواہ کئے بغیر ان سے بھی بال نکال لے گئے۔ اس پر قیامت کا شور ہوا۔ مولانا نے بال پیرزادہ کو پاس کی اور بولے "سپردم بتو مایۂ خویش را"۔ اور پیرزادہ نے بال معراج محمد خان کی طرف پھینکی۔ اور معراج محمد خان بجلی کی سی تیزی کے ساتھ بال کو لے اڑے۔ ان کا کمبل نما مفلر دونوں طرف پرندے کے پروں کی طرح اڑا جا رہا تھا۔ ایک آواز آئی۔ "کیا پرواز ہے جیسے جیٹ جہاز ہو۔"

معراج محمد خان گول کے قریب جا پہنچے۔ سامنے مفتی محمود کھڑے پینترے بدل رہے تھے۔ معراج محمد خان نے گول کی طرف زوردار کک لگائی۔ مولانا مفتی نے "جل تو جلال تو" کہہ کر بڑی پھرتی سے بال کو کیچ کیا۔ اور پھر لاحول ولا کہہ کر بال کو زوردار مکا لگا کر تیس چالیس گز دور پھینک دیا۔ مفتی صاحب کا مکا پڑتے ہی بال سے "بھک" کی آواز آئی۔ بالکل ایسے جیسے بوتل کا کاگ اڑتا ہے۔ گول بچنے پر مفتی صاحب کو زور شور سے داد ملی۔ بال جب نیچے گرا تو جنرل رانی نے بلاشرکتِ غیرے قابو کیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یعنی پلک جھپکتے میں جنرل رانی بال سمیت سردار مینگل کے گول کے سامنے تھیں۔ ریفری نے فوراً سیٹی بجائی یہ معجزہ کسی کی سمجھ نہ آیا کہ جنرل رانی مولانا مفتی کے گول سے سردار مینگل کے گول میں کیسے پہنچ گئیں۔ اور کون سے راستے سے بال لے کر پہنچیں راستے میں کوئی

رکاوٹ کی پیش نہ آئی۔ مولانا مفتی کے گول سے سردار مینگل کے گول کا فاصلہ بالکل اسی طرح تھا۔ جیسے سرحد سے بلوچستان کا فاصلہ۔ انکوائری شروع ہوئی تو جلدی سے اندازہ لگا لیا گیا کہ یقیناً جنرل رانی بال سمگل کر کے لائی ہو گی اور کسٹم والے دیکھتے کے دیکھتے ہی رہ گئے ہوں گے۔ یہ بالکل صاف طور پر فاؤل تھا۔ قیوم خان نے زور سے فاؤل کی کک لگائی سامنے ولی خان کھڑے تھے۔ انہوں نے ہیڈ کیا۔ قیوم خان نے پھر ادھر سے ہیڈ کیا بال پھر ولی خان کی طرف گئی۔ انہوں نے پھر ہیڈ کیا اس پر ایک آواز آئی" فٹ بال کی بجائے سروں سے والی بال شروع کر دیا"

ایک پنجابی آواز آئی "سراں نال نہیں ٹنڈاں نال"۔

اب قیوم خان نے بہت زور سے ہیڈ کیا بال ولی خان کے سر کے اوپر سے گذر گئی۔ ولی خان اچھل کر رہ گئے۔ اس پر بڑے زور کی تالیاں بجائی گئیں۔ اب بال قصوری صاحب کے پاس تھی۔ انہوں نے مبشر حسن کو پاس دیا۔ مبشر حسن نے بیک وقت مولانا عثمانی اور مولانا نورانی کو ڈاج دیا۔ ایک آواز آئی" دو ملاؤں میں ....." آگے مبشر حسن کو روکنے کے لئے کرمانی سٹینڈ ایٹ ایز کھڑے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے بال کرمانی کی ٹانگوں کے نیچے سے نکال کر ریئسانی کی طرف بڑھا دی۔ کرمانی سٹینڈ ایٹ ایز ہی رہے۔ ریئسانی نے مولانا کوثر نیازی کو پاس دیا۔ مفتی صاحب کی ٹیم کے کھلاڑی منتشر جلوس کی صورت میں بے معنی نعرے لگاتے ہوئے ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ جیسے آنسو گیس سے بچ رہے ہوں۔ کوثر نیازی نے جنرل رانی کو ڈاج دیا۔ اور بال معراج محمد خان کو پاس کی۔ معراج محمد خان نے پیرزادہ کو پاس دیا اور پیرزادہ نے سر کی جنبش کی منظوری کے ساتھ پھر بال معراج محمد خان کو واپس دے دی۔ معراج محمد خان بال لے کر پھر تیزی کے ساتھ جیٹ کی طرح مولانا مفتی کی طرف اُڑے اور گول کی طرف کک لگا دی اور خود بال کے پیچھے بھاگے اور اس تیزی سے بھاگے کہ بال پیچھے رہ گیا اور وہ خود بال سے آگے نکل

گئے۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے بال ان کے پیچھے بھاگ رہا ہو۔ اتنے میں معراج محمد خان اور بال دونوں برابر برابر مفتی صاحب سے جا ٹکرائے اور پھر تینوں گول کے اندر جال میں جا پھنسے۔ ریفری نے گول کی لمبی سیٹی بجائی۔ ایک قیامت خیز شور اٹھا "معراج محمد خان زندہ باد۔ پیرزادہ زندہ باد"۔ بے شمار لوگ دوڑ کر میدان میں آگئے اور شیخ رشید کو کاندھوں پر اٹھا لیا کیونکہ وہ سب سے ہلکے تھے۔ اور بھوجا لو کا ڈانس شروع ہوگیا۔

مخالف طرف سے شور اٹھا "یہ گول نہیں ہوا۔ فاؤل ہوا ہے"۔ گراؤنڈ میں ٹماٹر اور کیلے کے چھلکے گرنے لگے۔ لاؤڈ سپیکر پر اعلان ہوا "حضرات گراؤنڈ خالی کردیں۔ خاموش ہوکر سکون سے سنیں"۔ تھوڑی دیر بعد میدان خالی ہوگیا اور قدرے سکون ہوا تو پھر اعلان ہوا۔ "حضرات آپ کے سامنے پیرزادہ کی ٹیم نے ایک عدد گول جس کا نصف نصف عدد گول ہوتا ہے۔ مفتی محمود کی ٹیم کو پیش کیا۔ جو انہوں نے قبول کیا۔ یعنی ایک نے گول دیا دوسرے نے لیا۔ یہ ان کا آپس کا لین دین ہے۔ آپس کا معاملہ ہے آپ پریشان نہ ہوں۔"

یہ سنتے ہی پھر تالیاں بجیں اور نعرے لگائے گئے۔ "لاؤڈ سپیکر زندہ باد" اور پھر ریفری نے ہاف ٹائم کی لمبی سیٹی بجائی۔ میرے سرہانے ٹائم پیس کا الارم بج رہا تھا۔

جاویں وے کبوترا......

اہل زبان حضرات کو اہل پنجاب سے دو ایک ادبی اور نیم ادبی قسم کی شکایتیں ہیں۔ ایک شکایت تو یہ ہے کہ اہل پنجاب کے پاس ایک رجسٹرڈ اور پیٹنٹ لفظ ایسا ہے جو وہ ہر جگہ ہر بات اور ہر چیز کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ اور وہ لفظ ہے شاندار۔ اس لفظ شاندار کو ہر موقع پر اس فراخدلی سے استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے ہر بیماری کے لئے آج کل کوئی نہ کوئی ٹیکہ فراخدلی سے لگا دیا جاتا ہے۔ اگر بارش ہو رہی ہو تو کہیں گے کیا شاندار بارش ہے۔ حنیف محمد کے متعلق ذکر ہو گا تو کہیں گے کیا شاندار سکور کرتا ہے۔ کسی کی ذکدار مونچھیں نظر آئیں گی تو فرمائیں گے کیا شاندار مونچھیں ہیں۔ اگر ٹھنڈی ہوا چلے تو ارشاد ہو گا کیا شاندار ہوا چل رہی ہے۔ سبزی خرید کر لائیں گے تو گھر آ کر اعلان کریں گے۔ بیگم دیکھو کیا شاندار کدو لایا ہوں۔ اب کوئی ان سے پوچھے کہ ان چیزوں میں شاندار ہونے کی کیا بات ہے۔ کدو کس طرف سے شاندار ہے۔ حنیف محمد کے سکور اور بارش میں کیا شان ہے۔ بس ایک لفظ ہاتھ آ گیا ہے۔ اس کا ہر بازار؛ جائز استعمال کرتے ہیں۔ اگر ظاہر نظر سے دیکھا جائے تو یہ شکایت درست معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس میں جو ایک خاص نکتہ ہے۔ اُسے سوائے اہل پنجاب کے اور کوئی نہیں سمجھ سکتا۔

اہل زبان حضرات تو واقعی ہر چیز کی نوعیت اور قدر و قیمت کے مطابق اُس کی تعریف میں مناسب الفاظ استعمال کرتے ہوں گے۔ لیکن مناسب الفاظ ڈھونڈنے میں دماغ پر بلا وجہ زور ڈالنا پڑتا ہے، جو دماغ کی کمزوری کا باعث ہو سکتا ہے۔ اِس کے برعکس اہلِ پنجاب نے ہر چیز اور ہر بات کے لئے ایک ہی لفظ ڈھونڈھ نکالا ہے۔ اور بار بار دماغ پر زور ڈال کر سوچنے کا ٹنٹا ہی ختم کر دیا۔ ان خوش باش زندہ دل اور سہولت پسند لوگوں نے ایک ایسا لفظ اپنا لیا ہے جو کہ ہر جگہ اور ہر موسم میں ہمیشہ استعمال ہوتا رہے گا۔ انگریزی میں اس کو 'بریوٹی' کہتے ہیں۔

ایک شکایت اہلِ زبان کو اہلِ پنجاب سے یہ ہے کہ اگر اُن سے ان کے کسی مریض کا حال پوچھا جائے تو بڑا مضحکہ خیز جواب دیتے ہیں۔ اگر یہ دریافت کیا جائے "آپ کے ابا جان ہسپتال میں داخل تھے اب اُن کا کیا حال ہے۔"

تو فوراً جواب دیں گے "اب اَگے سے اچھے ہیں"۔ اب ان سے کوئی پوچھے کہ اَگے سے اچھے ہیں یا پیچھے سے اچھے ہیں۔ یا دائیں بائیں سے اچھے ہیں۔ یہ کس نے پوچھا ہے۔ یہ لوگ کبھی یہ نہیں کہیں گے کہ پہلے سے اچھے ہیں۔ ہمیشہ یہی کہیں گے اَگے سے اچھے ہیں۔

اگر اُن سے اُن کا اپنا حال پوچھا جائے۔ تو ایک فقرہ کہیں گے "سب ٹھیک ٹھاک ہے"۔ ٹھیک تو خیر ٹھیک ہوا مگر یہ ٹھاک کیا بلا ہے۔

ایک بڑی شکایت اہلِ زبان حضرات کو پنجابیوں کے رومانی پرندوں کے متعلق ہے۔ یہ وہ پرندے ہیں جو پنجابی ادب اور پنجابی شاعری میں استعمال ہوتے ہیں۔ ان کے خیال میں اہلِ پنجاب کے "ادبی پرندے" بالکل غیر رومانی ہوتے ہیں، بلکہ ان کا رومان سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔ عام طور پر جو پرندے پنجابی شاعری میں استعمال کئے جاتے ہیں وہ ہیں چیل کوا وغیرہ۔ پنجابی کے اکثر مصرعے ایسے ہوتے ہیں۔

"کوٹھے تے ال ماہیا"۔ یا پھر "کوٹھے تے کاں ماہیا"

اب کوئی اہل پنجاب سے پوچھے کہ چیل اور کوے میں کیا خوبصورتی ہے یا کیا رومانیت ہے کیا ناس بات ہے جو ان کو اُن شاعری میں گھسیٹ لیا۔ کوے کا سیاہ رنگ دیکھ کر طبیعت میں الجھن پیدا ہوتی ہے اور چیل کو دیکھ کر ویسے ہی کراہت محسوس ہوتی ہے۔ یہ جائیکہ کوئی دلکشی ہو۔ اور پھر کوے کی کائیں کائیں دماغ چاٹ جاتی ہے۔ ان پرندوں کا ادب اور شاعری میں داخلہ ادب کی بے ادبی نہیں تو اور کیا ہے۔

کوے اور چیل کا پنجابی شاعری میں داخلہ بلا وجہ نہیں۔ یہ کیا کم خوبی کی بات ہے۔ کہ لڑکوں کو تو سکولوں اور کالجوں میں بڑی مشکل سے داخلہ ملتا ہے اور اہل پنجاب نے کوے اور چیل کو بڑی آسانی سے اپنی شاعری میں داخلہ دے دیا۔ دراصل اس میں بھی ایک نکتہ ہے۔ اہل پنجاب نہایت حقیقت پسند واقع ہوتے ہیں۔ وہ وہی بات کریں گے اور کہیں گے جس میں حقیقت ہو۔ مبالغہ آمیز باتوں کا طریقہ بہت کم جانتے ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ کوٹھے پر کوے اور چیل ہی کبھی کبھی بیٹھے نظر آتے ہیں۔ آج تک کسی پنجابی نے اپنے کوٹھے پر ہاتھی یا اونٹ یا ہرن نہیں دیکھا۔ اہل زبان نے اپنے کوٹھے پر دیکھا ہو تو میں کہہ نہیں سکتا۔ چونکہ حقیقت کا بیان مقصود ہے۔ اس لئے صاف کہہ دیا۔ اے میرے محبوب اے میرے دوست ہمارے کوٹھے پر چیل ہے۔ ہمارے کوٹھے پر کوا ہے۔ اگر کوٹھے پر چیل ہے یا کوا ہے یا اطلاع ملنے پر محبوب کیا کرے گا یہ بات اس پر چھوڑیئے۔ یہ اُن کا ذاتی معاملہ ہے۔ محبوب کو جو اُس کے دوست نے کوٹھے پر اصل پرندہ دیکھا تھا۔ اُس کا نام بتا دیا۔ اب رومان کی خاطر کوٹھے پر شتر مرغ کہاں سے لایا جاتا۔

اہل زبان کے نزدیک ادبی اور رومانی پرندہ بلبل ہے اگر زیادہ خوبصورت بنانا ہو تو عندلیب، کوئل اور چکور وغیرہ ہوتے ہیں۔ کوئل کوکتی ہے تو دل میں ہوک اُٹھتی ہے جس کا مزہ رومان کے دلدادہ لوگ ہی جان سکتے ہیں۔ بلبل پھول پر بُری طرح فریفتہ ہے جس طرح مجنوں کا تعلق لیلیٰ سے ہے۔ رانجھے کا ہیر سے۔ اسی طرح بلبل کا تعلق گل سے ہے۔

چکور جب چاند کو دیکھ کر چکر کاٹتا ہے تو دل ہی چاہتا ہے کہ اپنے دوست کے گرد اسی طرح گھومتے رہیں چکر لگاتے رہیں۔ جب تک کہ محبوب چاند کی طرح فیوز نہ ہو جائے۔ چکور کی طرح چاند کے گرد چکر ہی نہیں لگانے چاہئیں بلکہ محبوب کی گلی کے پھیرے کرنے چاہئیں اور ساتھ یہ ورد بھی زبان پہ ہونا چاہیئے مرنا تیری گلی میں جینا تیری گلی میں۔ جب تک کہ محبوب گلی چھوڑ کر نہ بھاگ جائے۔

اہلِ پنجاب کا خیال ہے کہ کوئل، بلبل، چکور وغیرہ سب کتابی اور سنی سنائی باتیں ہیں شاعرانہ تخیل ہے۔ حقیقت کچھ نہیں۔

افسوس تو اس بات کا ہے کہ اہلِ زبان حضرات اہلِ پنجاب کے کوّے اور چیل کو تو یاد رکھتے ہیں۔ مگر پنجاب کے اصلی رومانی پرندے کا ذکر تک نہیں کرتے۔ اُس کو ذہن سے محو کر بیٹھے ہیں۔ اور یہ رومانی پرندہ ہے اعلیٰ حضرت کبوتر۔ چھوٹا سا خوبصورت سا۔ پیارا سا۔ صاف ستھرا بغیر پانی ملے دودھ کی طرح سفید۔ اسے دیکھتے ہی عشق کرنے کو دل چاہتا ہے۔ رومان ابل ابل کر گرنے لگتا ہے حرارت غریزی بڑھ جاتی ہے۔ اس جیسا رومان انگیز بلکہ رومان انگیز خوبصورت پرندہ اور کوئی نظر نہیں آتا۔ کوئل، بلبل، چکور کا اس سے کیا مقابلہ۔ رومان انگیزی کے علاوہ اس میں اور بے شمار صفتیں ہیں۔ آواز بہت پیاری اور رعب دار ہے۔ جب اکڑ کر کھڑا ہوتا ہے اور غٹرغوں کرتا ہے تو ایسا دکھائی دیتا ہے کہ جیسے کوئی بہت بڑا لیڈر زوردار تقریر کر رہا ہو اور قوم کو بے وقوف بنا رہا ہو۔ اور پھر جب بہت سے کبوتر گھوم گھوم کر غٹرغوں کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ تو بال روم کے ڈانس کا سماں باندھ دیتے ہیں۔ انسان نے اکثر ڈانس پرندوں اور جانوروں سے سیکھے ہیں۔ مثلاً کلاسیکل ڈانس مور سے سیکھا ہے۔ ٹوسٹ اور لنڈی ڈانس کا موجد اونٹ ہے۔ فوکس ٹراٹ اور فوکس ڈانس یعنی عوامی ناچ گھوڑے کی اختراع ہے۔ اور کبوتر تو گویا ڈانس کا شہزادہ ہے۔

اہل پنجاب جتنا رومان کو سمجھتے اور دلیری سے استعمال کرتے ہیں۔ روئے زمین پر اور کون کرتا ہوگا۔ پنجاب تمام دنیا میں رومان خیز علاقہ مشہور ہے۔ جتنا رومان پنجاب میں لڑایا گیا۔ کہیں اتنے پتنگ اور کبوتر نہیں اڑائے گئے۔ پنجاب کا رومان اور گندم دو چیزیں مشہور ہیں۔ گندم تو مکمل طور پر غائب ہوتی جا رہی ہے۔ اور اب امریکہ سے آنے لگی ہے۔ البتہ رومان اب بھی بہت ہے۔

رومان کے بہت بڑے بڑے علمبردار پنجاب کے مختلف حصوں میں اس وقت آرام فرما رہے ہیں۔ ہیر اور رانجھا جھنگ کے علاقے میں۔ سسی اور پنوں تھل میں اس وقت ڈیویلپمنٹ اتھارٹی کے زیر سایہ۔ سوہنی اور مہینوال گجرات کے کسی علاقے میں ہمیشہ کیلئے آباد ہیں۔ پنجاب کے کسی خطے میں مرزا اور صاحباں بھی محو خواب ہیں۔ اور لاہور میں راوی کے کنارے رومان کے شہنشاہ ہز امپیریل میجسٹی جہانگیر اور ملکہ نور جہاں (ملکہ ترنم ابھی نہیں) آرام فرما رہے ہیں۔ شہنشاہ جہانگیر اور ملکہ نورجہاں کا رومانی تعارف پنجاب کے کبوتروں نے کرایا تھا۔ نورجہاں کو ملکہ بنانے والے صرف کبوتر تھے۔ کبوتر اتنے طاقتور تھے کہ انہوں نے نورجہاں کے ہاتھوں سے اڑ کر شہزادہ جہانگیر کے ہاتھوں کے طوطے اڑا دیئے۔

رومان کے اتنے بڑے بڑے علمبرداروں کی لسٹ کے مقابلے میں اہل زبان کے ہاں سوائے گل و بلبل، شمع و پروانہ، چاند اور چکور کے کسی انسانی جوڑے کا نام نہیں سنا جاتا۔

ہیر رانجھا کے متعلق تو حضرت انشا کا فرمایا ہوا مستند ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہیر رانجھے کا قصہ سنا کے پنجابیوں نے لوٹ لیا۔ پنجاب میں رومان کے جو گمنام علمبردار ہیں ان کا تو کچھ شمار ہی نہیں۔ کالج کے کالج بھرے پڑے ہیں۔ محلے کے محلے بھرے پڑے ہیں۔ مس انار کلی نورالدین نے بھی پنجاب کے سب سے بڑے شہر لاہور کو شرف شہرت بخشا۔ اور اپنے نام مستقل طور پر ایک بازار الاٹ کرا لیا۔ ان رومانی ہستیوں کا تو حساب نہیں جن کے نام کچھ بھی الاٹ نہ ہو سکا۔ جو بے چارے بغیر کوئی الاٹمنٹ لئے عشق کے محکمہ سیٹلمنٹ میں دھکے کھاتے رہے۔

اور گمنام اور برباد ہو کر اس دنیا کو خیر باد کہہ گئے۔ مطلب تو صرف اتنا ہے کہ پنجاب کے علاوہ اور کہیں اتنا رومان نظر نہیں آتا۔

اہل زبان حضرات کو آخری ادبی شکایت پنجابی شاعری کے متعلق ہے۔ پنجابی شاعری اہل زبان کی سمجھ سے باہر ہے۔ ان کو گلہ ہے کہ پنجابی زبان میں نہ کوئی کام کا شاعر ہے اور نہ پنجابی شاعری کا کوئی دیوان ہے۔ بلکہ یہ سرے سے شاعری ہی نہیں۔ اس شاعری کا ادب سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔

پنجابی شاعری دراصل ایک سمندر ہے۔ جس کا کوئی کنارا نہیں اور اس کی تہ میں بے شمار گوہر نایاب ہیں۔ جو صرف ڈھونڈنے والوں کو مل سکتے ہیں۔ اور دیوان تو پنجابی شاعری کے ان گنت ہیں۔ اس بات کا کم لوگوں کو علم ہے کہ پنجابی شاعری کی قسمیں بھی بہت سی ہیں۔ اور کئی قسمیں تو ایسی ہیں جو کسی زبان کی شاعری میں نہیں ملتیں مثلاً "سی حرفی" جو صرف پنجابی شاعری کی ایک قسم ہے۔ حضرت بابا بلھے شاہؒ کی کافی۔ یہ کافی پرسن اور نس (Person and Ness) کافی سے بالکل مختلف ہے۔ یہ کافی صرف زبان کا مزا دیتی ہے۔ بابلھے شاہؒ اور بابا فریدؒ کی کافی میں زبان کا مزا بھی ہے اور روحانی مزا بھی۔ پنجابی شعرا حضرات کا تو کچھ شمار ہی نہیں۔ ہر قسم کے شاعر ہیں۔ ادبی شاعر۔ رومانی شاعر۔ روحانی شاعر۔ جرمانی شاعر۔ ولی شاعر۔ صوفی شاعر۔ فانی شاعر اور غیر فانی شاعر وغیرہ وغیرہ۔ اور ہر شاعر کے اپنے اپنے کئی دیوان ہیں۔ اور بعض شاعر تو اتنے خوش قسمت ہیں کہ ان کے دیوان خانے ہیں۔

پنجابی کی اور کتابوں کو تو چھوڑیئے یہاں پنجابی شاعری کی صرف ایک کتاب کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اور یہ دیوان ہے۔ حضرت وارث شاہؒ صاحب کا۔ اس دیوان کا نام ہے "ہیر وارث شاہ کلاں"۔ میرا ناقص خیال ہے کہ اس کے مقابلے کا دنیا کی کسی زبان میں کوئی دیوان نہیں۔ یہ اتنا لمبا چوڑا ہے کہ یہ اکیلا دیوان اُردو کے ہر دیوان پہ چھایا ہوا ہے۔ یہ ایک طرف

اور اُردو کے سب دیوان ایک طرف۔ ہر طرح ان سے سبقت لے جائے گا۔ اس کے اشعار گننے کی لاکھ کوشش کیجئے گنے نہ جائیں گے۔ بلکہ آپ گنتی بھول جائیں گے۔ اُردو کے تمام دیوان ترازو کے ایک پلڑے میں رکھ لیجئے اور اس کو دوسرے پلڑے میں رکھ کر تول لیجئے مکی اصول کے مطابق بے شک ڈنڈی مار کر دیکھ لیجئے پھر بھی وزنی یہی نکلے گا۔ دیوانِ غالب اگر چالیس ہوں تو اس کے ہم وزن نہ ہوں گے۔ اس کو ناپ لیجئے لمبائی اور چوڑائی میں زیادہ حجم میں یہ وزنی اور اس کے شعر بھی چھوٹے چھوٹے نہیں۔ بلکہ لمبے طویل۔ ایک ایک مصرع ڈیڑھ ڈیڑھ فرلانگ کا۔ یہ بحرِ طویل صرف جریب سے ناپی جا سکتی ہے اور ناپنے کے لئے ایک پٹواری کی ضرورت ہے جو رشوت نہ لیتا ہو۔ شاہنامہ فردوسی میں صرف آٹھ ہزار اشعار ہیں۔ ہیر وارث شاہ' کا ایک ایک مصرع شاہنامہ فردوسی کے چار چار شعروں کے برابر ہے۔ اور پھر دنیا کا کونسا مضمون ہے جو اس میں تفصیل کے ساتھ نہ دیا گیا ہو۔ عشق و محبت۔ عشقِ مجازی، عشقِ حقیقی۔ تجارت۔ فلسفہ۔ حکمت۔ دنیاوی سیاست۔ فیملی پلاننگ۔ ہر علم اس میں موجود ہے۔ جنہوں نے نظرِ غائر اور گاگر اس کا مطالعہ کیا ہے۔ وہ تو یہاں تک کہتے ہیں کہ ایکسائز، انکم ٹیکس اور کسٹم کے متعلق بھی بہت سے راز اس میں درج ہیں۔

'ہیر وارث شاہ' تو ایک بہت بڑی چیز ہے۔ آپ صرف ایک گمنام پنجابی شاعر کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا سنیئے۔ اس کو سمجھئے۔ اور پھر سر دھنیئے اپنا بھی اور اپنے اہلِ زبان دوستوں کا بھی۔ اس ٹکڑے میں خاص بات یہ ہے کہ اس کے ساتھ رومانی پنجابی پرندے کبوتر' کا خاص تعلق ہے۔ یہ کبوتر ہی تو ہے جو محبوب تک نامہ و پیام لے کر جاتا ہے اور جواب بھی لاتا ہے۔ پیام رسانی کا کام کبوتر نے پنجابی شاعری میں ہی نہیں بلکہ اُردو شاعری میں بھی کیا ہے اس کے متعلق اُردو کے دو ابدیاتی شعر سوال اور جواب کی صورت میں سنیئے۔

سوال - خط کبوتر کس طرح لے جائے بامِ یار پر

پر کترنے کو لگی ہیں قینچیاں دیوار پر

جواب ——— خط کبوتر اس طرح لے جائے بام یار پر
خط کا مضمون ہو پروں پر پرکٹیں دیوار پر

اب دیکھ لیجئے کبوتر کتنے کام کی چیز ہے اور ایک زمانے میں جب ڈاکخانے نہیں ہوتے تھے تو کبوتر ہی پوسٹ مین کا کام سرانجام دیتے تھے۔ اگران کو راشن پانی کم ملتا تھا تو سٹرائیک بھی نہیں کرتے تھے۔

اب آپ سی دھنے کی طرف توجہ فرمائیں۔ اس ٹکڑے کا پس منظر یہ ہے کہ اپنے محبوب سے جدا ہو کر کسی کام کی وجہ سے اُس کا دوست دور دراز مُلک کو چلا گیا ہے۔ مگر جاتے وقت اتنا کرم کر گیا ہے کہ ایک خوبصورت کبوتر اُس کو بطورِ نشانی دے گیا ہے اور تاکید کر گیا ہے کہ خدا نہ کرے کوئی مصیبت آئے یا شدید ضروری کام ہو اور میری ضرورت پڑے تو اِس کبوتر کے ذریعے مجھے پیغام بھیج دینا۔ کبوتر سب جانتا ہے۔ کہ میں کہاں ملوں گا۔ کچھ عرصے کے بعد واقعی محبوب کو اپنے دوست کی ضرورت پڑ گئی۔ کس کام کے لئے ضرورت پڑی اس کا علم نہیں یہ اُن کا ذاتی پرائیویٹ معاملہ ہے۔ ہمیں اُس سے تعلق نہیں اور نہ رکھنا چاہیئے۔ اب اس سلسلے میں جو پیغام بھیجا گیا اور کبوتر کو سمجھایا گیا وہ سن لیجئے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

واسطہ ای رب دا تو جاویں وے کبوترا
چھٹی میرے ڈھول نوں پنچاویں وے کبوترا

کبوتر کا کام پیغام رسانی ہے یعنی خط پہنچانا۔ اُس کی ڈلیوری ہے۔ مگر محبوب پھر بھی کبوتر سے بڑی عاجزی کے ساتھ درخواست کرتا ہے کہ اے کبوتر تجھ کو خدا کا واسطہ ہے یعنی برائے خدا تو جا اور میرے دوست کو یہ خط پہنچا دے۔ ڈھول پنجابی زبان میں عاشق کو کہتے ہیں۔ دراصل عاشق ہونا ڈھول کی طرح ہے جہاں بیٹھے گا وہاں عشق و محبت کی ڈینگیں مارے گا۔ یا پھر ڈھول کی طرح کھو کھلا ہوتا ہے۔ شاید یہی وجہ اُس کو ڈھول کہنے کی ہو۔ کبوتر سے گفتگو کا فائدہ کیا ہے۔ کیا وہ پنجابی زبان سمجھتا ہے۔ میں ثابت نہیں کر سکتا کہ کبوتر پنجابی زبان

سمجھتا ہے۔ لیکن آپ بھی کہاں ثابت کر سکتے ہیں کہ کبوتر پنجابی زبان نہیں سمجھتا۔ اس لئے اس مسئلہ کو جانے دیجئے۔ پھر کبوتر سے خطاب ہوتا ہے۔

اوکھیاں تے لمیاں منزلاں نے تیریاں
راہ دے وچ لکھاں نے طوفان تے ہنیریاں
دیکھیں کتے حوصلہ نہ ڈھاویں وے کبوترا

محبوب کو کبوتر کے لمبے تکلیف دہ سفر کا احساس ہے۔ اس لئے اُس کو حوصلہ دیتے ہوئے کہتا ہے مجھے علم ہے کہ تمہاری منزل بہت دور ہے راہ دشوار ہے۔ مجھے اس کا بھی احساس ہے کہ راستے میں لاکھوں طوفان اور آندھیاں آئیں گی۔ مگر اے کبوتر دیکھنا کہیں ہمت نہ ہار دینا۔ اور طوفان اور آندھی میں گھرے ہوئے پی آئی اے کے جہاز کی طرح زبردستی کہیں لینڈ نہ کرنا۔ اس سے وقت ضائع ہوگا معاملہ نازک ہے۔ طوفانوں اور آندھیوں کو چیر کر نکل جانا اور یہ خط میرے صاحب کو پہنچا دینا۔ اس کے بعد کبوتر کو طریقہ اور سلیقہ بتایا جاتا ہے کہ کس طرح وہ خط پیش کرے اور کیا کہے۔ یعنی کبوتر کو بریف کیا جاتا ہے

آکھیں پہلوں ہنجواں تے ہاواں دا سلام وے
دلاں وچ ڈبیاں نگاہواں دا سلام وے
فیر ساڈا حال توں سناویں وے کبوترا

سب سے پہلے میرے دوست سے جا کر کہنا کہ وہ بدنصیب جو خون کے آنسو روتی ہے، اور ٹھنڈی ٹھنڈی رلیفریجریٹر میں لگی ہوئی آہیں بھرتی ہے۔ تجھے وہ سلام کہتی ہے۔ جس کی نگاہیں دلوں میں پیوست ہو جاتی ہیں۔ وہ سلام بھیجتی ہے۔ جب یہ سن کر اُس کے دل پر اثر ہو تو پھر اُس کے بعد میری حالتِ زار اُس کو بتانا۔ دیکھ لیجئے کیا عمدہ سائنٹیفک طریقہ ہے۔ عاشق کے دل کو ہلانے کا۔ پہلے اپنی آہوں۔ آنسوؤں اور نگاہوں کا نقشہ پیش کر دیا اور جب دیکھ لیا کہ اس بات سے عاشق زار بے قرار ہو گئے تو

باقی حالِ زار بھی کہہ سنایا اور آخر میں کبوتر پہ زور دیا کہ میرے دوست کو ہر صورت میں ساتھ لے کر آنا۔

واسطہ بہادری دا سوں تینوں پیار دی
آکھیں آجا تینوں تیری نوراں اے پکار دی
ماہی جے نہ آیا توں نہ آویں وے کبوترا

اس شعر میں پولیٹیکل چال چلی گئی ہے۔ کبوتر اس حد تک بریف کیا گیا کہ تم جا کر میرے دوست کی تعریفیں کر کے اُسے آسمان پر بٹھا دینا کہ تو بہت بہادر ہے دلبر ہے۔ تجھے تیری بہادری کا واسطہ اور تجھے قسم ہے تمہاری محبت کی جس کے آگے فرہاد اور مجنوں کی محبت بھی ہیچ ہے۔ اور اُسے کہنا فوراً آؤ۔ امی جی ڈیٹلی، تمہاری مس نوراں تمہیں یاد کر رہی ہے۔ تمہیں پکار رہی ہے۔ اور اس کے بعد کبوتر کو چیلنج دے دیا کہ یاد رکھنا کبوتر جی کہ اگر میرا ماہی یعنی دوست نہ آیا، یعنی تم اُسے ساتھ لانے میں ناکام ہو گئے تو تم بھی مت آنا۔ دوزخ جہنم میں جاؤ۔ ڈھول کی طرح ماہی بھی عاشق کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ماہی فارسی زبان میں مچھلی کو کہتے ہیں۔ عاشق میں بھی مچھلی کی ایک صفت ہوتی ہے۔ وہ معشوق کے بغیر ویسے ہی بے قراری سے تڑپتا ہے جیسے مچھلی پانی کے بغیر۔ لیکن یہ بھی یاد رہے کہ اگر عاشق چالاک یعنی پولیٹیکل ٹائپ ہے تو اُس میں مچھلی کی نہیں مگرمچھ کی صفت ہو گی۔

اب ذرا آپ بتائیں کہ ایک گمنام شاعر کے یہ معمولی اشعار کیا شاعری نہیں۔ اس میں کسی جگہ بھی بے ادبی نہیں ہوئی، شاعری کی شاعری، کہانی کی کہانی۔ پرندے سے بات چیت۔ محبت سے لبریز، محبوب کے دل پر اثر کرنے والی۔ کیا بات نہیں ان اشعار میں۔ اگر اب بھی اہلِ زبان اس کو شاعری نہ سمجھیں تو یہ ان کی شاندار بدقسمتی ہو گی۔ پھر اُن کو کوئی کیا سمجھے۔

سخن شناس نۂ دلبرا خطا اینجاست

بڑے لوگوں کے جینرک نام

جینرک نام صرف دواؤں کے لئے مخصوص نہیں بلکہ مشہور لوگوں کے بھی جینرک نام ہوتے ہیں۔ جو ان کے اوصاف و اطوار عادات۔ شکل وشبہات اور جسامت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے رکھے جاتے ہیں۔

پہچان کیلئے چند نام حاضر ہیں۔

خان قیوم خان :۔ بڑے وجیہ۔ دیو پیکر جوش و خروش اور رعب داب والے انسان ہیں۔ انہیں ان صفات نے ڈبل بیرل کا جینرک نام دے رکھا ہے۔

عبدالحفیظ پیرزادہ :۔ بہت سی صفتوں کے مالک ہیں۔ دماغی صفتیں ان سے زیادہ روحانی صفتیں اور روحانی صفتوں سے زیادہ جسمانی صفتیں ہیں۔ ان کا عوامی اور غیر عوامی لباس صاف ستھرا اور دلکش ہوتا ہے۔ اس میں خوب سجتے ہیں۔ اور انگریزی فل کریز سوٹ میں خوب پھبتے ہیں۔ مٹیار کے پاؤں کی جھانجر بھی ایسی نہیں پھبتی۔ بھولی بھالی موہنی شکل وصورت ہے۔ ان کا ثانی نظر نہیں آتا۔ جب کبھی ریڈیو پر "ہے کوئی ہم سا تو سامنے آئے" سنتا ہوں تو خیال فوراً ان کی طرف جاتا ہے۔ ان کا اندازِ تکلم باوقار اور دلبرانہ ہے۔ ان تمام صفات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان کا جینرک نام "سوہنا منڈا" ہے اور یہ نام پیٹنٹ اور رجسٹرڈ ہو چکا ہے۔

شیخ رشید وہ اپنی جگہ قابلِ غور شے ہیں۔ شیخ صاحب کئی برس تک وزیر صحت رہے ہیں۔ مگر اس کے باوجود دُبلے پتلے ہلکے پھلکے اور ایکس رے قسم کے انسان ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا جینرک نام "شیدا سوکھا" ہے۔

اب ہمارے محترم مولانا کوثر نیازی ہیں جو حج اوقاف، ارشاد و زکوٰۃ کے وزیر ہیں۔ مولانا کا مطالعہ بہت وسیع ہے بلکہ ایک ایسا سمندر ہے جس کا کوئی کنارا نہیں۔ وسیع مطالعہ کتابیں پڑھنے سے ہوتا ہے۔ مولانا کو بچپن سے مطالعے کا شوق تھا۔ مولانا اپنی ذاتی کتاب "زرِگل" کے حرفِ آغاز میں سکول لائبریری کے متعلق فرماتے ہیں "کم از کم تین ہزار اچھی اچھی منتخب کتابیں اس میں موجود تھیں۔ آٹھویں جماعت تک پہنچتے پہنچتے کرم کتابی بن کر میں سارا خزانہ چاٹ چکا تھا"۔

یہ تو آٹھویں جماعت تک کا حال ہے۔ اگر مولانا بی اے یا ایم اے تک ہر سال پاس ہوتے ہوتے پڑھے ہوں گے تو یقیناً لاکھوں کتابوں کا خزانہ چاٹ چکے ہوں گے اور اگر کسی سال ناغہ ہوا ہوگا تو پھر اس سے بھی زیادہ خزانے چاٹ چکے ہوں گے۔ اور آج کے دن تک تو مولانا کروڑوں کتابوں کا خزانہ چاٹ کر صاف کر چکے ہوں گے۔ حیرت ہے مولانا وزیرِ خزانہ بننے کی بجائے وزیر اوقاف و حج کیسے بن گئے؟ یہ تو ظاہر ہے کہ جو چیز چاٹ لی جائے وہ غائب ہو جاتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ مولانا کروڑوں کتابیں چاٹ چاٹ کر ختم کر چکے ہیں اور ان کتابوں کی کمی کو پورا کرنے کے لئے اب مولانا کی اپنی کتابیں اچانک بڑی تیز رفتاری کے ساتھ مارکیٹ میں آرہی ہیں۔ بالکل جیٹ جہاز کا حساب ہے جو آواز سے بھی رفتار تیز رکھتا ہے۔ یعنی کتاب لکھی بعد میں جاتی ہے چھپ کر مارکیٹ میں پہلے آجاتی ہے۔ اگر یہی رفتار رہی تو امید ہے کہ مولانا اپنی چاٹی ہوئی کتابوں کی کمی کو بہت جلد پورا کر دیں گے۔

مولانا نے اپنی اس چاٹ کے وصف کا "زرِگل" میں اعتراف کرتے ہوئے صاف صاف لکھ دیا ہے کہ بچپن میں ہی ان کا جینرک نام "کتابوں کا کیڑا" مشہور ہو گیا تھا۔ اس سے ایک بات

اور ظاہر ہوتی ہے کہ اپنے ملک میں جینرک ناموں کے سلسلے میں مولانا نے سب سے پہلے جینرک نام کا اعزاز حاصل کیا۔ اس لئے وہ بڑے لوگوں میں جینرک ناموں کے امام ہوتے اللہ تعالیٰ کے دینے کی بات ہے۔

اب ہمارے سامنے نام آتا ہے خورشید حسن میر صاحب کا۔ یہ بہت زیادہ کام کرتے ہیں۔ ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔ صبح کرتے میں ہوتے تو شام پشاور میں ناشتے کے وقت لائلپور میں تو پہنچ گئے، تو ٹوبہ ٹیک سنگھ میں شام کی چائے کے وقت جیجو کی ملیاں میں ہیں تو رات کا کھانا لالہ موسیٰ میں کھا رہے ہیں۔ اور بیڈ ٹی مردان میں نوش کر رہے ہیں۔ بہت ہی مصروف انسان ہیں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ان کی ایک ٹانگ اپنے ملک میں ہوتی ہے تو دوسری ٹانگ کسی دوسرے ملک میں یہ سمجھ لیجئے کہ یہ بالکل 'ایٹ لارج' ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عام طور پر خباروں میں ان کا جینرک نام' وزیر بے محکمہ' لکھا جاتا ہے۔ آپ کوئی محکمہ اس لئے بھی نہیں لیتے کہ بار بار باہر جانا پڑتا ہے تو ہر بار کون محکمہ اٹھا کر ساتھ لئے لئے پھرے۔ ایک بار افواہ گرم ہوئی کہ کسی محلے میں نل کی ٹونٹی لگنے میں دیر ہوئی تو اس محلے کے ووٹر جس نے ووٹ تو کسی اور کو دیا تھا الٹے ناراض ہوکر ان سے کہا" ووٹ ہم نے آپ کو دیا اور ٹونٹی کسی اور محلے میں لگا دی گئی۔ آپ اپنے محکمے سے استعفا دے دیں"۔ آپ نے کہا کونسے محکمے سے استعفار دوں میرے پاس تو کوئی محکمہ ہی نہیں۔ اس لئے استعفار کا تمام عمر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ شاید ان کے ووٹروں کے متعلق میر تقی میر فرما گئے ہیں۔

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میر ہوئے
سارے بے محکمہ وزیر ہوئے

قوم کے ایک بہت بڑے سیاسی لیڈر نوابزادہ نصراللہ خان ہیں۔ ان کا لباس عام طور پر فراک کوٹ لال ترکی ٹوپی اور ہاتھ میں حقہ ہوتا ہے۔ حقہ ان کا ذاتی نشان بن گیا ہے۔ اس لئے قوم نے ان کی غائبانہ خدمات کے صلے میں ان کو حقہ ٹوپی کے جینرک نام سے نوازا ہے۔

بہت عرصہ گذرا ہماری فوج میں جنرل حاجی افتخار ہوتے تھے۔ ان کا خاص وصف یہ تھا کہ کسی کانفرنس یا میٹنگ میں بات کرتے ہوتے زوردار طریقے سے 'ہا ہا' کرکے ایک زبردست گونجدار قہقہہ لگا دیتے تھے۔ اُس وقت موجود تمام افسران بھی ہنسنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ حاجی صاحب کو ان کی اس خوبی نے 'جنرل ہا ہا' کا جینرک نام دیا تھا۔

اِسی پاک سرزمین میں ایک اور جنرل بھی ہیں اور وہ ہیں جنرل رانی۔ حد سے زیادہ اور چاروں طرف سے ایک جیسی صحت مند یعنی آل آرونڈ صحت ہی صحت۔ جس طرف سے دیکھو ماشااللہ صحت مند یعنی لفظ سالس کی طرح جس طرف سے دیکھو سالس یا یہ وہ جامہ ہے کہ جس کا نہ الٹا نہ سیدھا۔ 'جنرل رانی' بذاتِ خود ایک جینرک نام ہے۔ ہمارے بنکوں کے ہاؤس بلڈنگ ایڈوانس کے سود در سود کی طرح اس جینرک نام کا آگے ایک اور جینرک نام ہے اور وہ نام ہے 'موٹی بھتیجی'، ایک سابق صدر کا عطا کردہ مستند نام۔

ایک قابلِ احترام ہستی ہیں حضرت جوش ملیح آبادی تجربہ کار، سرد گرم چشیدہ، سردیوں میں گرم چشیدہ اور گرمیوں میں برف ڈال کر چشیدہ۔ انہوں نے زمانے کے حالات اور احباب کا خاص خلوص دیکھ کر محسوس کر لیا کہ انسان چاہے کتنا بڑا ہو مگر زندگی میں اس کی قدر نہیں ہوتی۔ مرنے کے بعد اُس کے دوست احباب کا حلقہ اور بھی وسیع ہو جاتا ہے بلکہ جتنی اُس کی موت پرانی ہوتی جاتی ہے اُسی حساب سے دوست احباب اور بڑھتے جاتے ہیں۔ اور مرحوم سے وہ صفات بھی منسوب کر دی جاتی ہیں جو اُس میں سرے سے موجود ہی نہیں تھیں۔ اُس کی یاد میں جلسے ہوتے ہیں۔ اہلِ قلم اُس کی تعریف میں مضمون لکھ لکھ کر پاکستان سنٹر میں پڑھتے ہیں۔ اُس کے متعلق صرف اتنا کہہ کر کہ مرحوم کسی تعارف کے محتاج نہیں خود اپنا تعارف کرا جاتے ہیں۔ اور دوسرے دن مرنے والے کی بجائے اپنے مضمون کا ذکر اور اپنی تصویر اخباروں میں ڈھونڈتے ہیں۔ جوش صاحب نے اچھی طرح سمجھ کر کہ انسان کی زندگی میں نہ اُس کی قدر ہوتی ہے اور نہ اُس کی کوئی تعریف کرتا ہے نہ اُس پر کوئی

مضمون پڑھنے کے لئے اس کے مرنے کا شدت سے انتظار کیا جاتا ہے۔ اس لئے انہوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنی تعریف کرانے اور قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لئے اپنے متعلق صفات بھرا مضمون سننے کے لئے اپنا جینرک نام 'جوش مرحوم' خود ہی تجویز کر دیا۔ کسی مشاعرے میں آپ نے کسی شاعر کے بے تکے شعر کی بہت تعریف کی داد دی۔ کسی نے حیرت سے پوچھا 'حضرت آپ یہ کیا کر رہے ہیں' آپ نے جواب دیا: 'منافقت' آج کل ریڈیو پاکستان ان کی اس منافقت کا بہت پرچار کر رہا ہے۔

محمود غزنوی کے اصلی سترہ سومناتی کامیاب حملوں کی طرح جوش مرحوم نے بھی سترہ اصلی عاشقانہ کامیاب حملے کئے جوش مرحوم نے ان حملوں میں مساوات اور انصاف پسندی کا ثبوت دیا۔ اپنے حملوں میں 'صنفِ نازک' اور 'صنفِ ثقیل' میں کوئی امتیاز نہ رکھا۔ اُن کے ان حملوں کی 'یادوں کی برات' ان کی محلہ سے نکلتی ہے اور ہیرا منڈی جاکر ختم ہو جاتی ہے اور وہاں پر اس کا ولیمے کے ساتھ چہلم بھی ہو جاتا ہے۔

حضرت حفیظ جالندھری ماڈل ٹاؤن لاہور کے مکینوں میں سب سے پہلے مومن مسلمان مکین ہیں۔ ماڈل ٹاؤن میں اتفاقاً میں ان کا ہمسایہ بلکہ زیرِ سایہ تھا۔ اس مناسبت سے میں ان کو چاچا حفیظ کے جینرک نام سے یاد کرتا ہوں۔ لیکن میرا فرمایا ہوا مستند نہیں۔ ان کا مستند جینرک نام 'ابوالاثر' ہے۔ یعنی آپ اثر کے ابو ہیں ڈیڈی نہیں خود اثر نہیں بلکہ جیسے کوئی زعم میں کہے۔ میں کمشنر کا باپ ہوں مطلب یہ کہ خود کمشنر نہیں۔

اب ایک بہت بڑے شاعر جناب فیض احمد فیض ہیں۔ لینن کا امن پرائز ان کے پاس ہے۔ یہ امن پرائز انہیں ایک ایسے ملک کی جانب سے ملا جس نے ہمارے ملک کا امن تباہ کرنے کی دو بار کوشش کی۔ اور ناکام ہوا مگر آپ امن پرائز حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ فیض صاحب کمیونسٹ مشہور ہیں یا مشہور کمیونسٹ ہیں۔ اس لئے غریبانہ ایرکنڈیشن کمرے سب میں عوامی صوفے سیٹ اور مزدورانہ قالین بچھے ہوتے ہیں۔ کمیونسٹ لباس بین

کر ادرکؔ نون کا مشروب دقتِ آب طہور! نوش جان کر کے تشریف رکھتے ہیں۔ اور ڈائریکٹر تہذیب یعنی کلچر کہلاتے ہیں۔ اس کیفیت اور اس حالت میں اس لئے رہتے ہیں تاکہ ہر لمحہ اس بات کا احساس رہے کہ غریب اور مزدور ان نعمتوں کو ترستے ہیں۔ ان کے لئے ان کی زندگی میں ضرور کچھ کرنا چاہیئے اپنے غریبانہ بنگلے سے غریبانہ دفتر جاتے ہیں اور دفتر سے سیدھے گھر واپس آجاتے ہیں۔ راستے میں ان کو کوئی مقام نہیں جچتا اس لئے خود ہی فرماتے ہیں۔

مقام فیضؔ کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے۔

اکثر احباب کا کہنا ہے کہ دوسرا مصرع کچھ اس طرح ہے کہ "جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے بار چلے"۔ جگر کی آگ تو بار میں ہی ٹھنڈی ہو سکتی ہے۔ لیکن بعض احباب کہتے ہیں کہ سوئے دار چلے' بھی درست ہے۔ کیونکہ دار مشہور و معروف ہستی' داری' کا ہی نام ہے۔ خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔

کیونکہ ابھی تک غریب عوام اور مزدوروں نے ان سے فیض کی امید رکھی ہوئی ہے اس لئے ان کا اصلی نام ہی ان کا جینرک نام ہے۔

نواب جمیل الدین عالیؔ صاحب مشہور عالی خاندان کے عالی مرتبہ شاعر ہیں۔ اپنا کلام نے' میں سناتے ہیں۔ چند لوگوں کا خیال ہے کہ ان کی شاعری ان کے گانے یعنی 'لے' سے بلند ہے۔ مگر زیادہ لوگوں کا خیال ہے کہ ان کا گانا ان کی شاعری سے عالی ہے۔ اللہ ہی جانتا ہے۔ یعنی واللہ اعلم بالصواب۔

ان پر بہت جلد مایوسی طاری ہو جاتی ہے ۱۹۷۱ء میں اتنے مایوس اور بد دل ہو گئے تھے کہ دست بدعا ہو کر' جیوے جیوے پاکستان' جیسے ترانے لکھ ڈالے۔ دراصل ۱۹۶۵ء کے ترانے' جنگ کھیڈ نہیں ہوندی زنانیاں دی'۔' لالہ جی جان دیو'۔' اے پتر ہٹاں تے نہیں

دکھ سے "قوم کے مرد مجاہد تجھے کیا پیش کروں"؟ "اپنی قوت اپنی جان" اتنے سخت اور ثقیل تھے ہضم نہ ہو سکے اور ملک کی صحت پر بڑا برا اثر پڑا۔ ۱۹۷۱ء میں ملک کی صحت خراب ہوگئی۔

۱۹۶۵ء کے عظیم پاکستان کے لئے ۱۹۷۱ء میں سربسجود ہوکر جیوے جیوے پاکستان کی دعا مانگنے کا سہرا ان کے سر ہے۔ ان کا تعلق بھارت کی کسی ریاست سے ہے۔ آپ نے اردو زبان میں "دعا" ایجاد کیا جس کی قوم اور ملک کو سخت ضرورت تھی۔ اور اس کے بغیر گذارہ ممکن نہ تھا۔ آپ بھگت کبیر کی طرح آنکھیں بند کرکے گیان دھیان میں کھو کر لمبی تان لگا کر ضیا محی الدین شو میں دوہے ادا کیا کرتے تھے۔ اس لئے ان کا نام "عالی دوہالی" ہے۔

ابن انشا مزاح نگار ہیں۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ مزاح نگاری میں گدی چڑھی ہوئی ہے۔ دراصل مزاح نگاروں کی اس قوم کے پانچویں اور آخری رکن ہیں۔ جن کی اس لائن میں مناپلی ہے کسی اور مزاح نگار ٹھیکیدار کو بزنس میں ٹینڈر بھرنے نہیں دیتے۔ کیونکہ ابن انشا مزاجیہ لکھتے ہیں۔ اس لئے مزاحیہ رنگ میں ان کا جنیرک نام ابنِ انشا کا اصل ترجمہ بزبانِ پنجابی "انشاء پتر" بہتر ہے۔

ضیا محی الدین نے "ضیا محی الدین شو" کی وجہ سے بہت شہرت حاصل کی یہ شو تھا جس نے ان کی شو بنائی۔ اس لئے ان کا جنیرک نام "ضیا محی الدین شو" ہو کر رہ گیا۔

شعیب ہاشمی پروفیسر ہیں۔ الیکشن کے دنوں میں ٹی وی پر الیکشن کے نتائج بتایا کرتے تھے۔ اس وجہ سے اچانک بہت شہرت عزت اور وقار حاصل کیا۔ بہت خود دار انسان ہیں کسی قسم کا لالچ نہیں۔ روپے پیسے کے سلسلے میں اپنے خاندان سمیت "ٹال مٹول" کرتے ہیں۔ ایک وہ زمانہ تھا وہ عروج۔ مگر اب زمانے کی ستم ظریفی دیکھئے کہ اس عمر میں "اکڑ بکڑ عرف ٹال مٹول" کا جنیرک نام حاصل کر سکے۔ اللہ جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے "اکڑ بکڑ" بنا دے۔

حنیف محمد خان کرکٹ کے بہترین بیٹس مین ہیں ان کا خاندان کرکٹ کی کان ہے۔

بچپن میں انگلستان میں برطانوی ٹیم کے خلاف شاندار کھیل کا مظاہرہ کیا۔ اور انگریزوں سے انگریزی میں "ٹل ماسٹر" کا جینرک نام حاصل کیا۔ آج کل کرکٹ کے میچوں میں ایکسپرٹ کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ زیادہ اُردو کی کمنٹری کا انگریزی میں ترجمہ کر دیتے ہیں۔

نذر محمد کرکٹ کے پرانے کھلاڑی تھے۔ لکھنؤ ٹیسٹ میں پہلے نمبر پر گئے سو سے زیادہ سکور کیا مگر آؤٹ نہ ہوئے۔ مشہور رہے کہ یہ نامور کھلاڑی نورجہاں کی پہلی بال پر لیگ آؤٹ ہو گیا بال ٹانگ پر لگا مگر ٹوٹ گیا بازو۔ ان کا یہ جینرک نام "نذر جھلانگ" ہے۔ شہنشاہ جہانگیر بھی ملکہ نورجہاں کے پہلے کبوتر چھوڑنے پر دل وجان سے آؤٹ ہو گئے تھے۔

شہر لاہور میں نورجہاں نام کی دو ہستیاں ہیں ایک زمین کے نیچے اور ایک زمین کے اوپر۔ ایک راوی کے اِدھر اور دوسری راوی کے اُدھر۔ جو راوی کے اِدھر اور زیر زمین ہیں وہ تو ملکہ نورجہاں "کبوتر والی" ہیں ان کے بھی دو شوہر تھے۔ ایک علی قلی خان جن کا جینرک نام شیر افگن تھا۔ دوسرے شہنشاہ نور الدین جہانگیر۔ جہانگیر کے مقبرے والے ان کا جینرک نام بابا شیخو یا شیخو بابا تھا۔ اور جو نورجہاں راوی کے اُدھر اور ابھی تک زمین کے اوپر ہیں۔ ان کے بھی دو شوہر تھے۔ ایک شاہ نور سٹوڈیو والے اور دوسرے اعجاز درانی یہ دونوں بھی زمین کے اوپر ہیں۔ اُن نورجہاں بقول سعادت حسن منٹو سرورجان کا جینرک نام "ملکہ ترنم" ہے قوم نے ان کی ترنمی خدمات کے صلے میں ان کے سر پہ سونے کا تاج رکھا جو ٹیلی ویژن پر صرف خوردبین سے دیکھا جا سکتا تھا۔ ان میں اتنا ترنم بھرا ہوا ہے کہ انگ انگ سے پھوٹ کر نکلتا ہے۔

محترمہ روشن آرا بیگم نے موسیقی میں بہت نام پیدا کیا اور نام پیدا کرتی چلی جا رہی ہیں تمام راگ اور راگنیاں انہوں نے اپنے چہرے میں سمو لی ہیں۔ وہ الاپتے وقت ایسی شکل بناتی ہیں کہ اس راگ یا راگنی کی ہو بہو تصویر نظر آتی ہیں۔ عنقریب قوم کی طرف سے ان کو ملکہ موسیقی کا جینرک نام دیا گیا۔ بغیر کسی تاج وتخت کے۔

تصور خانم ریڈیو۔ ٹی وی کی مشہور گانے والی آرٹسٹ ہیں۔ انہوں نے فلموں میں چھپ چھپ کر اور ٹی وی پر بالکل سامنے آکر گانے دیئے ہیں۔ تصور خانم گلے کی بجائے زیادہ تر ناک کے زور پر گاتی ہیں۔ گیت کے الفاظ کو ادا کرتے ہوئے الفاظ کی مناسبت سے ناک کو "ٹویسٹ" دیتی ہیں۔ ان کی اس خاص خوبی کے پیش نظر ان کو "نک چاڑھو" کا جینرک نام دیا ہے۔

مہدی حسن ملک کے مشہور گانے والوں میں سے ہیں۔ تصور خانم کی طرح ریڈیو پر گاتے ہیں، ٹی وی پر آتے ہیں۔ فلموں میں چھپ کر گاتے ہیں۔ ان کے گانے بچے بچے اور آئندہ آنے والے بچوں کی زبان پر بھی ہیں۔ مہدی حسن گاتے وقت جیومیٹری کا فارمولا استعمال میں لاتے ہیں۔ گانے اور گیت کی مناسبت سے اتنے ہی زاویئے اور لکیریں ماتھے پر بنا لیتے ہیں جن سے گانا یا گیت سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ یہ خاص خوبی انہی کا حصہ ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ انسان ان کے گانے سے جتنا محظوظ اور لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں اتنی ہی کراکری اور شیشے کے برتنوں کو ان کے گانے سے الرجی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا جینرک نام "گلاس توڑ" ہے۔

ایک عوامی ایکٹر مظہر شاہ ہیں۔ پنجابی فلموں کی گونجدار آواز۔ مارکٹائی سے بھرپور فلموں میں اس زور سے نعرا لگاتے ہیں کہ ہال میں اگلی قطار والے ان کا ساتھ دیتے ہیں اور گیلری میں بچے سہم جاتے ہیں۔ اس خوبی کی وجہ سے ان کا جینرک نام "دبڑک ۱۱" ہو گیا ہے۔

محمد علی کا تعلق فلم لائن سے ہے۔ آپ آب حیات چشیدہ فلمی دنیا کے مستقل ہیرو ہیں۔ ان کے ساتھ کی تمام ہیروئن تو بوڑھی ہو چکی ہیں۔ مگر آپ ابھی تک جوان ہیں سنتوش کمار کے بعد فلم انڈسٹری نے ایسے ہیرو بہت کم پیدا کئے ہیں۔ افسوس ان کو آپ سیٹ صرف چلغوزے کو ملا سر پر نمبر لینے کے لئے نہ ملا۔ ورنہ ان کا جینرک نام "دگ ماسٹر" کی بجائے کچھ اور ہوتا۔

ایک بہت بڑا دلیر اور بے باک ایکٹر جو چند سال بیشتر بڑی شکل سے فلمی دنیا میں داخل ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے 'بیس مین' بن کر شہرت کے چاند پر پہنچ گیا۔ یہ مسٹر رنگیلا ہے۔ آج کل جس طرح دودھ پانی کے بغیر نامکمل ہے۔ اسی طرح ہر پنجابی فلم رنگیلے کے بغیر نامکمل ہوتی ہے یا نامکمل سمجھی جاتی ہے۔ رنگیلا جانوروں کی شکلیں بنا کر عوام کو ہنسنے پر مجبور کرتا ہے جس خاص جانور کی شکل دھارنے میں کمال رکھتا ہے اس کی مناسبت سے اس کا جینرک نام 'گھوڑا' ہے اور یہ نام اس کا اپنا پسندیدہ ہے۔

جینرک نام تو اور بھی بے شمار ہستیوں کے ہیں۔ فی الحال جینرک دواؤں کی طرح ان ناموں کو استعمال میں لا کر تندرستی اور صحت حاصل کیجئے۔

عوامی نیلام گھر

دیکھتی آنکھوں ۔ سنتے کانوں ۔ سونگھتی ناکوں ۔ چکھتی زبانوں اور مخروطی پنج گئی ماٹھ انگلیوں یعنی تمام حواس خمسہ کو تبارک تیز میں نمونہ اور بل بل کا سلام پہنچے ۔ خواتین حضرات یہ پروگرام اصلی بھینس سے نقلی دودھ بنانے والوں کے تعاون سے پیش کیا جا رہا ہے حضرات یہ ڈیری فارم والے ایک ہی خود کفیل بھینس سے ملک کے تمام شہروں کو دودھ سپلائی کرتے ہیں اور ساتھ مکھن بھی ۔

خواتین وحضرات جتنے خطوط میرے پروگرام عوامی نیلام گھر کے سلسلے میں آتے ہیں اتنے خطوط پاکستان کے کسی شہر میں نہیں آتے ۔ یقین کیجئے خطوط منوں میں نہیں بلکہ ٹنوں کے حساب سے آتے ہیں ۔ آٹھ دس فریج خطوط سے بھرے ہوتے ہیں ۔ فریج میں اس لئے رکھے ہیں تاکہ ٹھنڈے رہیں ۔ بے شمار خطوط گرم علاقوں سے آتے ہیں گرم ہیں ان کے خراب ہونے کا ڈر ہے ۔ کس قیامت کے یہ نامے میرے نام آتے ہیں ۔ پروگرام شروع کرنے سے پہلے تین چار خطوط جو ایک فریج میں سے خود بخود نکل آتے ہیں ۔ آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی اجازت چاہوں گا ۔ کراچی سے ایک دوست مشرق بجانب لکھتے ہیں کہ آپ کے پروگرام میں دو لڑکیاں اس طرح نظر آتی ہیں ۔ جیسے پی آئی اے کی ائیر ہوسٹس ہوں ۔ آپ کے پروگرام میں ہی نہیں بلکہ ٹی وی کے اکثر پروگراموں میں نظر آتی ہیں ۔ کیا ان ایئر ہوسٹس کا پروگراموں میں شامل

ہونا اخلاقی یا مذہبی لحاظ سے ضروری ہے... مسٹر حق بجانب لکھنے ہیں حق کاذب ہیں۔ لیکن اس کا جواب ٹیلی ویژن والے ہی دے سکتے ہیں۔ آپ کا پیغام ان تک پہنچا دیا ہے جواب کا انتظار کیجئے بہت جلد قیامت تک پہنچ جائے گا۔ یہ دوسرا خط ساہیوال سے مس منگمری جن کا اسلامی نام نیک بخت چھالیہ ہے فرماتی ہیں تمیز صاحب آپ کا عوامی نیلام گھر تمام دنیا میں سب سے پہلا اور آخری نیلام گھر ہے۔ جہاں پرانی اور استعمال شدہ اشیاء کی بجائے بالکل نئی چیزوں کو نیلامی کے لئے پیش کیا جاتا ہے۔ یہ بات ملک کے دولت مند ہونے کی دلیل ہے۔ اس سے غیر ملکوں میں ہماری عقل مندی کا وقار بڑھتا ہے... میں مس نیک بخت چھالیہ کی آدھی بات سمجھ سکا۔ اور آدھی نہ سمجھ سکا۔ تاہم میں ان کی خدمت میں عرض کرتا ہوں کہ ہمیں اس اکلوتے کارنامے پر فخر ہے جو دنیا میں کہیں نہیں ہوتا۔ وہ ہم کر رہے ہیں۔ ان کی خدمت میں عرض کرتا ہوں ہم ملک کی نئی چیزیں نیلام کرنے میں خود کفیل ہیں اور ان شاء اللہ ملک میں کوئی نئی چیز نہیں رہنے دیں گے۔ سب نیلام کر دیں گے دوست احباب کے گھر پہنچا دیں گے (تالیاں)... راولپنڈی سے ایک دوست نقطہ نظر صاحب رقم طراز ہیں۔ تارک صاحب آپ کے نام کے ساتھ تمیز نام کا حصہ ہے یا آپ کا تخلص ہے؟... میرے دوست بہت اچھا سوال کیا۔ میں ان کا مشکور ہوں۔ دراصل بچپن میں مجھ سے اکثر بدتمیزیاں ہوتی رہیں مجھے میرے بزرگ اکثر ٹوکتے اور ڈانتے رہتے تھے۔ جب کبھی ایسی ویسی بات یا حرکت سرزد ہو جاتی تو وہ میری طرف اشارہ کر کے فرماتے 'تمیز' تمیز' تمیز' یہ لفظ اتنا استعمال ہوا کہ میرے نام کا حصہ بن گیا۔ خواتین و حضرات میں نہیں کہہ سکتا کہ آج کل بھی مجھ سے کوئی ایسی ویسی حرکت ہوتی ہے یا نہیں۔ اس کا علم تو آپ کو ہوگا۔ کیونکہ انسان کو اپنے عیوب خود نظر نہیں آتے۔ البتہ دوسروں کو ضرور نظر آتے ہیں۔ ویسے مجھے اس سلسلے میں کافی خطوط آتے ہیں۔ تاہم میں ان تمام حضرات کا شکر گزار ہوں جو مجھے میری

کوتاہیوں سے روشناس کراتے ہیں ۔خواتین حضرات بطور انسان غلطیوں کی گنجائش مجھ میں بھی ہے ۔ (تالیاں)

خواتین وحضرات اب آپ کی اجازت سے پروگرام شروع کیا جاتا ہے ۔اجازت ہے ۔بس بل غبل لائیے سوالوں کے کارڈ دیکھئے اور ہاں ایک بات اور ۔اور وہ یہ کہ سوالوں کے متعلق اکثر درست احباب نے پوائنٹ آؤٹ کیا ہے کہ جب میں کسی مہمان کو ناکام بنانا چاہتا ہوں تو پھر سوال چھانٹنا شروع کر دیتا ہوں ۔اور مشکل سے مشکل سوال ڈھونڈ نکالتا ہوں یہ الزام سراسر غلط اور بے بنیاد ہے اور سوچی سمجھی سکیم ہے ۔دراصل میں سوال مہمان کے ذہن اور لیاقت کے مطابق چھانٹ کر نکالتا ہوں اور بالکل روائتی ایمانداری کے ساتھ ۔

لیجئے پروگرام شروع کرتے ہیں ۔اچھا بی بی آپ بتائیں اگر آپ کے دائیں پاؤں میں دائیں چپل ہے تو بائیں پاؤں میں کونسی چپل ہو گی .... بائیں چپل ..... جواب بالکل درست ہے (تالیاں) اچھا بی بی ایک اور سوال کی اجازت ہے ۔تو بتلیئے جانور گھاس کیوں کھاتے ہیں .... کیونکہ گوشت دن بدن مہنگا ہوتا جا رہا ہے .... بی بی آپ کا آدھا جواب درست ہے ۔مگر اصل وجہ بتائیے ..... اصلی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ شائد وہ بھی ایٹم بم بنانا چاہتے ہوں .... جواب بالکل درست ہے (گونجدار تالیاں) خاتون آپ ابھی سے اپنے مرحلے میں جائیں اور یہ آپ کے ساتھی بھی آپ کے ساتھ جائیں (تالیاں) اب بی مرحلے کے لئے ایک مہمان کی ضرورت ہے .... ہاں صاحب آپ بتائیے فرانسیسی زبان میں مینڈک کو کیا کہتے ہیں .... ڈڈو .... جواب ٹھیک ہے (تالیاں) دوسرا سوال آپ سے آپ کو پہاڑا یقیناً آتا ہے ..... جی آتا ہے .... تو پھر آپ ضرور پہاڑ پر گئے ہوں گے اچھا تو یہ بتائیے ایک ڈڈو ۔ڈڈو اور دو ڈڈو کتنے ہوتے ..... دو ڈڈو تین یعنی ایک ڈڈو اور دو ڈڈو کل تین ہوئے .... جواب درست ہے ۔(تالیاں) جناب آپ تو حساب میں ماہر نظر آتے ہیں ۔آپ سے آخری سوال ۔پانچ کے عدد کو کس سے ضرب دیں کہ

حاصل حزب پندرہ[15] آتے ..... لیجئے سُن لیجئے۔ فرماتے ہیں تھوڑے سے۔ جواب درست ہے (تالیاں) خواجہ دل محمد ہمارے ملک کے نامور حساب دان گذرے ہیں اُن کی حساب کی کتاب پر حضرت جگر کا مصرع لکھا ہوا ہے۔ "پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر" خواتین و حضرات اس فارمولے سے تھوڑا صحیح جواب ہوا۔ چلئے صاحب ہی مرحلے میں۔ مس نورینہ اُن کو اور اُن کی ساتھی خاتون کو بی مرحلے میں بٹھلایئے (تالیاں) جی کیا کہا آپ نے کہ یہ مصرع اقبال کا ہے میں جانتا ہوں۔ لیکن صاحب کارڈ پر تو جگر کا لکھا ہوا ہے۔

خواتین و حضرات اب وقت ہے۔ ہمارے کھیل علی بابا انٹرکون کے مہمانوں کا۔ جب میری مالی حالت اچھی ہوتی تھی تو میں بھی اکثر علی بابا انٹرکون میں ٹھہرا کرتا تھا۔ لیکن جب سے ٹی وی والے خسارے میں جا رہے ہیں۔ تب سے میں انٹرکانٹیننٹل میں ٹھہرتا ہوں تو کیس شروع کیا جاتا ہے۔ ادھر آؤ دونوں بیٹے میرے پاس یہاں بیٹھو سیڑھی پر..... آپکا کیا نام ہے بیٹے؟... گلاب ہاشمی .... کونسی کلاس میں پڑھتے ہو؟ .... انٹر کلاس میں۔ وہ جو کبھی ریلوے میں ہوتی تھی۔ اچھا تو بڑے ہو کر کیا ہو گے؟... کیا کہا ڈاکو۔ بیٹے ذرا صاف اور زور سے کہو.... اچھا ڈاکٹر میں سمجھا تھا ڈاکو۔ خیر کوئی بات نہیں۔ اچھا تو بیٹی کا کیا نام ہے؟ .... شگفتہ ہاشمی ..... دونوں بہن بھائی نظر آتے ہو۔ اس عمر میں اور ہو بھی کیا سکتے ہو۔ اچھا تو بیٹی بڑی ہو کر کیا بنے گی؟.... خواتین و حضرات سن لیجئے کہتی ہیں میں بڑی ہو کر زیبا بنوں گی (تالیاں) اچھا بیٹی تم دونوں ہال میں جاؤ بیٹا۔ اس طرف اور بیٹی اس طرف اور جو باجی یا آنٹی آپ کو پسند آئے یا نہ آئے ہاتھ پکڑ کر ادھر لے آئیں۔ بیٹے دیکھنا باجی یا آنٹی اصلی ضرور ہو۔ وہ کیا کہتے ہیں "دادل خویش" کا خیال ضرور رکھنا .... اور ہاں خواتین و حضرات ہم سے اکثر یہ شکایت کی جاتی ہے کہ ہم عموماً بڑے بڑے افسروں یا سیٹھ قسم کے لوگوں کے بچوں کو باجی یا آنٹی کے انتخاب کے لئے بلاتے ہیں۔ عوامی

نیلام گھر میں عوام کے بچوں کو موقع نہیں دیتے۔ اس سلسلے میں عرض کروں کہ بچوں کو بلانے کا کام ٹی وی والوں کا ہے۔ اس سے اس گناہ گار کا کوئی تعلق نہیں وہ کسی افسر کے بچوں کو بلائیں یا اپنے ذاتی بچوں کو ...... آپ تینوں خواتین ادھر تشریف لے آئیں۔ سامنے جو بورڈ گول گول نظر آرہا ہے جس پر صفر سے ڈیڑھ سو تک نمبر لکھے ہوئے ہیں۔ آپ اس بورڈ پر تیر لگائیں آپ میں سے جس کا تیر سب سے زیادہ نمبر پر لگے گا۔ اُس کو اتنے ہی روپیے انعام دیا جائے گا۔ اگر تیر سو نمبر پر لگا تو سو روپیہ انعام۔ اگر بیس نمبر پر لگا تو بیس روپیہ انعام اور صفر پر لگا تو انعام بھی صفر روپیہ ہو گا۔ کھیل شروع کرنے سے پہلے ایک بات یاد آئی۔ گوجرانوالہ سے ایک صاحب نے تجویز پیش کی ہے کہ اس کھیل کے دوران میں طلعت محمود کے مشہور گانے کی ٹیپ یا اُس گانے کی دھن بجائی جائے جس کے بول ہیں " تیر چلا تیر چلا او تیر چلانے والے آسامنے اگر تیر چلا"۔ تجویز بہت اچھی اور موقع کے مطابق ہے۔ مگر ہم افسوس کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ چونکہ گانا بھارت کا ہے۔ اس لئے ہم اس گانے کی نہ ٹیپ لگا سکتے ہیں اور نہ ہی اس کی دھن بجا سکتے ہیں پابندی ہے اگر یہ گانا ریشماں یا فیض بلوچ کا گایا ہوتا تو ہم تجویز مان لیتے تاہم اُن کی تجویز کا شکریہ۔ ہاں ایک بات اور بہت ضروری یاد آگئی۔ اس کھیل کے سلسلے میں ایک خط ٹوبہ ٹیک سنگھ سے جناب مولانا فاضل خان صاحب کا آیا ہے فرماتے ہیں "تبارک تبیز صاحب تمام پاکستان میں جوا ممنوع قرار دیا جا چکا ہے اور اس کا اعلان بھی ٹی وی پر ہوا تھا مگر آپ تیر لگوا کر خواتین کو رقم دیتے ہیں۔ کیا یہ جوا نہیں۔ کیا یہ حرام نہیں۔ کیا جوا وہی ہوتا ہے جس کے سر پر سینگ ہوں؟" ......

میں مولانا کی خدمت میں عرض کرنے کی جرأت کرتا ہوں پہلی بات تو یہ ہے کہ اگر مرد حضرات تیر لگائیں تو حرام ہے۔ اسی لئے میں ان کو موقع نہیں دیتا اور اگر خواتین تیر

چلائیں تو یہ جائز ہے۔ کیونکہ تیر چلانا خواتین کا پیدائشی حق ہے (تالیاں) دوسری بات یہ ہے کہ جیسا پروگرام ٹی وی والے میرے سپرد کرتے ہیں میں کرتا ہوں اُن کا حکم بجا لاتا ہوں، آخر مجھے بھی تو پیٹ بھرنا ہے۔ یہ میری روزی کا سوال ہے۔ نظیر اکبر آبادی نے کیا خوب کہا "روٹی تو کما کھائے کسی طور مچھندر" (زوردار تالیاں) حضرات گناہ ثواب ٹی وی والوں کے سر۔ تیسری بات یہ ہے کہ مولانا یہ تو تیروں کا کھیل ہے۔ ملک میں ابھی تک سودی کاروبار زوروں پر چل رہا ہے۔ سود کے متعلق قطعی حرام ہونے کا حکم ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ سودی کاروبار کرنے والوں کی میرے اور میرے رسولؐ کے ساتھ جنگ ہے توبہ توبہ کس کی طاقت ہے کہ اللہ تعالیٰ یا اُس کے رسولؐ کے ساتھ جنگ کرے۔ مگر سود ہے کہ چل رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کہیں نہیں کہتا کہ جو تیر چلائیں گے میری ان کے ساتھ جنگ ہے۔ آخر میں میں مولانا فاضل خان صاحب سے درخواست کروں گا کہ وہ اس سلسلے میں واقفیت حاصل کرنے کے لئے وزارت مذہبی امور سے رجوع کریں ...... اچھا بی بی اعتراض تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ آپ آئیں اور اس لائن پر کھڑی ہو جائیں اور جب میں ایک دو تین کہوں تو سامنے بورڈ پر تیر مار دیں چلئے تیار۔ ایک۔ دو۔ تین..... اوہو آپ نے تو تیر مشرق کی طرف مار دیا جدھر سے سورج نکلتا ہے۔ وہ بھی تو گول ہوتا ہے۔ مجھے افسوس ہے خاتون میں آپ کو نہ مشرق انعام میں دے سکتا ہوں اور نہ سورج ..... اب آپ آئیں خاتون... ریڈی۔ ایک۔ دو۔ تین .... لائیے میں ہر گیا یہ تو پورے دو سو پر جا لگا۔ اب باقی کیا رہ گیا۔ (تالیاں) آئیے بی بی اب آپ کی باری ہے۔ ہو سکتا ہے آپ کا تیر بھی دو سو پر جا لگے اچھا تو تیار ایک۔ دو۔ تین .... معاف کیجئے خاتون آپ نے تو تیر زمین پر دے مارا اور اس کی نوک توڑ دی۔ خیر کوئی بات نہیں یہ تیر ٹی وی والوں کا ہے میرا نہیں۔ اس لئے کوئی افسوس کی بات نہیں۔ جس خاتون نے سب سے زیادہ یعنی پورے کے پورے

نمبر حاصل کئے ہیں۔ میں اُن کی خدمت میں دو سو روپیہ سکہ رائج الوقت پیش کرتا ہوں۔ یہ لیجئے بی بی نئے نئے نوٹ ہیں۔ (تالیاں) اب آپ اپنی جگہ پر تشریف رکھیں ..... اور ماں اپنے بیٹے اور بیٹی کے لئے ایک ایک ڈبہ کرو (Crown) پن بنانے والوں کی طرف سے۔ ان قلموں میں نب لگا کر خوب خوب لکھیں۔ اور جلد ڈاکٹر بن جائیں۔ اور یہ لیجئے بیٹے اور بیٹی کے لئے ایک ایک فلاسک راولپنڈی میونسپل کمپنی کی طرف سے۔ اس میں مشروب وقت ٹھنڈا واٹر کولا اگر رل سکے تو بھر کر سکول لے جائیں اور اپنی مس کو پلائیں۔

اب ہمیں سی مرحلے کے لئے مہانوں کا انتخاب کرنا ہے اچھا خاتون آپ بتائیں یہ گیت کس نے گایا ہے "جُتی کھل دی مروڑا نہیں جھل دی ٹور پنجابن دی" ..... شبنم نے ..... نہیں بی بی آپ کا جواب غلط ہے شبنم تو پنجابن نہیں وہ تو کیا جوتی توڑے گی پنجاب کی جوتی تو شبنم کا پاؤں مروڑ دے گی۔ تو پھر کون صاحب بتائیں گے ..... اچھا آپ بتائیں گے بزرگوار تو فرمائیے یہ گیت جُتی کھل دی مروڑا نہیں جھل دی ٹور پنجابن دی کس نے گایا؟ ..... زبیدہ خانم نے ..... جواب درست ہے۔ (تالیاں) بزرگوار یہ فرمائیں آپ کو کیسے علم ہوا کیا آپ نے اُس کو گاتے ہوئے سنا تھا یا جوتی پہنے دیکھا تھا ..... جی نہیں نہ گاتے سنا نہ جوتی پہنے ہوئے دیکھا اور نہ جوتی کو مروڑا دیتے ہوئے دیکھا بلکہ میں نے ایسی جوتیاں زبیدہ خانم کو سپلائی کی تھیں انارکلی میں میری جوتوں کی دکان ہے۔ عوامی بوٹ گھر (تالیاں) ..... چلئے اپنے ساتھی کے ساتھ سی مرحلے میں تینوں مرحلوں کے دوست پورے ہو گئے۔

خواتین و حضرات اب باری ہے حامد فروٹ جوس بنانے والوں کے مہمان کی آپ کو معلوم ہے کہ حامد جوس بنانے والے اچار چٹنیاں، مربے اور جوس بنانے میں ماہر نفسیات ہیں جوس کیا نکالتے ہیں بلکہ جوس کا جلوس نکال دیتے ہیں۔ ان کی خاص خوبی یہ ہے کہ بیکار سے بیکار پھل بھی استعمال میں لے آتے ہیں ضائع نہیں

ہونے دیتے جیسے مرلیفں مرغیاں ہوٹلوں کی زینت بن جاتی ہیں۔ خدا کھانے والوں کو سلامت رکھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خواتین و حضرات میرے دوست جو پس پردہ ہیں ان کا تعلق فلمی دنیا سے ہے وہ بھی اس لئے کہ ہمارے ملک میں فلمی دنیا کے سوا اور کوئی دنیا نہیں ہے۔ اگر ہے تو ہمیں نظر نہیں آتی۔ تو ہمارے اس دوست نے بے شمار فلموں میں گھریلو قسم کا کام کیا ہے کسی فلم میں خانساماں بنے ہیں کہیں مالی کہیں بیرے اور کسی فلم میں ڈرائیور کا کردار ادا کیا ہے۔ ایک فلم میں بیرے کا کردار اس خوبی سے ادا کیا کہ چار کی ٹرے مہمانوں کے پاس لے جا رہے تھے۔ پلیٹ میں آٹھ پیسٹریاں تھیں مگر مہمانوں تک پہنچتے پہنچتے چار پیسٹریاں رہ گئیں اس کارکردگی پر ان کو چیمپ چورا ایوارڈ ملا تھا۔ ان کا قد ڈھائی فٹ بارہ انچ ہے ان کے دوست ان کے قد کو دیکھتے ہوئے ان کو ہینڈ پمپ کہتے ہیں۔ یہ جتنے زمین کے اوپر ہیں اس سے کئی گنا زمین کے اندر ہیں۔ ان کا رنگ مکئی کے دانوں کی طرح سنہری ہے۔ ذرا ذرا سبزی مائل بلکہ مائل پرواز۔ ابل لاہوران کی ایک فلم "پکی پکائی روٹی" کی سلور جوبلی منا چکے ہیں اور اب یہ فلم گولڈن جوبلی کی طرف تیزی سے جا رہی ہے۔ آج کل نئی فلم "گنے کا رس" میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں اپنے دوست سے درخواست کرتا ہوں کہ کوئی فلمی مکالمہ بلند آواز سے سنائیں۔ خواتین و حضرات آپ میں سے جو ان کو پہچان لیں وہ ہاتھ کھڑا کر دیں پہچاننے والوں کو گاما لیس کریم کے کوپن تین پشتوں کے لئے بشرطیکہ ٹیلٹری فیل نہ ہو جائے اور سانگلا ہل تک آنے جانے کا ٹکٹ اور ہوٹل کا پورا پورا خرچ دیا جائے گا۔ گرمیوں کا تمام سیزن آپ وہاں ٹھہر سکتے ہیں تو حضرات ٹکٹ حاصل کر کے سانگلا ہل کی سرد ہواؤں سے لطف اندوز ہوں۔ دیکھئے مجھے کتنا پسینہ آ رہا ہے۔ میں ذرا کوٹ اتار دوں۔ مس نمونہ یہ میرا کوٹ ادھر رکھ دیا سنبھال کر دیکھنا کہیں انعام میں نہ چلا جائے ۔ ۔ ۔ ۔ ہاں تو میرے دوست کچھ فرمائیے ہم سب ہمہ تن خرگوش ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(باریک اور تیز آواز) بیگم صاحب میں شیور کے مرغ کے پسندے بنا کر ان پر لیپنے ہاتھ سے لگاتے ہوئے ٹماٹر سجا کر اور پھر ٹیبل لگا کر آپ کو کھانا کھلا کر ہاتھ دھلوا کر نئی بیوک کار میں آپ کو پلازا سینما چھوڑ آؤں گا تاکہ آپ میری فلم "پکی پکائی روٹی" چوتھی بار مفت دیکھ سکیں آپ کو یہ فلم بہت پسند ہے کیونکہ انٹرول میں اس میں پکی پکائی روٹی مفت ملتی ہے اور اس میں آپ کے خانساماں، مالی بیرے اور شوفر نے لاجواب کام کیا ہے اور ایوارڈ حاصل کیا ہے ..... (تالیاں)

اچھا صاحبان آپ نے میرے دوست کا مکالمہ سنا جن حضرات نے ان کو بوجھ لیا ہو ہاتھ کھڑا کریں ..... اچھا صاحب آپ فرمائیں ...... محمد علی ..... جی آپ فرمائیں .... دلجیت مرزا ..... ہاں خاتون آپ فرمائیں .... یہ گھنو ہے اسد بخاری کا بیرہ ..... اچھا دیکھتے ہیں یہ کون ہیں محمد علی دلجیت مرزا یا مسٹر گھنو صاحب ..... اچھا تو میرے دوست خالد موٹا صاحب باہر تشریف لے آئیں ..... آیئے آیئے ادھر میرے پاس آیئے لو صاحب یہ تو ہمارے دوست گھنو صاحب نکلے ، خاتون آپ جیت گئیں (تالیاں) آپ کو سائگاہل کی سیر مبارک اور ہوٹل کی رہائش بھی اگر وہاں کوئی ہوٹل ہوا اور ساتھ ہی گاما آئیس کریم کے تین پشتی کوپن (گونجدار تالیاں)

اچھا تو میرے دوست گھنو صاحب حاضرین اور ناظرین کی اطلاع کے لئے بتائیں کہ آپ نے فلموں میں کب اور کیوں کام شروع کیا اور تکلیف کیا تھی ..... تابرک تمیز صاحب کام میں نے کب شروع کیا تو ان کا جواب ہے جب سے مجھے ملا . اور کیوں شروع کیا تو اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ میں انٹرنیشنل ہوٹل علی بابا میں بیرہ گیری کا کام کرتا تھا ، جب ٹرے لے کر چلتا تو ایسا معلوم ہوتا کہ ٹرے میرے آگے خود بخود یعنی آٹومیٹکلی چل رہی ہے اور میں اُسے ڈرائیو کر رہا ہوں . خوش قسمتی سے ایک شام اسد بخاری صاحب ہوٹل میں بیٹھے ہوئے چائے پی رہے تھے . ان کو میری یہ ادا پسند آگئی ، وہ مجھے اپنے ساتھ گھر لے گئے اور مجھے

فلموں میں ہیرو گیری کا رول دینے لگے اور اپنے گھر پر بھی۔ اب رہی تکلیف تو تکلیف ان کو تھی مجھ کو نہیں۔ (تالیاں) اچھا گھسّو بھائی آپ نے کل کتنی فلموں میں کام کیا ہے اور سب سے بہترین رول کس فلم میں ادا کیا ہے .... تقریباً چار سو بیس فلموں میں ... سب سے بہترین کردار کچی پکائی روٹی میں ہے۔ اس پر مجھے سلور گرل (silver grill) ایوارڈ ملا تھا۔ اس فلم میں ہیرو ننھا تھا، ہیروئن شمرنٹ بال اور دلہن کا کردار خالد موٹے نے ادا کیا۔ وہ تینوں پلانٹ کی کچی پکائی روٹیاں ساری کی ساری ایک ہی سیٹنگ (sitting) میں چٹ کر گئے تھے۔ مگر میں نے اس تیزی سے سروس کی کہ لنک نہیں ٹوٹنے دیا اس پر مجھے ایوارڈ دیا گیا۔ (تالیاں) ..... آپ کو ایوارڈ کس قسم کا ملا؟ ..... چاندی کا ایک بہت بڑا میڈل توے کے برابر۔ آج کل ہم اس میڈل پر روٹیاں پکاتے ہیں۔ (تالیاں) .... گھسّو میاں عوامی نیلام گھر کی ایک ریت ہے جو ہمارے باپ دادا کے وقتوں سے چلی آرہی ہے ہم اپنے دوستوں کی خدمت میں چند تحفے مفت پیش کیا کرتے ہیں ...... قطع کلامی معاف تارک صاحب تحفے ہمیشہ مفت ہوتے ہیں۔ (تالیاں) .... گھسّو بھائی آپ کی اس اصلاح کا شکریہ۔ تو لیجئے آپ کے لئے۔ سوٹ ٹاٹ کاٹن مل والوں کی طرف سے۔ اگر سائز چھوٹا ہو تو اُن سے بدلوالیں۔ اور یہ سوٹ جیوٹ کا آپ کی بیگم کے لئے اُن کی طرف سے۔ یہ تو آپ کو علم ہے کہ رستم اور سہراب جاپان کے نامی گرامی پہلوان تھے جیسے 'انوکی' ایران کا پہلوان ہے۔ لیکن ہمارے ملک میں ان بیچاروں کو صرف سائیکل کا درجہ دیا گیا ہے۔ کہاں جاپان کے پہلوان اور کہاں پاکستان کے سائیکل۔ رستم اور سہراب سائیکل بنانے والوں کی طرف سے آپ کے لئے ایک لڑائی سائیکل سٹوڈیو جانے کے لئے۔ اور سیالکوٹ سپورٹس انڈسٹری کی طرف سے ایک فٹ بال سٹین لیس سٹیل کا۔ اس کے ساتھ کھیلنے سے قد بڑھتا ہے یہ اُن کا دعویٰ ہے اور یہ جو سامنے بڑا سا پیکٹ یا ڈبہ نظر آرہا ہے۔ اس میں مشروب جنجھب شربت روح فرصا کی بارہ بوتلیں ہیں۔ یہ روح

فرسا کمپنی کی طرف سے آپ کی خدمت میں۔ اور آخری حقیر تحفہ جناب تقسیم دین آئس کریم دین مالکان آئس کریم۔ کلفا اور کھیر فیکٹری لائلپور جو آج کل ساہیوال یعنی منٹگمری والا کا بھائی ہے والوں کی طرف سے لائلپور کا گھنٹہ گھر۔ اس کی طرف آٹھ سڑکیں آتی ہیں وہ بھی آپ کی نذر۔ جس دن آپ کو فرصت ہو ساہیوال چلے جائیے۔ ٹی وی والے بین فرسٹ کلاس جو اکثر لکھی جاتی ہیں۔ اس کا کرایہ دیں گے اور ایک خط۔ آپ تقسیم دین آئس کریم دین کو یہ خط دکھا کر گھنٹہ گھر اور سڑکوں پر قبضہ کر لیں۔ گھنٹہ گھر آپ کا ہو چکا گھنو صاحب آپ کچھ کہنا چاہیں گے ...... جی میں تقسیم دین آئس کریم دین صاحبان کا شکریہ ادا کرتا ہوں انہوں نے مجھ ناچیز چھوٹے سے انسان کو اتنی بڑی چیز کا تحفہ دیا اب اور کسی چیز کی ضرورت نہیں رہی۔ میں یہ تحفہ ٹی وی والوں کی خدمت میں پیش کرتا ہوں کہ وہ اسے بطور ٹرانسمشن ٹاور استعمال کریں اور وہ فنی خرابی جاتی رہے جو اکثر رابطہ توڑ دیتی ہے۔ اور سڑکیں محکمہ آثار قدیمہ کی خدمت میں پیش کرتا ہوں کہ وہ ان کی حفاظت کریں شکریہ (تالیاں) ....

اچھا تو میرے دوست گھنو صاحب اب آپ وہاں تشریف رکھیں اور باقی پروگرام دیکھیں۔

اب باری ہے سی مرحلے کی۔ سی مرحلہ کے مہمانوں کے لئے سیما ریڈیو والوں نے ڈیڑھ بینڈ کا ریڈیو سیٹ بھیجا ہے۔ یہ ڈیڑھ بینڈ کا ریڈیو سیما کمپنی کی خاص ایجاد ہے اس ریڈیو سیٹ پہ پنڈی سے گوجر خان تک۔ پشاور سے چارسدہ تک کراچی سے ملیر تک اور لاہور سے کامونکی تک اور کوئٹہ سے سبی تک سنا جا سکتا ہے۔ تو ہاں صاحبو نیلام گھر کی قیمت سات سوال۔ بڑی جلدی جلدی دیکھئے اور لوٹ لیجئے نیلام گھر کو۔ آج میری دعا ہے اور مجھے خوشی ہوگی اگر نیلام گھر لٹ جائے جی تو پانچ سوال ایک پانچ سوال دو...... پانچ سوال دو۔ پانچ سوال تین۔ مس نمونہ سوال لائیے۔ آپ مائیکروفون اپنے سامنے کر لیں اور اپنے ساتھی سے مشورہ کر کے جواب دیں۔ بہت آسان سوال ہے۔ بکرے کے دو سینگ ہوتے ہیں گدھے کے کتنے سینگ ہوتے ہیں ..... گدھے کے سر سے

سینگ غائب ہوتے ہیں ، کوئی سینگ نہیں ہوتا ...... جواب درست ہے تالیاں :
آپ نیلام گھر میں حصہ لینے کے لئے یقیناً پنڈی سے تشریف لاتے ہیں ۔ دوسرا سوال ،
لاہور میں ایک ملکہ زمین کے نیچے ہے اور دوسری زمین کے اوپر ۔ آپ ان کے نام بتائیے ...
جی بتائیے ساتھی سے مشورہ کر کے ...... جو زمین کے نیچے ہے وہ نورجہاں کبوتر والی
ہے اُس کے دو خاوند تھے آخری جہانگیر تھا وہ بھی زمین کے نیچے ہے ۔ اور جو ملکہ زمین
کے اوپر ہے وہ نورجہاں ترنم والی ہے ، اُس کے بھی شاید دو خاوند تھے ، آخری اعجاز
درانی تھا جو زمین کے اوپر ہے ..... جواب بالکل درست ہے (تالیاں) آپ نے پانچ
سوالوں میں سے دو سوالوں کے جواب درست دیئے ہیں ، تین سوالوں کے جواب دینے ہیں
اور دو غلطیوں کی گنجائش ہے ۔ ذرا سی ہمت سے آپ ریڈیو سیٹ جیت جائیں گے شکل
سے آپ دونوں میری طرح تقریباً ذہین دکھائی دیتے ہیں ۔ میرے بھائی غور سے سنیئے
مشرق مغرب شمال جنوب میں سب سے بڑا کونسا ہے ؟ ..... چاروں برابر ہیں
فرسٹ کزن ہیں ...... جواب درست ہے (تالیاں) بلے ریڈیو آپ کا ہوچکا ،
مسز ہل بل اب انہوں نے اور کتنے سوالوں کے جواب دینے ہیں .... دو کے اور گنجائش
بھی دو غلطیوں کی ہے ۔ تو لیجئے صاحب بہت ہی آسان سوال ہے ، ایک ذرا اور ترتیب
کرلیں ۔ بتلائیے مولانا الطاف حسین حالی پانی پتی کہاں کے رہنے والے تھے اور ان کو
حالی کیوں کہتے ہیں ؟ ..... آپس میں مشورہ کرلیں .... کرٹ لکھ پت کے
رہنے والے تھے اور اُن کو حالی اس لئے کہتے ہیں کہ وہ ہل چلایا کرتے تھے ۔ ... مجھے
افسوس ہے آپ کا جواب غلط ہوا ۔ وہ پانی پت کے رہنے والے تھے آپ کو کس نے
بتایا کہ وہ ہل چلایا کرتے تھے کیا وہ لاکھ نمازوں کا ثواب لوٹنا چاہتے تھے ، حالی تو ان کا تخلص
تھا ۔ اب ایک غلطی ہوگئی اور ایک غلطی کی گنجائش ہے اور آپ نے دو سوالوں کے جواب
دینے ہیں غور سے سنیے اور غلطی نہ کیجئے ۔ نیویارک میں دودھ کا رنگ زرد ہوتا ہے مجارت

میں سفید۔ یہ بتائیے پنجاب میں دودھ کا رنگ کیسا ہوتا ہے؟ اطمینان سے جواب دیں ...... پنجاب میں دودھ کا رنگ پانی کی طرح چٹا ہوتا ہے ..... جواب بالکل درست ہے (تالیاں) اب میرے بھائی آپ نے ایک سوال کا جواب دینا ہے اور ایک غلطی کی گنجائش ہے اگر آپ چاہیں تو سودا بازی ہو سکتی ہے۔ ۱۵۰ روپیہ منظور ہے ...... ہرگز نہیں۔ سودے بازی پبلک کے سامنے ہمارا سیاسی اصول نہیں آپ سوال پوچھئے۔ (تالیاں) اچھا تو دس سیکنڈ میں تین ایسے نام بتائیں جو 'ط' سے شروع ہوتے ہوں ...... طاہر علی ...... اور طارق عزیز ...... اور اور اور .... ہاں طوطا رام۔ نہیں میرے بھائی وقت ختم ہو گیا تھا۔ ایک غلطی ہو گئی۔ اب غلطی کی گنجائش نہیں بہت آسان سوال ہے میری دلی تمنا ہے کہ آپ ریڈیو سیٹ جیت جائیں۔ دل کی دھڑکن کا کیا حال ہے بہت تیز ہے ۱۰۸ درجہ فارن ہائٹ تک پہنچ گئی ہے۔ گھبرائیے نہیں اطمینان سے جواب دیں ...... اگر ناک کو الٹ دیا جائے تو جسم کا ایک اور حصہ بن جاتا ہے۔ اس حصہ کا نام بتلائیے ...... کان ...... بالکل درست ہے آپ ڈیڑھ بینڈ کا سیما ریڈیو سیٹ جیت گئے آپ دونوں کو مبارک۔ (تالیاں) مس نمونہ ان کو سیما ریڈیو سیٹ دیجئے۔

وقفہ

اشتہار

"اصلی بھینس کا نقلی دودھ اصلی دودھ کے قریب تر ہے۔ ہر جگہ دستیاب ہے ڈبے پر اصلی بھینس کے نقلی کٹے کی تصویر دیکھنا نہ بھولئے۔"

وقفہ ختم

بی مرحلہ میں آپ نے سولہ میں سے گیارہ سوالوں کے جواب دیئے آپ کے چھ

جواب درست ہیں اور چار غلط ۔ صرف ایک غلطی کی گنجائش ہے ۔ پانچ سوالوں کے جواب دے کر نیپالی کلر ڈی وی سیٹ جیت جائیے ۔ یہ شعر مکمل کیجئے ۔ مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں ۔۔۔ پھر سے پڑھیے یہ راہ میں جچا ہی نہیں کیا ہوا میرے بھائی غور سے سنیں یہ جچا نہیں جچا ہے ۔ مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں ۔۔۔۔۔ دوسرا مصرع بتائیے ۔۔۔۔۔۔ جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے ۔۔۔۔۔۔ جواب درست ہے ۔ (تالیاں) خواتین و حضرات یہ حقیقت ہے کہ جب انسان پر مایوسی طاری ہو جاتی ہے تو پھر سوائے دار کے اصول کے اس کے لئے اور کوئی جگہ نہیں ہوتی جہاں وہ غم غلط کرے ۔ شاعر نے تجربے کی بنا پر حقیقت بیان کی ہے ۔ گو یہاں پابندی ہے ۔ لیکن یہ تو شعر ہے اس پر کوئی پابندی نہیں ۔ ہل جل کتنے جواب درست ہیں ۔۔۔۔ سات ۔۔۔۔۔ اب چار سوالوں کے جواب دینے ہیں اور ایک غلطی کی گنجائش ہے ۔ اچھا صاحب اس طرح کرتے ہیں ۔ غلطی کی کوئی گنجائش نہیں آپ ایک سوال کا جواب دے کر ٹی وی سیٹ جیت جائیں ۔ کیسے منظور ہے ؟ ۔۔۔۔۔۔ منظور ہے اور ہال کو بھی ۔۔۔۔۔ تو پھر بتائیے راولپنڈی سے لاہور ۱۷۵ میل ہے اب یہ بتایئے لاہور سے راولپنڈی کتنے میل ہے ۔ میلوں میں بتائیے ۔ کلر کو بھول جائیے کو تو مجھے بھی نہیں آتے ۔۔۔۔۔ ۱۸۱ میل یہ فاصلہ اس لئے بڑھ گیا کیونکہ جہلم سے راولپنڈی کی طرف چڑھائی شروع ہو جاتی ہے ۔۔۔۔ آپ کا جواب درست ہے (تالیاں) آپ کو مبارک ہو آپ نیپالی کلر ڈی وی سیٹ جیت گئے ۔ (تالیاں) جاتے ہوئے اپنی امانت ہل جل سے لے جائیے ۔

خواتین و حضرات اب باری ہے اپنے مرحلے کے مہمانوں کی ۔ اس سے پیشتر کہ ہم اپنے مجمعے کے دوستوں سے سوال پوچھیں ہال میں سے کوئی صاحب میرے پاس تشریف لائیں ۔۔۔۔ اچھا آپ ہی آجائیے ۔۔۔۔ آئیے آئیے ۔۔۔۔ آپ سے سوال ہے آپ

جہانگیر کے باپ کا نام بتایئے ..... جہانگیر کے باپ کا نام شاہجہان ......
جواب درست ہے۔ انگریزی محاورہ ہے چائلڈ از دی فادر آف دی مین اس حساب
سے جواب درست ہے۔ (تالیاں) مس نمونہ ان کی خدمت میں سو روپے کے پرائز بانڈز
جن کے نکلنے کا امکان نہ ہو پیش کیجئے۔ (تالیاں) آپ اپنی جگہ پر تشریف رکھیں ......
اب ایک خاتون میرے پاس تشریف لائیں اور اپنا پرس بھی ساتھ لیتی آئیں
...... جی ہاں آپ آجایئے۔ آیئے آیئے ڈریئے نہیں۔ آیئے اس طرف
...... ہاں تو خاتون ذرا پرس کھول کر دیکھیں اس میں فالودہ ہے ..... نہیں
ہے۔ افسوس۔ اگر ہوتا تو آپ کی خدمت میں بھی سو روپے کے پرائز بانڈز پیش کئے جاتے
اچھا آپ تشریف رکھیں شکریہ۔ اب اگر کسی خاتون کے پرس میں نئی یا پرانی اپنی
یا اپنے شوہر کی جرابیں ہوں تو وہ اپنی سیٹ پر کھڑی ہو کر پرس سے نکال کر اونچی کر کے
دکھا دیں ...... اچھا ایک خاتون ادھر ہیں زنانہ جرابیں لئے ہوئے اور دوسری خاتون
اُس طرف ہیں، مردانہ جرابیں لئے ہوئے واہ کیا مساوات ہے۔ آپ دونوں
کی خدمت میں پچاس روپے کے پرائز بانڈز۔ آپ تشریف رکھیں جاتے
ہوئے مس نمونہ سے لے جائیں ان بانڈز سے نئی جرابیں خرید لیں۔

اب ایسے مرحلے کے درست تیار ہو جائیں خاتون لیے مرحلے میں آپ آئی تھیں۔
جواب آپ دیں گی یا آپ کا ساتھی..... اچھا تو آپ کا ساتھی جواب دے گا تو ذرا مائیک
اپنے سامنے کر لیں آپ کے لئے نئی مشروب ابن الوقت بنانے والوں نے ایک ڈبہ بارہ
بوتلوں کا شربت روح فرسا بھیجا ہے۔ اس مشروب کی خاصیت یہ ہے کہ گرمیوں میں اس
کی تاثیر سرد اور سردیوں میں گرم ہے یہ تو ہوا آپ کا سولہ آنے۔ کیوں صاحب آپ کو اس
تحفہ سے خوشی نہیں ہوئی۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا کیجئے بشکریہ۔ کراچی لاہور
راولپنڈی ٹرانسپورٹ نے ہمارے ایسے مرحلے کے مہمانوں کے لئے ایک خوبصورت

نیا ماڈل اُس گدھا گاڑی بمع ایک پنکھ کے انعام میں دینے کے لئے بھیجی ہے وہ دیکھئے گدھا گاڑی دو سو ہارس پاور اور اُس کے ساتھ پنکھ بھی جگالی کرتا دیکھ لیجئے۔ نیلام گھر کی قیمت سترہ سوال۔ آپ گیارہ سوالوں کے جواب دیجئے اور چھ غلطیوں کی گنجائش۔ آپ اپنی خاتون ساتھی سے جو کچھ بھی وہ آپ کی ہیں مختصر مذاکرات کرکے جواب دے سکتے ہیں۔ مس بل بل ایسے مرحلہ کے سوال لائیے...... تو لیجئے صاحب پہلا سوال۔ داسکوڈی گاما اور گاماں پہلوان میں کیا رشتہ تھا...... کوئی رشتہ نہیں تھا داسکوڈی گاما کوڈی، یعنی کبڈی کا چیمپئن تھا اور گاماں رستم زماں تھا پہلوان تھا...... جواب درست ہے (تالیاں) دوسرا سوال۔ استنبول اور اسپغول میں کیا فرق ہے..... صاحب وقت ختم ہوگیا۔ آپ جواب نہ دے سکے۔ آپ کی ایک غلطی ہوگئی۔ ویسے میں یہ سوال ریزرو رکھتا ہوں آئندہ کے لئے۔ اچھا صاحب یہ فرمائیں یہ شعر کس کا ہے۔ نالب خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں روئیے زار زار کیا کیجئے ہائے ہائے کیوں شاعر کا نام بتائیے.... یہ شعر خستہ کا ہے...... نہیں صاحب...... تو پھر زار زار کا ہے...... نہیں صاحب ہرگز نہیں نہ خستہ کا نہ زار زار کا...... تو پھر ہائے ہائے کا ضرور ہے۔ (قہقہہ) اس طرح تو آپ شعر کے تمام الفاظ گن دیں گے آپ کا جواب بالکل غلط ہے۔ یہ شعر غالب کا ہے ایک غلطی اور ہوگئی۔ لیجئے یہ بہت ہی آسان سوال ہے اس سوال کے دو حصے ہیں۔ اگر آپ ایک حصے کا جواب دے دیں گے تو میں پورا درست مان لوں گا۔ آپ برصغیر کے اس حکمران کا نام بتائیے جو دو آدمیوں کو..... غور سے سنیے عورتوں کو نہیں دو آدمیوں کو بغلوں میں دبا کر آگرہ کے قلعہ کی دیوار پر دوڑا کرتا تھا۔ سوال کا دوسرا حصہ ہے اُسے کیا تکلیف تھی؟..... اس کا نام بابر تھا ظہیر الدین۔ اس کی بغلوں میں تکلیف تھی رشاہی طبیب نے یہ ورزش تجویز کی تھی جو اُس کی تکلیف کا واحد علاج تھا..... جواب بالکل درست ہے۔

(تالیاں) مس پل جل کتنے جواب درست ہیں اور کتنے غلط ...... دو درست اور دو غلط یعنی ففٹی ففٹی معاملہ ہے اچھا صاحب بتایئے برصغیر کی کس عمارت پر یہ شعر لکھا ہوا ہے۔ اگر فردوس بر روئے زمین است ۔ ہمیں است وہمیں است وہمیں است ...... یہ شعر غالباً شاہ نور سٹوڈیوز کی دیواروں پر لکھا ہوا ہے اور فردوس ایکٹرس کے متعلق ہے ...... جواب درست ہوا (تالیاں) ہاں صاحب فرمایئے فرہاد نے مس شیریں کے لئے جو نہر کھودی تھی اُس میں پانی زیادہ تھا یا دودھ؟ ...... دودھ زیادہ تھا۔ آج کل نہر کھودتا تو پانی زیادہ ہوتا بلکہ نرا پانی ہوتا' جواب بالکل درست ہے۔ (تالیاں) اچھا صاحب یہ فرمایئے وہ کونسی دو دھاتیں ہیں جن کو ہاتھ میں لیں تو وہ پگھلنے لگتی ہیں ...... ایک برف اور دوسری مکھن ...... جواب بالکل درست ہے۔ (تالیاں) آپ تو ساتھی سے بغیر مشورہ کئے جواب دے رہے ہیں۔ بندہ خدا اُن سے مشورہ تو کر لیا کیجئے۔ آپ کے اب پانچ سوال درست ہوئے چھ سوالوں کے اور جواب دے کر آسٹن گدھا گاڑی جیت جایئے تین غلطیوں کی گنجائش ہے ذرا سوچ کر جواب دیں۔ شاہجہاں کی ملکہ ممتاز محل کو مرنے کے بعد کہاں دفن کیا گیا تھا ...... آگرہ کے تاج محل میں ...... نہیں جناب مجھے افسوس ہے جواب غلط ہوا۔ اُسے قبر میں دفن کیا گیا تھا۔ تاج محل تو بہت بعد میں بنا تھا۔ اب آپ کی تین غلطیاں اور پانچ جواب درست ہیں۔ کوشش کیجئے آپ ماشا اللہ بہت ذہین نظر آ رہے ہیں۔ بتایئے انسان نے سب سے پہلے کن چیزوں کی کاشت کی تھی ...... دھوکا بازی بے ایمانی جھوٹ فریب وغیرہ وغیرہ کی۔ اور اب بھی کر رہا ہے۔ جواب بالکل درست ہے (تالیاں)

محمود غزنوی اور حضرت جوش ملیح آبادی میں ایک چیز مشترک ہے بتایئے کون سی؟ ...... ان دونوں کے سترہ حملے۔ محمود غزنوی نے ہندوستان

پر سترہ کامیاب حملے کئے اور حضرت جوش ملیح آبادی نے یادوں کی برات میں سترہ عشقیہ کامیاب حملے کئے ...... جواب درست ہے۔ (زوردار تالیاں) ....
سوال ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ خستہ حال سڑکیں ٹوٹی پھوٹی گلیاں کس ملک کی مشہور ہیں ...... یہ شرف اپنے ملک کو حاصل ہے ......
جواب سو فیصد درست ہے۔ (تالیاں) مس نورنہ کتنے سوال میرا مطلب ہے کتنے جواب درست ہیں اور کتنی غلطیوں کی گنجائش ہے ...... آٹھ سوال درست ہیں اور دو غلطیوں کی گنجائش ہے۔ لیجئے صاحب اب صرف تین سوالوں کے جواب دے کر آسٹن گدھا گاڑی میں بیٹھ کر گھر جائیے۔ اطمینان سے جواب دیجئے اگر کسی آدمی کا وزن زمین پر ۱۶۰ پونڈ ہو تو سورج پر اُس کا وزن کتنا ہو گا .... صرف پچاس پونڈ، روسٹ ہونے کے بعد ...... جواب بالکل درست ہے (تالیاں) اب آپ نے دو سوالوں کے جواب دینے ہیں اور دو غلطیوں کی گنجائش ہے میں آپ کی خدمت میں پندرہ ہزار کیش سکہ رائج الوقت اور ایک عدد پنج پیش کر سکتا ہوں اگر آپ آسٹن گدھا گاڑی کا خیال چھوڑ دیں۔ آپس میں مشورہ کر لیجئے دیکھئے خاتون تو منظور کرتی نظر آ رہی ہیں۔ اچھا آپ کو منظور نہیں سوچ لیجئے ...... اچھا تو پھر سوال پوچھوں ...... بتائیے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں پہلی گولی کس نے چلائی تھی ...... نہیں معلوم تو سن لیجئے۔ پہلی گولی بندوق نے چلائی تھی ...... درست ایک غلطی اور ہو گئی اب صرف ایک غلطی کی گنجائش ہے۔ میری پندرہ ہزار کی آفر اب بھی ہے ... نہیں منظور تو پھر سوال ہے پہلا وکٹوریہ کراس کس نے حاصل کیا تھا۔
...... خود ملکہ وکٹوریہ نے ...... جواب درست ہوا (تالیاں) اب ایک سوال اور ایک غلطی کی گنجائش ہے۔ دل کی دھڑکنوں کا کیا حال ہے تیز ہیں

...... اٹھارہ ہزار منظور ہے .... بالکل نہیں۔ تو پھر سوال ہے بتایئے جب ہوا باز پہلی بار چاند پر گئے تو انہوں نے کون سا گانا گایا تھا ..... گاڈ سیو دی کنگ ...... نہیں میرے دوست جواب غلط ہے۔ انہوں نے گایا تھا، "ہوا میں اڑتا جائے میرا لال دوپٹہ ململ کا اوجی اوجی"۔ اب میرے دوست غلطی کی گنجائش نہیں۔ ایک سوال کا جواب دیجئے میری تمنا ہے کہ آپ آسٹن گدھا گاڑی جیت جائیں۔ ذرا سکون سے سُنیں اور اطمینان سے جواب دیں ...... محمود غزنوی نے سب سے پہلے کس شاعر سے شاہنامہ لکھنے کے لئے کہا تھا آخری موقع ہے سوچ کر تسلّی سے جواب دیں .... سب سے پہلے حفیظ جالندہری سے لکھنے کو کہا تھا مگر ریٹ کم ہونے کی وجہ سے کنٹریکٹ نہ ہو سکا۔ پھر فردوس سے کہا اُس نے کہا میں فردوس ہوں فردوسی نہیں آخری میں فردوسی رحمٰن سے کہا اُس نے فوراً منظور کر لیا ..... جواب بالکل درست ہے۔ (گونجدار تالیاں) میرے معزز مہمان آسٹن گدھا گاڑی جیت گئے اور اُس کے ساتھ پنخ بھی ..... آپ دونوں کو مبارک ہو۔ میں آپ کی خدمت میں آسٹن گدھا گاڑی کا چابک، پیش کرتا ہوں (تالیاں) آپ اپنا پتہ مس ہل جل کو لکھوا دیجئے۔ ٹیلی ویژن والے آپ کو گاڑی کا ٹوکن اور رجسٹریشن گھر کے پتہ پر پوسٹ کر دیں گے۔ ڈرائیونگ لائسنس تو آپ کے پاس ہو گا۔ اور ہاں مشروب ابن الوقت روح فزا بھی اسی گاڑی میں لے جائیں۔ آج مجھے خوشی ہے کہ تینوں مرحلوں کے مہمان میرے نیلام گھر کو لوٹ کر لے گئے۔ صاحبو ہم تو آتے ہی لٹنے کو ہیں خواتین و حضرات پروگرام کا وقت ختم ہو رہا ہے۔ اگلے منگل تک کیلئے مس ہل جل مس مونہ اور تبارک تمیز کو اجازت دیجئے۔

آپ سب پاکستان کہیں میں اکیلا پائندہ باد کا نعرہ لگاتا ہوں۔

پڑ رہا ہے مگر مسکرانا

(۷۳ء میں لکھا گیا)

مجھے یونائیٹڈ کرسچین ہسپتال میں مجبوراً دو بار مریضوں کے ساتھ ٹھہرنے کا اتفاق ہوا۔ مجبوراً اس لئے کہ خوشی سے ہسپتال میں کون ٹھہرنا پسند کرے گا۔ ایک بار تو ۱۹۶۰ء میں جب "ہیڈ ماسٹر" کا اوپریشن ہوا تھا۔ اور دوسری بار ۱۹۶۳ء میں جب میرے چھوٹے بھائی کے بازو کا اوپریشن تھا۔ میں اپنے ہر مریض کے ساتھ تقریباً پندرہ پندرہ دن کے لئے اس ہسپتال میں ٹھہرا تھا۔ اور میں نے اس عرصے میں کئی باتوں کا بغور مطالعہ کیا اور کئی باتوں کو نوٹ کیا۔

ایک بات جو میں نے خاص طور پر محسوس کی وہ یہ کہ ہسپتال میں ایک معصوم اور مظلوم طبقہ نرسوں کا ہوتا ہے۔ اس طبقے کے متعلق عام طور پر غلط قسم کے خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے۔ نوجوان حضرات یہی سوچ سکتے ہیں کہ نرسیں زیادہ تر مریض کی دیکھ بھال کے پردے میں فلرٹ کرتی ہیں۔ وہ کس مجبوری سے یہ پیشہ اختیار کرتی ہیں۔ اس کا کسی کو علم نہیں ہوتا اور نہ کوئی جاننا چاہتا ہے۔ نرس بیچاری خود ہر ایک پر رحم بھی کرتی ہے۔ ترس کھاتی ہے خدمت کرتی ہے۔ مگر افسوس ہے کوئی اس پر نہ رحم کرتا ہے اور نہ ترس کھاتا ہے۔

نرس کو اردو زبان میں انیسہ کہتے ہیں۔ یہ لفظ با ترجمہ حیدرآباد دکن اکیڈمی کی

ایجاد ہے۔ نرس یا انیسہ ان دونوں لفظوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک غم خوار اور خدمت گذار ہستی ہے۔ دوسروں کی خدمت کرتی ہے۔ دوسروں کا غم بانٹتی ہے لیکن اپنا غم اپنے تک محدود رکھتی ہے۔ مجھے بہت سی نرسوں سے نیک نیتی سے بات چیت کرنے کا موقع ملا۔ اور مجھے بہت سی دکھ کی باتیں ان کے متعلق معلوم ہوئیں۔

نرس فوراً ہی نہیں بن جاتی۔ نرس بننے سے پہلے وہ پی ٹی ایس یعنی ابتدائی ٹرینگ سکول میں داخلہ لیتی ہے۔ اور اُس کو صرف ۲۰ روپیہ ماہوار وظیفہ ملتا ہے۔ اس کے بعد وہ فرسٹ ایئر میں داخلہ لیتی ہے تو اُس کا وظیفہ اٹھارہ روپیہ ماہوار ہو جاتا ہے یعنی وہ زرد ہے کی نیچے کی طرف ترقی ہوتی ہے۔ اور جب وہ سیکنڈ ایئر میں آتی ہے تو اُس کو چھبیس روپیہ ماہوار وظیفہ ملتا ہے۔ یعنی پونے پانچ سیر سیب کی قیمت حاصل کرتی ہے۔ اور تھرڈ ایئر میں اڑتیس روپیہ ماہوار وظیفہ ہوتا ہے۔ یعنی ایک ماہ میں اُنیس سیر ناخالص دودھ کی حقدار بنتی ہے۔ اور فورتھ ایئر میں وظیفہ اڑتالیس روپیہ ماہوار ملنا شروع ہو جاتا ہے۔ جس کا مطلب ہے صرف تین سیر خالص گھی خرید سکتی ہے۔ وہ بھی اگر کوئی خالص بھینس مل جائے تو۔ اتنے مرحلے طے کرنے کے بعد اور وظیفوں پر پل کر وہ سٹاف کہلاتی ہے اور اُس کی بنیادی تنخواہ صرف دو سو روپیہ ماہوار ہوتی ہے۔ اُسے کھانا لباس اور رہائش کے لئے جگہ دی جاتی ہے مگر مفت ہرگز نہیں تنخواہ میں سے کھانے، کپڑے اور رہائش کے پیسے کاٹ لئے جاتے ہیں۔ دراصل ہسپتال کے ناظم اعلیٰ اس انتظار میں ہیں کہ پہلے حکومت اپنے وعدے کے مطابق عوام کو روٹی کپڑا اور مکان مفت مہیا کر دے تو پھر اُس کے بعد وہ نرسوں کے لئے روٹی کپڑے اور رہائش کا مفت بندوبست کریں گے۔ وہ ڈرتے ہیں کہ اگر انہوں نے حکومت سے پہلے یہ سب چیزیں مفت مہیا کر دیں تو حکومت ناراض ہو جائے گی کہ تم اس کام

میں ہم سے سبقت لے جانے والے کون ہوتے ہو۔

ایک نرس نے کھانے کے متعلق بتایا کہ جو کھانا اُن کو دیا جاتا ہے اُس سے کہیں بہتر اور مزیدار کھانا مریضوں کے لئے ہوتا ہے۔ اِس لئے اکثر نرسیں اچھے کھانے کے شوق میں کبھی کبھی بیمار بن جاتی ہیں۔ کھانا پکانے والا خاص خیال رکھتا ہے کہ نمک زیادہ سے زیادہ ڈالا جائے تاکہ نمک کھا کر نرسوں کی وفاداری ہسپتال کے ساتھ رہے اگر نمک برابر کا ہو تو سالن میں پانی کے بہت زیادہ انجکشن دے دیئے جاتے ہیں اور صحت کے لحاظ سے سالن بہت کمزور اور رنگ کا زرد پڑ جاتا ہے۔

رہائش کے متعلق ایک نرس نے بتایا کہ ایک کمرے میں دو دو نرسیں رکھی جاتی ہیں۔ تاکہ اپنے آپ کو بالکل اکیلا محسوس نہ کریں۔ کوئی اور تو ان کا دکھ درد بانٹتا نہیں اپنا دکھ درد آپس میں بانٹتی رہیں۔ دو سو روپیہ ماہوار میں بڑے افراط کے ساتھ صرف دکھ درد ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ خوشی تو حاصل نہیں کی جا سکتی یا دو سو روپیہ میں زیادہ سے زیادہ چار ڈبے ڈالڈے کے خریدے جا سکتے ہیں اور وہ بھی راشن کارڈ پر کئی گھنٹے لائن میں کھڑے ہو کر انگنت دھکے کھانے کے بعد۔

حیرت ہے کہ جب ہسپتال والے مریضوں سے حد سے زیادہ فیس وصول کرتے ہیں۔ پچپن اور پچہتر روپیہ روزانہ کے حساب سے ایک ایک کمرے کا کرایہ لیتے ہیں۔ یعنی مریض اور اُس کے لواحقین کی خوب کھال اتارتے ہیں تو اس کھال میں تھوڑا سا حصہ نرسوں کے لئے کیوں نہیں رکھتے۔ بل تو اس طرح نچوڑتے ہیں جیسے اُو گروپ کا خون ہسپتال کی بوتل میں نچوڑا جاتا ہے۔ کاش اس خون کے چند قطرے نرسوں کے لئے بھی رکھ لیا کریں اُن میں بھی تو خون کی کمی ہوتی ہے۔ جو پوری کرنی چاہیئے افسوس ہے کہ تمام خون اہلِ ہسپتال اپنے استعمال میں لے آتے ہیں۔

ایک اور نرس نے آہ بھر کر کہا: اگر ہمیں گورنمنٹ سکیل ہی دے دیئے جائیں

تو بہت غنیمت ہے۔ مر پیٹ کر گزارہ کریں"۔

جب میں نے پوچھا کہ" عوامی حکومت نے جو تیس پینتیس روپیہ ماہوار کا اضافہ کیا ہے۔ وہ تو آپ کو باقاعدہ مل رہا ہوگا"۔

پہلی آہ سے بھی زیادہ لمبی آہ بھر کر کہنے لگی"۔ اگر زندہ رہے تو ضرور کبھی نہ کبھی مل جائے گا"۔

ایک بہت دبلی پتلی نرس جو نرس کی بجائے نرس کا ایکس رے نظر آرہی تھی۔ میں نے اُس سے پوچھا"۔ آپ لوگوں کے متعلق عام شکایت ہے کہ آپ بڑی بدمزاج ہوتی ہیں، سیدھے منہ بات نہیں کرتیں۔ کیا یہ سچ ہے"۔

وہ کہنے لگی"۔ ہمیں شروع دن سے ہی مریضوں سے خاص طور پہ برتاؤ کرنے کی تربیت دی جاتی ہے۔ ان سے نرمی سے پیش آئیں۔ مسکرا کر بات کریں۔ اگر مسکرا نہ سکیں تو مسکرانے والی شکل ضرور بنائیں۔ ان کی دلجوئی کریں، سو وہ ہم کرتی ہیں۔ لیکن ایک بات ہمارے لئے ناقابلِ برداشت ہو جاتی ہے۔ وہ ہے مریض کے عزیزوں اور رشتہ داروں کا ہم سے ناروا برتاؤ۔ ناروا سلوک۔ مریض تو قدرتی طور پر بیماری کی وجہ سے چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ لیکن مریض کے رشتہ دار بغیر کسی بیماری کے چڑچڑے ہو جاتے ہیں۔ ہمیں تو یہ تربیت دی جاتی ہے کہ مریضوں سے کس طرح پیش آنا چاہیئے۔ ان کے غصے کو کس طرح برداشت کرنا چاہیئے۔ ان کو کس طرح تسلی دینی چاہیئے۔ اُن کی کس طرح نرسنگ کرنی چاہیئے۔ ہمیں یہ تربیت نہیں دی جاتی کہ مریض کے رشتہ داروں کے ناجائز غصے کو کس طرح برداشت کرنا چاہیئے۔ جب مریض کے رشتہ دار اُس کو کسی پرائیویٹ کمرے میں لاتے ہیں۔ تو کچھ اس طرح محسوس کرتے ہیں۔ جیسے انہوں نے تمام ہسپتال خرید لیا ہو یا بک کرا لیا ہو۔ اور تمام نرسیں اور ہسپتال کا دوسرا سٹاف ان کا ذاتی ملازم ہو"۔

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ میں نے خود ایک بار ایک نرسنگ سٹیشن کے باہر ایک رشتہ دار کو بےچاری نرس پر غصہ اتارتے دیکھا تھا۔ وہ غصے سے کہہ رہے تھے۔ "کہاں ٹریننگ لی ہے یہ بھی تمہیں معلوم نہیں کہ ٹکنک کہاں ہے صبح سے فلش خراب ہے اور کوئی بندوبست نہیں"۔

نرس نے نرمی سے جواب دیا "جناب رپورٹ لکھ کر چپڑاسی کے ہاتھ متعلقہ دفتر کو بھیج دی ہے۔ ٹکنک سب اُس دفتر کے ماتحت ہیں۔ وہ بھیجیں گے"۔

رشتے دار غصے سے بولے "ہم نہیں جانتے جلدی بندوبست کرو۔ پچھتر روپیہ روزانہ کمرے کا کرایہ دیتے ہیں۔ اور فلش بھی ٹھیک نہیں"۔

وہی دبلی پتلی نرس پھر تقریر کرنے لگی "ہم مریضوں کی کسی بات کا بُرا نہیں مانتے مگر اُن کے رشتہ داروں کی باتوں پر سخت غصہ آتا ہے۔ طبیعت جل جاتی ہے۔ آخر ہم بھی انسان ہیں"۔ میں نے غور سے دیکھا تو شکل و صورت سے واقعی انسان نظر آ رہی تھی۔ وہ پھر کہنے لگی اب آپ اس کو بدمزاجی کہہ لیں۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ رشتہ دار ہسپتال میں نہ آئیں اگر آنا بہت ضروری ہے تو بخوشی آئیں۔ مگر بطور مریض کے آئیں۔ پھر ہم ان کا غصہ برداشت کر لیں گے۔

صاف ظاہر ہے کہ جب کبھی کوئی مریض تندرست ہو کر ہسپتال سے جاتا ہے تو ان کو اطمینان ہوتا ہے۔ اور اس سے زیادہ خوشی اس بات کی ہوتی ہے کہ اب اُس کے رشتہ دار بھی اُس کے ساتھ چلے گئے۔ اگر کوئی مریض اتفاقاً اللہ تعالےٰ کو پیارا ہو جائے تو اُن کو سخت رنج ہوتا ہے۔ ایک ایسا واقعہ میں نے خود ۱۹۷۰ء میں نوٹ کیا تھا کہ ایک مریض کے انتقال پر نرسوں نے اُس دن کھانا نہیں کھایا تھا۔ شام کی چائے پی یا نہیں پی۔ اس کا مجھے علم نہیں۔

نرس میں ایک خوبی یہ ہے کہ خود بخود اپنی مرضی سے کوئی بات کرتی ہے

اور نہ کوئی کام کرتی ہے۔ وہ وہی بات اور وہی کام کرتی ہے جو مریض کے چارٹ پر لکھا ہو۔ یا جس کے متعلق ڈاکٹر نے ہدایت دی ہو۔ اگر مریض کسی چیز کے کھانے کی خواہش کرے تو وہ کہہ دیتی ہے۔ میں ڈاکٹر صاحب سے پوچھ لوں پھر جواب دوں گی۔ اپنی طرف سے اُسے کوئی اختیار نہیں ہے کہ اگر مریض پورضا و رغبت خوشی سے مرنے کی خواہش کرے تو وہ اُسے روک دیتی ہے۔ ہرگز اجازت نہیں دیتی وہ کہہ دے گی۔ ذرا صبر کیجئے میں ڈاکٹر صاحب سے پوچھ لوں اگر وہ اجازت دے دیں تو یہ شوق بھی پورا کر لیجئے۔

نرس کی ڈیوٹی بہت سخت ہوتی ہے۔ اُسے ہر وارڈ میں کام کرنا پڑتا ہے جنرل وارڈ میں۔ پرائیویٹ وارڈ میں۔ کانسٹنٹ کیئر روم میں۔ اوپریشن روم میں ریکوری روم میں اور اگر ہسپتال میں ٹفن روم ہو تو اس میں بھی اس کی دن کو بھی ڈیوٹی لگتی ہے اور رات کو بھی۔ وہ صرف دو سو روپیہ ماہوار میں دن رات کام کرتی ہے۔

نرس میں ایک خاص بات یہ ہے کہ وہ تمام عمر نرس ہی رہتی ہے اگر وہ ترقی کرے تب بھی نرس اور اگر ترقی نہ کرے تب بھی نرس۔ اُس کے کام کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ مریضوں کے غصے کو برداشت کرنا۔ نرمی سے جواب دینا۔ ان کو تسلی دینا اور زبردستی ہونٹوں پر مسکراہٹ پیدا کرنا اُس کی عادت بن جاتی ہے۔

جس نرس سے بھی میں نے بات کی اُس نے اپنی کوئی نہ کوئی مشکل یا تکلیف بیان کی۔ صرف دو نرسیں ایسی ملیں جنہوں نے ہر بات پر اطمینان کا اظہار کیا اور بتایا کہ وہ بہت خوش ہیں۔ انہیں کوئی تکلیف یا مشکل درپیش نہیں۔ وہ اسی تنخواہ میں خوش ہیں۔ انہیں کھانا عمدہ ملتا ہے۔ لباس بھی نفیس ہے اور رہائش کے بندوبست سے بھی خوش ہیں۔ اپنی ڈیوٹی کو بہت ہلکا اور دلچسپ

تصور کرتی ہیں۔ مریضوں سے بھی خوش رہتی ہیں۔ اور ان کے رشتہ داروں کے ناروا رویے کو بھی بخوشی برداشت کرتی ہیں۔ مریض کے تندرست ہوکر چلے جانے پر بھی ان کو بہت خوشی ہوتی ہے۔ لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ مریض کے آخری سانس لینے کے بعد انہیں رنج ہوتا ہے یا دکھ اور محسوس کرتی ہیں۔ ان میں سے ایک نے مجھے اپنا نام سارہ سام بتایا۔ اُسے سٹاف کا درجہ حاصل ہے اور دوسری نے اپنا نام ربیکہ بتایا مجھے یقین ہے کہ سٹاف سارہ سام اور نرس ربیکہ نے جو کچھ کہا سچ کہا۔ کھانے میں تیز نمک کے زیر اثر بات نہیں کی۔ یہ میں نے خود دیکھا کہ وہ دونوں واقعی محنت لگن اور اس ملک میں ایمانداری سے اپنے فرائض انجام دیتی ہیں۔ باقی تمام نرسیں جنہوں نے اپنی مشکلات یا تکلیفیں بیان کیں۔ وہ اپنا نام گول کر گئیں۔ انہوں نے اپنا جینڈر نام تک نہ بتایا۔

سٹاف کے بعد سسٹر کا درجہ ہوتا ہے۔ سسٹر کا ترجمہ ابھی تک نہیں ہوسکا نرس کو توانیسہ کہتے ہیں۔ اب سسٹر کو کیا کہا جاتے۔ اگر اس کو ہمشیرہ کا خطاب دیا جائے تو یہ مناسب نہیں۔ ہمشیرہ اُس کو کہتے ہیں جس نے ساتھ دودھ پیا ہو میرے خیال میں سسٹر کو ہمشیرہ شاید اس لئے بھی نہیں کہتے کہ کہیں باقی کا سارا دودھ بھی نہ پی جائے۔ افواہ ہے کہ سسٹر کی تنخواہ معقول ہوتی ہے۔ سسٹر سے بڑی میٹرن ہوتی ہے اور وہ بہت بڑی اور بہت اونچی ہوتی ہے۔

اس بات کا بھی مجھے یہاں آکر علم ہوا کہ نرسوں کا زیادہ تر تعلق ضلع سیالکوٹ سے ہوتا ہے۔ سیالکوٹ میں صرف کھیل کا سامان ہی نہیں بنتا اور دساور کو بھیجا جاتا بلکہ نرسیں بھی دساور کو بھیجی جاتی ہیں۔

میں نے ہسپتال میں نرسوں کے سلسلے میں جو کچھ دیکھا یا مختلف نرسوں سے معلوم کیا ایمانداری کے ساتھ بتا دیا ہے۔ کیونکہ نرسیں ہر ہسپتال میں ایک جیسی ہوتی ہیں۔ ان

کی پرابلم بھی ایک جیسی ہوتی ہیں۔ اس لئے مجھے یقین ہے کہ امریکن ہسپتال اور دوسرے ہسپتالوں کے حاکم اعلیٰ نرسوں کی تکلیفوں اور مشکلات کو رفع کرنے کی کوشش ہی نہیں کریں گے بلکہ ان کے لئے مزید سہولتوں کا بھی بندوبست کریں گے۔

ہمیں یہ ہرگز نہیں بھولنا چاہیئے کہ نرسیں ہسپتال کی روح رواں ہیں۔ نرسیں ہسپتال کا لازمی جزو ہیں کوئی سپیئر پارٹس نہیں۔ ان کے بغیر ہسپتال بالکل نامکمل ہوتا ہے۔ یہ یاد رکھیے گا کہ جس ہسپتال میں۔

ع نرس نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے

اگلے وقتوں کے باکمال لوگ

اگلے وقتوں کے باکمال لوگوں کے حالات اور کمالات سُن کر اور کتابوں میں پڑھ کر انسان عش عش کر اٹھتا ہے بعض اوقات یہ عش عش ایسی ناقابل یقین اور حیران کن ہوتی ہے کہ غش غش کی نوبت آجاتی ہے۔ انڈو پاکستان میں بہت سے اہل کمال لوگ گذرے ہیں جنہوں نے طاقت، شہزوری، تیر اندازی، نشانہ بازی، موسیقی، پیراکی، خیاطی، کتابت طب، بٹیر بازی، پتنگ بازی، تلوار، بنوٹ اور طرح طرح کے کھانے ایجاد کرنے میں نام پیدا کیا۔ خاص کر اودھ کے نوابوں کے دور اقتدار میں ان تمام فنون نے بے حد ترقی کی۔ اور بے مثال اہل کمال پیدا ہوئے۔ قانونِ قدرت کچھ اس انداز کا نکلا کہ جتنا جتنا یہ اہل فن کمال حاصل کرتے جاتے تھے۔ اتنا ہی اودھ کے نوابوں کو زوال آتا جاتا تھا مثل مشہور ہے کہ "ہر کمالے را زوالے"۔ لیکن یہاں پر کمال کسی اور کو حاصل ہوتا اور زوال کسی اور کو۔ اودھ کے نواب بادشاہ کہلاتے تھے اور جب کسی اہل فن کے کمال سے خوش ہوتے تھے تو اس کو فوراً مفت میں ایک خطاب عطا کر دیتے تھے اگر کوئی کسی دعوت یا محفل کا عمدہ بندوبست کرتا تھا تو خطاب عطا ہوتا تھا انتظام الدولہ بہادر یہ اور اگر کسی نے ستار رب بجایا تو مضراب الدولہ بہادر کے خطاب سے نوازا جاتا۔ اگر باغبان نے اچھے پھل پھول لگائے تو وہ گلشن الدولہ بنا دیا جاتا تھا۔ اور اکثر

خطاب کچھ اس قسم کے ہوتے تھے۔ وزیر السلطان، ارسطو خصلت، مونس الدولہ، ریحان الدولہ بخشی الملک، سفیر الدولہ، وغیرہ وغیرہ۔ اور جب بادشاہ عورتوں سے خوش ہوتے تھے تو خطاب عطا کرنے کے ساتھ ہی اسے محل بھی بنا لیتے تھے، اگر بہشتن پسند آ گئی تو نواب آب رساں بیگم کا خطاب پاتی تھی۔ بھنگن نواب مصفا بیگم مالن نواب مولسری بیگم دھوبن نواب استری بیگم۔ گائیکہ نواب سریلی بیگم یا نواب پنچم بیگم کا خطاب حاصل کرتی تھی۔ یہاں پر اودھ کے صرف چند اہل کمال کا ذکر کیا جاتا ہے۔ اس ذکر کا مقصد آپ کو عش عش کرانے کا ہے۔ اگر آپ عش عش نہ بھی کریں تو ان کے کمال میں کوئی کمی نہیں آتی۔

رستم نواز حیدر اپنے وقت کے نہایت طاقتور اور شہزور انسان تھے شاعری کا بھی شوق تھا۔ چونکہ نواب صاحب میں کتابوں کی فیکٹری تھی طاقت کا یہ عالم تھا کہ چونی کو آہستہ سے مسل کر اتنا پھیلا دیتے تھے کہ اٹھنی بن جاتی تھی۔ اور اٹھنی کو کناروں سے اس طرح دباتے تھے کہ سکڑ کر چونی بن جاتی تھی۔ ترانوے سال کی عمر پائی تمام عمر چونی کی اٹھنی اور اٹھنی کی چونی بناتے رہے۔

نواب فیل بہادر خان اصل نام مرزا منجو تھا۔ لیکن طاقت میں ہاتھی سے بڑھ کر تھے اس لئے بادشاہ نے فیل بہادر خان نام رکھا۔ ایک شام سیر کے لئے بادشاہ کی سواری کے ساتھ جا رہے تھے کہ سامنے سے مست ہاتھی جھومتا آ رہا تھا۔ ہاتھی کو دیکھ کر بھگدڑ مچ گئی۔ بادشاہ کے ساتھ جو مصاحب تھے سب گھبرا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ بادشاہ کی جان بچانے کی بجائے اپنی جان بچانے کی فکر کرنے لگے۔ بادشاہ کو ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ مگر مرزا منجو بے فکر کھڑے تھے۔ ہاتھی جب سواری کے قریب آیا تو فیل بہادر خان نے لپک کر ہاتھی کی دم پکڑ کر ایسا گیئر بدلا کہ ہاتھی ڈیڈ سٹاپ ہو گیا۔ اور پھر دم کو ہلکا سا جھٹکا دے کر ہاتھی کو دس پندرہ گز پیچھے کھینچ لیا بائیں طرف

دم مروڑ دی اور ہاتھی دائیں طرف گر گیا۔ ہاتھی جب کبھی ان کو دیکھتا تھا تو فوراً دُم کو ٹانگوں میں دبا لیتا تھا کہ کہیں پھر ولیا ہی سلوک نہ کریں۔ بادشاہ نے خوش ہو کر ان کو ہودہ نواز جنگ کا خطاب اور خلعت عطا کی۔

مرزا جان دھان پان دبلے پتلے انسان تھے۔ لیکن نہایت قوی اور طاقت ور ہر وقت منہ میں پان ہوتا تھا اور پان میں کیا ہوتا تھا یہ معلوم نہیں۔ دبلے پتلے ہونے کے باوجود ان کا وزن گھوڑے سے زیادہ تھا اکثر گھوڑے ان کا وزن برداشت نہ کر سکتے تھے۔ جس گھوڑے پر سوار ہوتے وہ بیٹھ جاتا تھا۔ اس کا پیٹ زمین سے لگ جاتا تھا۔ ان کو دیکھتے ہی تمام گھوڑے زمین پر بیٹھ جاتے تھے کہ کہیں ان پر سوار نہ ہو جائیں۔ بائیں ہاتھ کے انگوٹھے اور چھوٹی انگلی سے گھوڑے کی دم پکڑ لیتے تھے اور گھوڑا ہل نہ سکتا تھا۔ گھوڑے کے ماتھے پر چٹکی لیتے تھے تو گھوڑے کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔ ان آنسوؤں کو بوتل میں بھر کر محفوظ کر لیتے تھے۔ کہتے تھے بے وفائی کی بیماری کے لئے اکسیر ہے۔ اکثر عشاق ان سے چند قطرے اپنی محبوبہ کے لئے لے جاتے تھے بادشاہ نے جب ان کی طاقت کے قصے سنے تو ان کو خچر الملک کا خطاب عطا کیا۔ مگر جب اپنی آنکھوں سے ان کی طاقت اور قوت کا مظاہرہ دیکھا تو ترقی دے کر اسپ الملک بہادر کا خطاب عطا کیا۔

ضیغم نوشہ مسکین دل کے شیر تھے اور شکل و صورت سے گربہ مسکین نظر آتے تھے شیر سے لڑتے تھے اور اسکو شکست دیتے تھے۔ ایک بار گورنر بہادر ادھر تشریف لائے۔ بادشاہ نے گورنر بہادر کو طرح طرح کے کمالات دکھانے کا بندوبست کیا۔ ایک کمال ضیغم نوشہ سے شیر کی لڑائی کا تھا۔ شاہی شیر گو بوڑھا تھا مگر پھر بھی شیر تھا۔ لیکن ضیغم نوشہ ببر شیر نظر آتا تھا۔ جب دونوں میں لڑائی شروع ہوئی تو دیکھا یہ گیا۔ کہ شیر ضیغم نوشہ پر حملہ کرنے کی بجائے غلط سمت کی طرف جاتا

تھا۔ لوگ شیر کی اس حرکت پر حیران ہو رہے تھے۔ معاً شیر کے پاسبان کو خیال آیا کہ شیر کی نظر کمزور ہے اس لئے ٹھیک طور پر نہیں دیکھ رہا۔ وہ دوڑ کر شیر کے پنجرے میں گیا اور اس کی عینک اٹھا لایا عینک لگانے کے بعد شیر پروفیسروں کی طرح اکڑ کر کھڑا ہو گیا اور کسی ریاست کی یونیورسٹی کا وائس چانسلر نظر آنے لگا۔ اس کے بعد وہ معرکے ہوئے کہ الا مان۔ کبھی شیر اوپر اور ضیغم نوشہ نیچے اور کبھی ضیغم نوشہ اوپر اور شیر نیچے۔ اور کبھی دونوں برابر لیٹے ہوئے ہوتے تھے۔ یہ جنگ ایک گھنٹہ کے قریب جاری رہی ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے نورا کشتی ہو رہی ہو۔ آخر ضیغم نوشہ مسکین نے شیر کے منہ میں ہاتھ ڈال کر اس زور کا جھٹکا دیا کہ شیر کے اوپر اور نیچے کے دانت مسوڑوں سمیت باہر آ گرے اور عینک تیس گز کے فاصلے پر جا گری۔ واہ وا کا شور اٹھا۔ گورنر بہادر طاقت کا مظاہرہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ضیغم نوشہ کو بلا کر "ویل ڈن" کہا بادشاہ نے انعام و اکرام اور گیدڑ کی کھال کی خلعت سے نوازا۔ گورنر بہادر نے شیر کے دانت دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ جب بادشاہ نے شیر کے دانت سونے کی پلیٹ میں رکھ کر گورنر بہادر کے سامنے پیش کئے۔ تو گورنر بہادر نے دانتوں کی بے حد تعریف کی کہ بہت خوبصورت دانت ہیں اور پھر دانتوں کو ہاتھ میں لے کر الٹ پلٹ کر غور سے دیکھ کر فرمایا: "بہت اعلیٰ قسم کا ڈینچر ہے۔ اور انگلش فرم کا بنا ہوا ہے۔"

<u>مرزا قوت نواز بہادر</u> بانکوں اور خواجہ سراؤں کی بٹالین کے کپتان تھے۔ بے پناہ طاقت کے مالک تھے۔ ایک بار بازار میں جلیبیاں خریدنے جا رہے تھے کہ مست بیل چھوٹ گیا۔ لوگوں نے روکا کہ آگے نہ جایئے۔ مست بیل ہے۔ کہنے لگے "ہم سے زیادہ مست کیا ہو گا؟" بیل ان کی طرف جھپٹ کر آیا۔ انہوں نے بائیں ہاتھ سے سینگ پکڑ کر روک لیا اور دائیں ہاتھ سے تلوار سینگ پر ماری۔ سینگ کٹ کر ان کے ہاتھ میں آ گیا۔ تلوار دو ٹکڑے ہو کر دور جا گری بیل ان کو دیکھ کر مسکرایا۔ یہ بیل کو

دیکھ کر مسکرائے۔ بیل مڑ کر واپس جانے لگا تو فرمایا: کوئی بات نہیں برخوردار۔ اس بار حساب برابر رہا پھر کبھی سہی۔ بیل نے کہا ٹھیک ہے۔ مرزا صاحب یا زندہ صحبت باقی؟

نواب سکندر جنگ بہادر

بادشاہ ان کے بھتیجہ تھے۔ اور یہ بادشاہ کے چچا۔ ان کو بندوق کی گولی کا نشانہ لگانے میں کمال حاصل تھا۔ دس گز کے فاصلے پر دو موم بتیاں رکھ دی جاتی تھیں۔ ایک موم بتی جل رہی ہوتی تھی اور دوسری بجھی ہوئی۔ نواب صاحب اس طرح سے ترچھا نشانہ باندھ کر گولی چلاتے تھے کہ جلتی ہوئی موم بتی بجھ جاتی تھی۔ اور بجھی ہوئی جل اٹھتی تھی۔ اکثر محل کی موم بتیاں گولیوں سے جلاتے بجھاتے رہتے تھے۔ نواب صاحب شیر کا شکار بڑی آسانی سے کرتے تھے۔ نشانے کا یہ عالم تھا کہ ایسے زاویئے سے شیر کے ماتھے پر گولی مارتے تھے۔ کہ سیدھی جسم میں سے ہوتی ہوئی دم کی نوک میں سے نکل جاتی تھی۔ شیر چند منٹ تو حیرت سے دیکھتا رہتا تھا۔ کہ کیا چیز کہاں لگی اور کہاں سے نکل گئی۔ اور پھر دھم سے گر پڑتا تھا۔ اس کا اچانک ہارٹ فیل ہو جاتا تھا۔ نشانہ لگانے میں کمال یہاں تک حاصل کیا تھا۔ کہ بیس بیس پیسوں کی دونوں طرف قطار کھڑی کر دیتے تھے۔ اور بیچ میں ایک اٹھنی کھڑی کرتے تھے۔ ایسا نشانہ لگاتے تھے۔ کہ پیسے کھڑے رہتے تھے اور اٹھنی بیچ میں سے نکل جاتی تھی۔ اور کبھی ایسا نشانہ لگاتے تھے۔ کہ اٹھنی کھڑی رہتی تھی۔ اور پیسوں کی دونوں قطاریں آگے کو چل دیتی تھیں۔ ایک سو تین سال کی عمر پائی آخری دم تک گولیاں چلاتے رہے اور بتیاں بجھاتے رہے

مہاراجہ ڈونگر سنگھ

بہت بڑے تعلق دار تھے۔ نواب سکندر جنگ بہادر کے مقابلے میں گولی چلاتے تھے۔ فرق صرف اتنا تھا کہ صرف پستول کا نشانہ لگانے میں کمال تھے۔ اندھیرے میں گدھے کی سانس کی آواز پر اس کے بائیں سینگ کا نشانہ لگا کر سینگ اڑا دیتے تھے۔ شیشے کے نیچے پھول رکھ کر ایسی خوبی سے گولی چلاتے تھے کہ شیشہ ریزہ ریزہ ہو جاتا تھا۔ اور پھول کی پنکھڑی تک سلامت رہتی تھی بعض اوقات پھول کی ایک ایک پنکھڑی الگ ہو جاتی تھی اور شیشہ سلامت رہتا تھا بعض اوقات دونوں

سلامت رہتے تھے اور گولی کے چھرے انار کی طرح پھوٹ نکلتے تھے۔ اکثر ایسا بھی ہوا کہ دونوں شیشہ اور پھول غائب ہو جاتے تھے۔ خوبی یہ تھی۔ نشانے سے پہلے بتا دیتے تھے کہ ایسا ہوگا اور واقعی یک فیصد ایسا ہی ہوتا تھا۔ جیسا اعلان کر دیتے تھے بادشاہ نے ان کے نشانے سے مرعوب ہو کر پستول الدولہ کا خطاب دیا تھا۔ ایک ماہ بعد ریوالور نواز جنگ بہادر بنا دیا۔

نواب پورس الدولہ بہادر

بادشاہ کے قریب ترین ماموں تھے۔ تیر اندازی میں آپ کا مقابلہ کرنے کی کسی میں ہمت نہ تھی۔ اگر کوئی ہمت کرتا تھا تو تیر مار کر اس کی ہمت توڑ دیتے تھے۔ ان کا نشانہ کبھی خطا نہ جاتا تھا تیر بے شک خطا چلا جائے۔ کمال یہ تھا کہ مکھی میں سے تیر آر پار کر دیتے تھے مکھی میں سے تیر کس طرح آر پار کرتے تھے۔ اس کا نہ مکھی کو پتہ تھا نہ تیر کو اور نہ ہی ان کو خود علم تھا لاکھوں کے حساب سے تیر آر پار کر کے مکھیوں میں سوراخ ڈال دیئے۔ صرف تیس سال کی عمر پائی اور مکھیاں مارتے مارتے انتقال کیا وفات کے بعد بادشاہ نے تیس مار خان مرحوم کا خطاب عطا کیا۔ کسی استاد نے کیا خوب ان کی تاریخ وفات کہی۔ شاہ مگس مُرد۔ جبرے کے حساب سے جمع تفریق کر کے ضرب دی جائے تو تاریخ وفات ۱۸۵۳ء نکلتی ہے جو دو سال کم ہے۔

استاد فجو عمر دراز

اصل نام فضل دین عمر دراز تھا۔ لوگوں نے پیار میں آ کر فجو کہنا شروع کر دیا۔ شاعری کا بھی شوق تھا۔ بانک کے مانے ہوئے استاد تھے۔ تمام شہزادے اور شہزادیوں کو بانک کی ٹریننگ دیتے تھے۔ انکا دعوٰے تھا کہ بٹیر کو پلنگ کے نیچے چھوڑ دو اور کیا مجال ہے کہ باہر نکل سکے۔ ان کے ہاں جتنے بٹیر تھے پلنگ کے نیچے آرام کیا کرتے تھے۔

نواب دست پناہ محل

بادشاہ کی آٹھویں بیگم تھیں۔ دست پناہ اس طرح بجاتی تھیں جیسے جاپانی ستار بجتی ہے۔ اس لئے دربار شاہی سے

نواب دست پناہ محل کا خطاب ملا تھا۔ بندوق کا نشانہ لگانے میں بے مثل تھیں
بھری ہوئی صندل کے شربت کی بوتل بغیر کاک کے تالاب میں پھینکوا دیتی تھیں۔
جب بوتل ڈوب جاتی تو تہ میں ایسا نشانہ لگاتی تھیں کہ بوتل اچھل کر تالاب سے
باہر آکھڑی ہوتی تھی اور شربت کا ایک قطرہ تک ضائع نہ ہوتا تھا۔

میر گھمن رسوا اپنی طرز کے واحد بانکے تھے۔ اور بنوٹ میں کمال حاصل کیا تھا
بادشاہ جب سیر کو نکلتے تو یہ ضرور ساتھ ہوتے۔ ایک دفعہ بادشاہ
کے ساتھ سیر کے لئے جا رہے تھے۔ کہ اچانک راستے میں بارش آگئی۔ میر گھمن نے
بادشاہ کے سر پر بنوٹ کے ایسے ہاتھ دکھائے ایک بوند بھی بادشاہ پر نہ گری اور دھوپ
کے وقت بادشاہ پر بنوٹ سے سایہ کر دیتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بنوٹ کا کرتب
نہیں بلکہ بادشاہ پر چھاتا تانا ہوا ہے۔ ان میں ایک خوبی یہ بھی تھی۔ کہ رومال کے ایک
کونے میں کھوٹا پیسہ باندھ کر ایسا ہاتھ چلاتے تھے کہ تلوار کا وار روک لیتے تھے۔ پیسہ
تلوار سے اس طرح ٹکراتا تھا۔ کہ جیسے دو تلواریں آپس میں ٹکرا رہی ہوں۔ اکثر رومال
مار کر تلوار چھین بھی لیتے تھے۔ ایک دفعہ تلوار چھینتے ہوئے پیسہ اپنے ہی سر پر آ لگا۔ اور
وہیں جان دے دی۔ چالیس سال کی عمر پائی تمام عمر پیسے کے ساتھ لڑتے رہے۔ اور
آخر پیسے کی وجہ سے جان دے دی۔

میر مخچو شتر جنگ بہادر شاہی دربار میں پیغام رسانی کے سربراہ تھے۔ دور
دراز پیغام بھجوانا ہوتا تو بادشاہ ان کو بھیجتے تھے۔ بہت
تیز رفتار تھے۔ ایک دن میں ۱۵۰ انگریزی میل آنا اور ۱۵۰ میل جانا ان کے لئے
معمولی بات تھی۔ ٹانگوں میں بہت طاقت پاور تھی۔ اکثر چلتے ہوئے ٹانگیں
باقی جسم سے آگے نکل جاتی تھیں۔ اسی بنا پر شاہی سے شتر جنگ بہادر
کا خطاب ملا تھا۔

شہزادہ گلبرگ نواز جنگ بہادر بادشاہ کی پچیسویں محل نواب معتفا بیگم میں سے تھے۔ انہوں نے کئی قسم کے عطر ایجاد کئے۔ عطر نو بہار جھاڑ وں کے تنکوں میں سے نکالا۔ یہ عطر بیگمات کو بے حد پسند تھا۔

بیگم نیرّہ الانور عہد واحدی کی تھیں۔ رنگت نام کے بالکل برعکس تھی۔ ان کا لباس اکثر پسینے سے سیاہ ہوجاتا تھا۔ بیگمات سفید کپڑوں کو سیاہ رنگ کرانے کے لئے ان کو دے دیتی تھیں۔ بیگم الانور سفید کپڑے پہن کر تھوڑی دیر کے لئے آگ کے آگے یا دھوپ میں بیٹھ جاتی تھیں۔ ان کے چھ جوان لڑکے پہلوان تھے۔ پہلوانی ان کا مشغلہ اور پیشہ تھا۔ خود بھی طاقت ور اور نڈر تھیں۔ ایک رات گھر میں چور آگیا انہوں نے دیکھ لیا اسے للکارا۔ وہ دیوار پھاندنے لگا۔ انہوں نے پیچھے سے پاجامے کا پائنچہ پکڑ لیا اور اس طریقے سے زور کا جھٹکا دیا کہ دوسرا پائنچہ خود بخود اتر گیا۔ وہ پاجامہ چھوڑ کر بھاگ گیا۔ یہ کہنے لگیں "بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی"۔ اس دن سے یہ محاورہ بن گیا۔ اور چور شرم کی وجہ سے نزدیک کے تالاب میں جاکر ڈوب مرا۔ اللہ اللہ کتنے باحیا اور خود دار چور ہوتے تھے۔

مرزا زبردست بیگ ان کو بٹیروں کا بے حد شوق تھا بلکہ جنون تھا۔ ان کے پاس تین سو چالیس قسم کے بٹیر تھے۔ بٹیر کیا تھے طاقتور شیر تھے پہلوان تھے۔ ان کو روزانہ سچے موتی اور سونے کے ورق کھلایا کرتے تھے۔ اور اس معمول میں کبھی ناغہ ہونے دیتے تھے۔۔ اور یہی وجہ تھی کہ اپنے فاقہ میں بھی ناغہ نہ پڑتا تھا اپنے بٹیر کو مینڈھے سے لڑا دیتے تھے۔ ایک دن بادشاہ نے بٹیر اور مینڈھے کی لڑائی دیکھی اور نہایت محظوظ ہوئے مینڈھا جب ٹکر مارنے کے لئے آتا تھا تو بٹیر پھدک کر اس کی آنکھ میں چونچ مار دیتا تھا۔ یہاں تک کہ دس منٹ میں بٹیر نے مینڈھے کی ایک آنکھ ضائع کر دی۔ بٹیر ابھی دوسری آنکھ پر حملہ کرنے کے لئے پینترے بدل رہا تھا کہ مینڈھا میدان

چھوڑ کر بھاگ گیا۔ بادشاہ نے خوش ہو کر سپہ سالار سرسالارجنگ کے گلے سے موتیوں کا ہار اتار کر مرزا زبردست بیگ کے گلے میں ڈال دیا۔

شرافت بیگ مرزا

اسم بامسمیٰ تھے۔ ظاہر باطن ایک تھا۔ نہایت شریف النسان تھے۔ محلے میں دائیں آنکھ آسمان کی طرف اونچی کر کے اور بائیں آنکھ زمین کی طرف جھکا کر چلتے تھے۔ یعنی اللہ کی طرف بھی دھیان ہوتا تھا۔ اور خاکساری کی وجہ سے زمین کی طرف نظر بھی۔ ہر ایک کا کام کر کے خوشی محسوس کرتے تھے۔ مخیر حد سے زیادہ تھے۔ کسی سوالی کو خالی ہاتھ نہ جانے دیتے تھے۔ کسی کے پاس برتن نہیں تو اپنے برتن اٹھا کر دے دیتے تھے۔ کسی کے پاس بستر نہیں تو اپنا بستر سمیٹ کر دے دیتے تھے۔ کسی کے پاس کپڑے نہیں تو اپنے کپڑے سرِراہ اتار کر دے دیتے تھے جب کبھی اپنے پاس خیرات کے لئے کچھ نہیں ہوتا تھا تو کسی دوسرے ہمسایہ کی چیز اٹھا کر خیرات کر دینے میں بھی دریغ نہ کرتے۔ ایک بار محفلِ میلاد میں بیٹھے تھے۔ ایک مسافر لمبے سفر سے آگیا جوتے پھٹے ہوئے تھے۔ اس کے لئے چلنا مشکل تھا۔ آپ کو ترس آگیا۔ میلاد پڑھنے والوں کے جوتے اٹھا کر اسے دے دیئے اور وہ اسے فوراً چلتا کیا۔ یہ تمام صفتیں عمر کے آخری دو سالوں میں حاصل کی تھیں۔ اللہ تعالےٰ کی دین ہے۔ اسی سال کی عمر میں انتقال کیا۔ اٹھہتر سال کی عمر میں نماز شروع کی جو مرتے دم تک قائم رکھی۔ اس سے پہلے یعنی ۷۸ سال کی عمر سے پہلے محلے والوں کے لئے شر اور آفت تھے۔ لیکن آخیر عمر میں ایسا پلٹا کھایا کہ دونوں لفظوں شر اور آفت کو ملا کر شرافت بن گئے۔ اور پھر ان لفظوں کو الگ نہ ہونے دیا۔ اللہ اللہ کیا تبدیلی آئی۔

استاد اچھن خان اچھن

شاہی اصطبل کے داروغہ تھے۔ اصطبل میں گھوڑا صرف ایک تھا استاد اچھن پولو کے کھلاڑی تھے۔ گھوڑے سدھانے میں کمال رکھتے تھے۔ پولو کھیلتے کھیلتے پولو کی لکڑی گھوڑے کے منہ میں دے دیتے تھے۔ گھوڑا

پر کھیلا رہتا تھا اور خود مزے سے بیٹھے افیون کی چسکی لگا لیتے تھے۔ شاہی گھوڑے کو سدھا کر عجوبہ روزگار بنا دیا تھا۔ اگلی دونوں ٹانگوں سے دلکی دوڑتا تھا۔ اور پچھلی ٹانگوں سے سرپٹ۔ بادشاہ سے اسپ الدولہ کا خطاب حاصل کیا تھا۔

میر ڈھکن دہلوی

پیراکی کے ماہر استاد مانے جاتے تھے۔ میر صاحب دہلی سے لکھنؤ پیدل تیرتے ہوئے آئے تھے۔ بادشاہ ہمیشہ ان کے کرتب شوق سے دیکھتے تھے۔ آخری بار جو بادشاہ کو کرتب دکھایا۔ لاجواب تھا۔ ایک آدمی کو دائیں ہاتھ میں پکڑا اور دوسرے کو بائیں ہاتھ میں۔ ایک آدمی نے ان کا دایاں پاؤں پکڑ لیا اور دوسرے نے بایاں پاؤں۔ میر ڈھکن ان چاروں آدمیوں کو لے کر بھنور میں کود گئے۔ اور پھر پیراکی کا ایک ایسا داؤ مارا کہ چاروں آدمی یکے بعد دیگرے کنارے پر ایک لائن میں آگرے اور خود میر ڈھکن ڈوب گئے اور لاش بھی نہ ملی۔ بادشاہ کو ان کی موت کا اتنا رنج ہوا کہ ایک دن کے لئے صبح کا حریرہ پینا چھوڑ دیا۔

مرزا دُہل نواز بہادر

طاقت ور تو تھے ہی مگر ان کی پاٹ دار آواز میلے کے ڈھول کی طرح بہت دہشت ناک اور لرزہ خیز تھی۔ اسی لئے دُہل نواز بہادر کا خطاب ملا تھا۔ ایک بار ان کی خواب گاہ میں بھول کر ایک اصیل مرغ آگیا۔ اُسے بھگانے کے لئے اتنے زور سے 'ہشت' کیا کہ مرغ وہاں ہی جاں بحق ہوگیا۔ کسی ملازم پر ناراض ہوکر گرجتے تھے۔ تو حویلی کے کنگرے اڑ جاتے تھے۔ اور دیواروں کا پلستر اکھڑ کر نیچے گر جاتا تھا۔ ان کی حویلی کے باہر راج اور مزدور بیٹھے رہتے تھے۔ کہ کب غصے میں آکر چیخیں اور ان کو روزگار ملے۔ اکثر مستریوں نے تو ان کے ملازموں کے ساتھ کمیشن مقرر کر رکھا تھا۔ کہ کسی نہ کسی طرح مرزا صاحب بہادر کو غصہ دلاتے رہا کریں۔ جوانی میں بنسری بجانے کا شوق ہوا۔ ابھی پہلی ہی پھونک ماری تھی۔ کہ بنسری کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ چھ سات درجن بنسریاں ٹھکانے لگانے کے بعد نے

نے نوازی سے باز آ گئے۔

مسیح دوراں حکیم گلقند خان عرف چھمن میاں خاندانی حکیم تھے اپنے وقت کے بہت بڑے نباض تھے خاص خوبی یہ تھی کہ مریض کی ناک دیکھ کر مرض کی تشخیص کر لیتے تھے۔ مستورات کی نبض دیکھنے کا طریقہ انوکھا اور حیرت انگیز تھا۔ عورت کی نبض پر دھاگہ باندھ کر اس کا ایک سرا اس کا شوہر یا بھائی پکڑ لیتا تھا۔ حکیم صاحب شوہر یا بھائی کی نبض دیکھ کر عورت کا مرض معلوم کر لیتے تھے نباضی کا فن ان کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔ آخری دم تک گرمی ہو یا سردی ململ کا کرتہ اور ململ کا پاجامہ پہنے رہتے تھے۔ ایک سو سولہ سال کی عمر پائی۔ مطلب قبرستان کے ساتھ تھا سب سے پہلا اور آخری شخص جو قبرستان میں دفن ہوا۔ اس کا نام ان کو معلوم تھا۔

پنڈت بگلا بھگت کالے ہندو تھے۔ اپنے وقت کے وید تھے۔ جڑی بوٹیوں سے علاج کرتے تھے تمام عمر شادی نہیں کی۔ کہتے تھے۔ جب باپ دادا نے شادی نہیں کی تو میں کیوں کروں۔ یہ خاندانی ریت کیوں توڑوں؟ نواب ڈھولک کی داشتہ کی ناک لمبی ہو گئی تھی۔ جو نواب صاحب کی مونچھوں میں فٹ ہو جاتی تھی۔ نواب نے ناک کم کرنے کے بہت علاج کرائے مگر فائدہ نہ ہوا۔ بلکہ ناک کچھ اور لمبی ہو گئی۔ بھگت کالے نے جڑی بوٹیاں لگا کر دو گھنٹے میں ناک کو مناسب حد تک مختصر کر دیا۔ داشتہ نے بھگت کالے کو ایک لاکھ ٹکے پیش کئے۔ بھگت نے لینے سے انکار کر دیا۔ کہا تیری کمائی مجھ پر حرام ہے۔ میں صرف بھگت ہی نہیں بلکہ پنڈت بھی ہوں۔ کچھ عرصے بعد داشتہ نے شکایت کی کہ نواب صاحب کی مونچھیں میری ناک پر چبھتی ہیں آپ نے کہا۔ بدو جراح کی طرف رجوع کرو۔ وہ نواب صاحب کی مونچھوں کا اپریشن کر کے تم کو نجات دلائے گا جو میں کر سکتا ہوں۔ میں نے کر دیا۔

بدر الدین عرف بدو عہد شاہی کے جراح اور حجام تھے۔ تین سو ساٹھ قسم کی حجامتیں

بنانا جانتے تھے۔ کولھا۔کمر۔ٹانگ ۔ہاتھ ٹوٹ جائے تو فوراً بٹھا دیتے تھے۔ایک فرانسیسی کی بلی کی ٹانگ کا گٹا اتر گیا۔ اس نے بدو کو بلایا۔اس نے بلی کو ایک تختی پر بٹھا کر اس کو اس طرح اچھالا کہ دوسری ٹانگ کا گٹا بھی اتر گیا۔بلی تڑپنے لگی فرانسیسی پریشان ہوا۔کچھ بولنے کو تھا۔کہ بدو نے ہاتھ سے روک دیا۔ بدو نے ایک گوشت کا ٹکڑا لے کر اونچا کیا بلی کو دکھایا۔ بلی نے دیکھا اور دونوں پنجے جوڑ کر اس طرح اچھلی کہ ٹکڑا اچک کر لے گئی۔ جیسے کچھ تکلیف ہی نہ ہو۔ اور دور بیٹھ کر مزے سے کھانے لگی ۔ کھانے کے بعد آہستہ آہستہ بلی دم ہلاتی ہوئی فرانسیسی کے پاس آئی۔فرانسیسی نے گود میں اٹھا لیا۔بدو کے فن کا معترف ہوا اور بہت انعام دیا۔

لالہ جیالال بھگا کاریگر استاد تھے۔بیر کا چھلکا باریک اتارتے تھے۔گھٹنوں میں سر دبا کر بیٹھ جاتے تھے۔اور ایک دن میں دس بیروں کا چھلکا اتار دیتے۔پچھتر سال کی عمر پائی اور بارہ ہزار بیریوں کے بیر کا چھلکا اتار دیا۔بیریاں تمام ختم کر دیں۔ اور اب چھلکا اتارنے کے لئے بیر نہیں ملتا تھا۔آخری عمر میں پاگل ہو گئے تھے۔اور دیوانوں کی طرح گلی کوچوں میں پھرتے تھے۔ اور ہر راہ گیر سے پوچھتے تھے آپ کے گھر میں ۔بیر کا درخت ہے۔

بانکے بہاری شکارپوری بے مثل جیب تراش تھے۔جیب اس خوبی سے کاٹتے تھے کہ تھوڑا سا گوشت بھی ساتھ کاٹ لیتے تھے۔لیکن علم نہ ہوتا تھا۔بادشاہ کی کئی بار جیب کاٹی اور انعام پایا آخر تنگ آکر بادشاہ نے جیب لگوانا ہی چھوڑ دیا۔

علم دین بادشاہ گجراتی پنجاب گجرات کے رہنے والے تھے۔ولی عہد کے دوست تھے ہم مشرب۔ہم نوالہ ۔ دہم پیالہ تھے۔صاحب کمال تھے چلتے چلتے لوگوں کے جوتے اتار لیتے تھے۔کسی نے چلتے ہوئے پاؤں اٹھایا انہوں نے

جوتا اتار لیا اور پھرتی سے کسی اور کا جوتا اتار کر ان کے پاؤں میں پہنا دیا۔ اسی طرح چلتے لوگوں کے جوتے بدل دیتے تھے مجال ہے۔ سائز میں فرق پڑے۔ چلنے والے کو علم تک نہ ہوتا تھا۔ کہ جوتے بدل گئے۔ بادشاہ نے ان کے اس کرتب سے خوش ہو کر ان کو پاپوش جنگ بہادر کا خطاب دیا تھا۔ اور ساتھ ہی ایک جوتوں کی دکان بخش دی تھی۔

حامد جان دیگی شاہی مطبخ کے باورچی تھے۔ عجیب عجیب قسم کے کھانے ایجاد کرتے تھے۔ باداموں کے چاول اور پستے کی دال بنا کر کھچڑی بناتے تھے کوئی پہچان نہ سکتا تھا۔ کہ چاول اور مونگ کی دال ہے یا بادام اور پستہ۔ جس حاکم کی سرکار میں پہلے نوکر تھے اس کو کھچڑی کھلا کھلا کر اس کا دیوالہ نکال دیا تھا اور اب بادشاہ کے ہاں یہی کرتب دکھاتے تھے۔ لوگ ان کے نئے نئے کھانوں کی ایجاد کی وجہ سے حسد کرتے تھے۔ اس لئے ان کا نام حامد جان پڑ گیا تھا۔ روٹی ایسی پکاتے تھے جو ایک طرف سے میٹھی دوسری طرف سے نمکین تیسری طرف سے پھیکی اور چوتھی طرف سے مرچوں والی ہوتی تھی۔ روٹی نرم اور بہت بڑی تقریباً لحاف کے سائز کی ہوتی تھی۔ اکثر روٹی کھاتے کھاتے جب نیند آتی تھی تو اوپر بھی اوڑھ لیتے تھے اور جب آنکھ کھلتی تھی تو روٹی پھر کھانا شروع کر دیتے تھے۔ ایک بار نواب احتشام الدولہ نے بادشاہ کی دعوت کی۔ نواب صاحب کے باورچی نے ایسا کھانا تیار کیا کہ جس کھانے پر نظر پڑتی تھی پلاؤ نظر آتا تھا۔ مگر ہر پلاؤ کا مزا بالکل الگ تھا کوئی پلاؤ قورمہ کا مزا دیتا تھا۔ کوئی مرغ کے گوشت کا اور کوئی زردے کا۔ بادشاہ بہت خوش ہوئے۔ اور باورچی کو انعام سے نوازا۔ حامد جان دیگی کا کمال دکھانے کے لئے بادشاہ نے نواب احتشام الدولہ کو مدعو کیا۔ دیگی نے بھی غضب کا کھانا تیار کیا۔ جس پلیٹ کی طرف دیکھو اس میں آلو بخارے نظر آتے تھے لیکن کھانے کا مزا بالکل الگ۔ کسی میں پلاؤ کا مزا۔ کسی میں شامی کباب کا۔

غرض ان آلو بخاروں میں پچاس قسم کے کھانے تھے۔ کھانے کے بعد نواب احتشام الدولہ نے کمر کے پیچھے ہاتھ باندھ کر عرض کی۔ حضور آپ کا باورچی گلاس دن ہے۔ اور میرے باورچی سے جیت گیا۔ میری طرف اس کو علاوہ انعام و اکرام کے مرغ الدولہ کا خطاب عطا کیا۔

کلو حلوائی جامنی مٹھائی بنانے میں یکتائے روزگار تھے۔ ریوڑیاں لاجواب بناتے تھے۔ اگر ریوڑی دائیں طرف منہ میں رکھی جاتی تو ریوڑی کا مزا دیتی تھی۔ اگر منہ کے درمیان رکھی جاتی تو قلاقند کا لطف آتا تھا۔ اور اگر منہ میں بائیں طرف رکھی جاتی تو جلیبی کا مزا آتا تھا۔ یہ کمال کلو جامنی پر ہی ختم ہو گیا۔ ان کے بعد ان جیسا کوئی پیدا نہ ہوا۔ ہزاروں شاگرد ہوئے مگر کوئی اُن کی گرد کو نہ پہنچ سکا۔ اکثر احباب ان کی بھوکان پر آکر دادا بچھا کا فاتحہ پڑھتے تھے۔

چودھری رفیق الملک خاندانی باورچی تھے۔ آباؤ اجداد شملہ پہاڑ سے تعلق رکھتے تھے شملہ سے لکھنؤ آکر آباد ہوئے۔ ایک بہت بڑی دعوت میں آپ نے تمام کھانے شکر کے بنائے۔ پلاؤ، قورمہ، کوفتے۔ نان۔ کباب سب شکر کے تھے۔ کھانے کے تمام برتن پلیٹیں۔ گلاس جگ، چمچہ چھری کانٹے سب شکر کے بنائے تھے۔ یہاں تک کے ہاتھ دھونے کا صابن بھی شکر کا تھا اور جگ میں پینے کے لئے پانی بھی شکر کا تھا۔ بادشاہ نے خوش ہو کر شکر نواز جنگ کا خطاب دے کر ڑخا دیا۔ بادشاہ کی جلاوطنی کے بعد راولپنڈی آ کر ایک ہوٹل کھول لیا۔ مگر یہاں کوئی قدر دان نہ ملا۔ باورچی کا کام چھوڑ کر چٹنی۔ اچار اور جام کا کارخانہ کھول لیا اور اس کا نام شملہ جام فیکٹری رکھ دیا۔ جو آج تک قائم ہے۔ اور ان کی اولاد خوش اسلوبی سے چلا رہی ہے۔

شہزادہ دلبند قدر بہادر شہزادہ بہادر کو قسم قسم کے مربے اور چٹنیاں ایجاد کرنے کا بہت شوق تھا۔ انہوں نے اشرفیوں اور روپیوں کا مربہ ایجاد کیا۔ مزے کی بات کہ اشرفیوں کے حروف ویسے ہی قائم رہتے تھے اور کھانے کے بعد تک قائم رہتے تھے۔ ایک بار شہزادہ بہادر نے اشرفیوں کا اتنا مربہ تیار کیا کہ سات ہزار مرتبان بھر گئے۔ اور شاہی خزانہ خالی ہوگیا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ خزانے میں مربے کے مرتبان رکھ دیئے جائیں۔ تاکہ بیلنس شیٹ برابر رہے۔ اکثر دس دس اور پانچ پانچ روپے کے نوٹوں کی چٹنی تیار کرتے تھے۔ جو شاہی دسترخوان پر بے حد پسند کی جاتی تھی اور یہ تمیز کرنا ناممکن تھا کہ یہ نوٹوں کی چٹنی ہے یا آم کی۔

رام موہن گرسنہ بہت خوش خور تھے۔ ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتے رہتے تھے اسی لئے گرسنہ کہلاتے تھے۔ ایک دن کسی سے شرط لگا کر ایک سو چوراسی جوڑی لڈو۔ بیاسی جوڑی بالوشاہی چھیانوے جوڑی گلاب جامن، دس درجن ہری چھال کے کیلے۔ ایک من آم قلمی چھ ماہ میں کھا گئے۔ اتنا کچھ کھانے کے بعد اور چالیس سال تک زندہ رہے۔ اکثر دعوتوں میں بن بلائے جاتے تھے۔

نواب امیر الدولہ شاہی خاندان سے تھے۔ لگاتار ایک ہزار ڈنڈ پیلتے تھے اور ایک ہزار بیٹھک لگاتے تھے۔ طریقہ یہ تھا کہ ایک ڈنڈ لگاتے پھر ایک بیٹھک لگاتے پھر ایک ڈنڈ لگاتے پھر ایک بیٹھک۔ یہ سلسلہ اتنی تیزی سے جاری رہتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی چھاپہ خانہ کی مشین چل رہی ہو۔ کہتے ہیں کہ جب ان کی حویلی بن رہی تھی تو کسی وجہ سے ایک کمرے کی دیوار ذرا ٹیڑی ہو گئی۔ آپ نے دیکھا تو دیوار کے ساتھ

کر کی ٹیک لگا کر تھوڑا سا دھکا دے کر دیوار کو سیدھا کر دیا۔ مگر اس دیوار پر ہاتھ کی ہتھیلی رکھ کر ٹیڑھی دیوار کو آہستہ سے دھکا دے کر دیوار کو سیدھا کر دیا مگر اس دیوار کے ساتھ والی دیوار ٹیڑھی ہو گئی۔ نواب صاحب نے ٹیڑھی دیوار پر پھر ٹیک لگا کر دوسری دیوار پر ہاتھ کی ہتھیلی رکھ کر ٹیڑھی دیوار کو آہستہ سے دھکا دیا۔ دیوار بالکل سیدھی ہو گئی۔ اور پہلی دیوار بھی نہ ہلی۔ یہ طاقت کا مظاہرہ تمام معماروں اور مزدوروں نے جو اس وقت کام کر رہے تھے۔ دیکھا وہ سب تعداد میں دو سو پانچ تھے تعریف کے ڈونگرے برسانے لگے کہ جل تھل ہو گیا۔

میاں غلام نبی بے ہوش

باکمال خیاط تھے۔ اچکن غضب کی سیتے تھے۔ سیدھی طرف سے پہنو تو اچکن اگر الٹ کر دیکھو تو برقعہ بن جاتا تھا۔ ناپ کبھی نہ لیتے تھے۔ گاہک کو سامنے کھڑا کر کے اس پر کپڑا چڑھا کر دو گھنٹے میں سی دیتے تھے۔ ایک منٹ میں تین سو بہتر ٹانکے لگاتے تھے۔ دیکھنے والا سمجھتا تھا۔ کہ دو ہی ٹانکے بھرے ہیں اور بے کار بیٹھے ہیں۔ لیکن اتنے تیز رفتار تھے کہ اکثر گاہک کا ٹانکہ بھی بھر دیتے تھے۔ ایک اچکن کے کپڑے میں سے دو اچکنیں تیار کرتے تھے ایک گاہک کے لئے اور ایک اپنے لئے شاہی سے متراض الدولہ کا خطاب حاصل کیا تھا۔

ماسٹر اللہ دتہ امرتسری

میاں غلام نبی بے ہوش کے شاگرد تھے۔ ان کی شہرت سن کر امرتسر سے بھاگ کر ادھر آ گئے تھے ہمیشہ غریب لوگوں کے کپڑے سیتے تھے۔ اور کمال یہ تھا کہ ان کا سیا ہوا ایک ہی کپڑا اگر سر کی طرف سے پہنا جائے تو قمیض ہوتا تھا اور اگر ٹانگوں کی طرف سے پہنا جائے تو پاجامہ۔ مستورات کا ناپ ان کی آواز سن کر سمجھ جاتے تھے۔ اور کیا مجال سائز میں فرق آئے بادشاہ نے شلوار الملک کا خطاب دیا تھا۔

خیاط اعظم فضل دین وارثی لاہور کے رہنے والے تھے ہر کپڑا لاجواب سیتے تھے۔ سینے کا طریقہ یہ تھا کہ آنکھوں پر پٹی باندھ کر سیتے تھے اور کپڑا بالکل فٹ بیٹھتا تھا۔ پاجامہ سینے کے سپیشلسٹ تھے۔ پورے ایک دھاگے سے پاجامہ سیتے تھے۔ اگر دھاگے کو پکڑ کر کھینچ لیتے تو سارا پاجامہ کھل جاتا تھا۔ اور پاجامے کا تہمد بن جاتا تھا۔ یہ کمال آخر ان کی جان کو آ گیا۔ سو سال کی عمر ہونے کو آئی تھی مگر مجرد تھے۔ چھبیس سال کی عمر میں ایک رشتہ آیا تھا لڑکی کے والدین کی شرط یہ تھی کہ ایک دھاگے کا پاجامہ سینا چھوڑ دو پھر رشتہ دیں گے۔ یہ کسی طرح راضی نہ ہوئے اور ضد میں آکر تمام عمر ایک ہی دھاگے سے پاجامے سیتے رہے اور سپیشلسٹ بن گئے۔

شیخ بیکڑ نواز جنگ ضلع جالندھر پنجاب سے تعلق تھا۔ شاہی میں ملازم تھے گپ مارنے میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ گپ پہ سچ کا گمان ہوتا تھا اور سچ اس طریقے سے بیان کرتے تھے کہ گپ کا گمان ہوتا تھا۔ شکار کی باتیں ہو رہی تھیں۔ بادشاہ سے عرض کیا" ایک بار جنگل میں درخت پر بیٹھا تھا۔ شیر کا انتظار کر رہا تھا بندوق ہاتھ میں تھی۔ تھوڑی دیر بعد دیکھا تو شیر ذرا دور منہ کھولے کھڑا ہے اور پنجے سے بندوق کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہا ہے۔ میں خالی ہاتھ اور تیرے پاس بندوق یہ مقابلہ کیسا۔ تو حضور جہاں پناہ غیرت میں آکر میں نے بندوق پھینک دی۔ ادھر شیر نے میری طرف جست کی ادھر میں نے پیراکی کے انداز میں ہاتھ جوڑ کر شیر کی طرف چھلانگ لگائی آدھے راستے میں ملاقات ہوئی۔ شیر کا منہ کھلا تھا۔ میں شیر کے منہ میں آدھا اندر اور آدھا باہر۔ میں نے جلدی سے چاقو نکال شیر کی کلیجی کاٹ کر قابو کی۔ ادھر شیر کا سانس بند ہو رہا تھا۔ میں نے حضور پیراکی کے الٹے انداز میں زور سے جھٹکا مارا اور تیر کی رفتار سے شیر کے منہ سے باہر، شیر دیکھتا رہ گیا۔ اور پھر پیٹ

کر بیٹھ گیا۔

قطب اللہ اعظم خطاط آپ نے چار شادیاں کی تھیں۔ باکمال خوش نویس تھے اور لکھنے کی رفتار بہت تیز تھی۔ ایک وقت میں ایک ہاتھ میں تین قلم پکڑتے تھے۔ جو انگلیوں کے درمیان رکھے ہوتے تھے۔ ایک قلم سے نظم لکھتے تھے دوسری قلم سے نثر اور تیسری قلم سے چوتھی بیوی کو خط لکھتے تھے۔ بادشاہ ان کو خطاب دینا چاہتے تھے۔ مگر کوئی موزوں خطاب سوجھتا نہ تھا۔ اس لئے تمام عمر خطاب سے محروم رہے اور اس کا ان کو سخت رنج تھا اور ان سے زیادہ بادشاہ کو۔

منشی نظام دین سیالکوٹی سیالکوٹ ضلع پنجاب کے رہنے والے تھے۔ لکھنؤ آکر بس گے اور وہاں کے ہی ہو رہے۔ عالم فاضل تھے۔ دربار کا لکھنے پڑھنے کا کام کرتے تھے۔ بادشاہ کو لفافہ ملاحظہ کرانا اور شاہی مہر خاص ثبت کرنا ان کے فرائض میں شامل تھا۔ بادشاہ کے سامنے ایک ایک عرضی گزارتے تھے۔ سیروں کے حساب سے روز لفافے۔ خطوط اور عرضداشت آتی تھیں۔ ملاحظہ کرانے سے پہلے عرض کر دیتے تھے آج کی ڈاک بائیس سیر تیرہ چھٹانک دو تولے ہے۔ اس پھرتی سے ڈاک ملاحظہ کراتے تھے کہ بادشاہ دیکھتے ہی رہ جاتے تھے۔

ہر بات اور ہر تحریر کی تصدیق کرنا بھی ان کے ذمہ تھا۔ خوبی یہ تھی کہ بغیر بات سنے اور بغیر تحریر دیکھے تصدیق کر دیتے تھے۔ شاہی سے تصدیق الدولہ کا خطاب عطا ہوا تھا۔ ایک بار بادشاہ شکار کے لئے گئے ہوئے تھے منشی نظام دین کے گرد عرضداشت اور خطوط کا منوں ڈھیر لگ گیا۔ دن بدن ڈھیر بڑھتا گیا۔ آپ ڈھیر میں گھر کر رہ گئے باہر جانے کا رستہ نہ ملا۔ باہر نکلنے کی کوشش کی تو ڈھیر اوپر آگرا۔ اور اسی میں دب کر رہ گئے۔ اور دفن ہو گئے۔ اس واقعہ کو دبا دیا گیا۔ اور مشہور کر دیا گیا کہ حرکت قلب بند ہونے سے انتقال ہوا۔ افسوس جو شخص ہر بات کی تصدیق کرتا تھا اس کی موت

تصدیق نہ ہو سکی کہ کیسے جان دی۔ بادشاہ کو ان کی موت کا بہت قلق ہوا۔ ہمیشہ کے لئے عرضداشت دیکھنی بند کر دی۔

راجہ مولا داد گمان باکمال رنگ ریز تھے۔ گندے نالے کے کنارے رہتے تھے نالے میں قسم قسم کے رنگ ڈال کر کپڑا رنگتے تھے۔ کپڑے کے ایک طرف آدھا سبز اور آدھا سیاہ۔ رنگ چڑھتا تھا۔ اور دوسری طرف آدھا سرخ اور آدھا عنابی رنگ چڑھتا تھا۔ ایک ایسا ہی کپڑا رنگ کر بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ بادشاہ ایک کپڑے میں چار رنگ دیکھ کر بہت خوش ہوئے بڑی دیر تک کپڑے کو سونگھتے رہے۔ فرمایا کیا معطر کپڑا ہے۔ اس کو میرے مزار پر چڑھانا۔ اور راجہ مولا داد گمان کو مزار کا مجاور بنا دیا۔ راجہ مولا داد کو انعام و اکرام کے علاوہ مجاور الدولہ کا خطاب بھی عطا کیا۔

مرزا آسمان جاہ کبوتر الملک ہر قسم کے کبوتر پال رکھے تھے۔ کبوتر بازی میں ان سے مقابلہ کرنے کی کسی میں جرأت نہ تھی۔ کبوتر کو پتنگ سے لڑا دیتے تھے۔ پتنگیں اڑ رہی ہیں۔ مرزا نے ایک کبوتر کو اشارہ کیا۔ کہ فلاں پتنگ کی جا کر خبر لے۔ کبوتر اڑا اور اسی پتنگ کے گرد ہو گیا۔ جس کی طرف مرزا نے اشارہ کیا تھا۔ جا کر چونچیں مار مار کر پتنگ کو اچھی طرح زخمی کیا۔ اور واپس آ گیا۔ مرزا نے اب ایک چیپی پر لئی لگا کر کبوتر کے منہ میں دے دی اور کہا جا زخمی کی مرہم پٹی کر آ۔ کبوتر تیر کی طرح گیا اور پتنگ پر لگا آیا۔ مرزا میں اور کئی کمال تھے۔ پتہ نہیں کبوتروں پر کیا جادو کیا تھا کہ کبوتر اشارے پر چلتے تھے۔ پچاسی برس کی عمر میں انتقال کیا مرتے مرتے بھی کچھ ایسا اشارہ کر گئے کہ کبوتر بھی ساتھ ہی قبر میں چلے گئے۔

خدا بخش چابک شاہی کوچ مین تھے۔ گھوڑوں پر کبھی چابک استعمال نہ کرتے تھے اسی لئے چابک کے نام سے پکارے جانے لگے۔ باکمال شخص تھے۔ سڑک پر اشرفیوں کی لمبی قطار لگا دی جاتی تھی۔ گاڑی اسی طرح

چلاتے تھے کہ گاڑی کا ایک پہیہ اشرفیوں کی قطار پر آجاتا تھا جب گاڑی چلتی تھی تو اشرفیاں پہیے کے ساتھ اٹھ اٹھ کر چھنا چھن گاڑی کے اندر بادشاہ کے قدموں میں گرتی تھیں۔ ایک بھی اشرفی سڑک پر نہیں رہ جاتی تھی۔ بادشاہ یہ تمام اشرفیاں خدا بخش چابک کو بطور انعام بخش دیتے تھے۔

حافظ مولاداد بہیر باغبانی کے کام میں ماہر تھے۔ شاہی باغ میں آم کے درخت کو انہوں نے چند پیوند لگا دیئے جب پھل آیا تو بادشاہ دیکھ کر حیران ہوئے۔ ایک ہی درخت کو چار قسم کے پھل لگے ہوئے تھے ایک طرف آم دوسری طرف آلوچے۔ تیسری طرف ناشپاتی۔ اور چوتھی طرف امرود لگے ہوئے تھے یہ پیوند کس طرح لگایا اس کا راز کسی کو نہ بتایا اور اپنے ساتھ ہی قبر میں لے گئے۔ اور اپنا پیوند خاک میں لگا دیا۔

کرامت علی شرافت علی رات پچاسی پنجاب کے رہنے والے تھے۔ سگے جڑواں بھائی تھے کرامت علی شرافت علی سے صرف چند منٹ سینئر تھے۔ خاندانی گویے تھے۔ گانے میں کمال حاصل کیا تھا۔ نواب غلام پور لکھنؤ تشریف لائے تو بادشاہ نے ان کے آنے کی خوشی میں موسیقی کی محفل منعقد کرائی۔ دونوں بھائیوں نے ایک غزل اس انداز سے گا کر سنائی کہ سب عش عش کر اٹھے۔ غزل کا ایک لفظ ایک بھائی گاتا تھا اور دوسرا لفظ دوسرا بھائی۔ ایک آواز۔ ایک رفتار اور ایک سلسل روانی۔ منہ دونوں کے ہلتے تھے مگر آواز ایک آدمی کی آتی تھی۔ نواب غلام پور سینے پر ہاتھ مار کر ہائے ہائے پکار اٹھے۔ اور انہوں نے لاکھ چاہا کہ ان کے دربار میں آجائیں بڑے بڑے انعام واکرام کا لالچ دیا۔ بادشاہ نے بھی اجازت دے دی مگر دونوں بھائیوں نے بادشاہ کی ملازمت چھوڑنا گوارا نہ کی۔ اور دونوں نے بھرے دربار میں رو رو کر التجا کی کہ حضور کا نمک کھایا ہے اور آئندہ بھی حضور کا نمک اڑائیں گے اس

لئے اپنے قدموں سے جدا نہ کیجئے ۔ بادشاہ نے التجا قبول کی ۔ نواب غلام پوران کی وفا شعاری اخلاص اور نمک خواری سے بہت متاثر ہوئے ۔ اور دو بھرے ہوئے چھکڑے نمک کے ان کے گھر بھجوا دیئے کہ گھر میں بیٹھ کر تمام عمر نمک حلالی کرتے رہیں ۔

منی جان آگرے والی

منی جان رقاصہ کی چوتھے یا پانچویں نواب سے تیسری بیٹی تھی ۔ بہت خوبصورت تھی ، سفید رنگت ۔ جسم اس طرح جیسے سنگِ مرمر سے تراشا گیا ہو ۔ چلتی پھرتی تاج محل تھی ۔ اس وجہ سے آگرے والی کہلاتی تھی ویسے اس نے آگرہ دیکھا تک نہ تھا ۔ غضب کا ناچتی تھی اور دور دور تک مشہور تھی ۔ دونوں پاؤں میں ایک سو چھیاسی گھنگرو باندھ کر ناچتی تھی ۔ جتنے گھنگرو چاہتی تھی بجاتی تھی ۔ کبھی صرف پانچ ۔ کبھی سترہ ۔ کبھی چالیس ۔ کبھی ستر ۔ کبھی ایک سو دس چاہے گن لو ۔ مجال ہے ایک نمبر کا بھی فرق پڑے ۔ اگر اسی چاہتی تو اسی ہی بجتے باقی سب خاموش رہتے ۔ مہاراجہ سٹیالہ اس کے عشق میں سٹیا گئے تھے ۔ حاصل کرنے کی بہت کوشش کی وہ رضامند نہ ہوئی پھر مہاراجہ نے اغوا کرنا چاہا ۔ اس کو کسی طرح خبر مل گئی ۔ چپکے سے بیت اللہ کی راہ لی ۔ اور ہر پندرہ گز پر کتھک ناچ ناچتی ہوئی روانہ ہوئی ۔ پاؤں میں چھالے پڑ گئے ۔ دو برس سفر کرتے ہوئے گذرے تھے اور ابھی آدھا راستہ بھی طے نہیں کیا تھا ۔ کہ خبر ملی مہاراجہ سٹیالہ چل بسے ہوئے یہ خبر سن کر الٹے پاؤں واپس آ گئی ۔ اور پھر گن گن کر گھنگرو بجانے لگی ۔

ہادی حسن

موسیقی میں بڑا نام پیدا کیا ۔ سر طبلے کی طرح بالکل صاف تھا ۔ ہر طرح کا گانا بخوبی گاتے تھے ۔ غزل گاتے ہوئے ہر شعر پر شعر جیسی شکل بناتے تھے ۔ خاص طور پر پکے گانے کے استاد تھے ۔ ان کے پکے راگ سے بند الماریوں میں شیشے اور چینی کے برتن چھناچھن ٹوٹ جاتے تھے ۔ جب محفل میں گانے جاتے تھے تو سب سے پہلے وہاں سے تمام شیشے اور چینی کے برتن

غائب کر دیئے جاتے تھے۔ اگر کسی کو نقصان پہچانا ہوتا تھا۔ تو خود اس کے گھر جا کر راگ چھیڑ کر اس کی کراکری کا ٹین پاٹ کر دیتے تھے۔ خود اگر کبھی شیشے یا چینی کے برتن خریدنے جاتے تو دکاندار ان سے التجا کرتا کہ جناب جو کچھ خریدنا ہے لکھ کر بتائیے جو بات کرنی ہے لکھ کر کیجئے۔ اگر آپ نے ایک لفظ بھی منہ سے نکالا تو گلاس ٹوٹا یہ اسی رعب میں سستی کراکری خرید لاتے تھے۔

باجو ناورا

موسیقی کے کامل استاد تھے۔ سلسلہ نسب چوتھی پشت میں بیجو باورا سے جاملتا تھا۔ بادشاہ ان کے گانے کے عاشق تھے۔ ان کے گانے کا کمال یہ تھا کہ جب کبھی بادشاہ ان کو دربار میں گانے کے لئے بلاتے تو امیروں وزیروں اور موسیقی کے عاشقوں کی دو قطاریں لگ جاتی تھیں۔ ایک ان کے داہنے ہاتھ بیٹھتے تھے اور دوسرے بائیں ہاتھ۔ جب یہ جوش وخروش اور محویت کے عالم میں گاتے تھے تو دائیں طرف کی قطار والے رونا شروع کر دیتے تھے اور بائیں طرف کی قطار والے قہقہے مار کر ہنسنے لگتے تھے۔ آدھ گھنٹہ تک یہ رونے اور ہنسنے کی مشق کراتے تھے۔ یہاں تک کہ رونے والوں کے آنسو خشک ہو جاتے تھے اور ہنسنے والوں کے ہنس ہنس کر پیٹ میں بل پڑ جاتے تھے۔ اب باجو ناورا ایسا گیئر بدلتے تھے کہ رونے والی قطار ہنسنے لگ جاتی تھی اور ہنسنے والی قطار رونا شروع کر دیتی تھی۔ بادشاہ کیونکہ دونوں قطاروں کے درمیان میں ایک سرے پر ایک اونچے تخت پر بیٹھتے تھے اس لئے صاف نظر آتا تھا۔ کہ ایک آنکھ سے رو رہے ہیں اور دوسری آنکھ سے ہنس رہے ہیں۔

ایک سال بارش بالکل نہ ہوئی پانی کی ایسی قلت ہوئی کہ رعایا پانی کی بوند کو ترس گئی۔ دریا، ندی، نالے، تالاب، کوئیں، سب خشک ہو گئے۔ لوگ چیخ پڑے بچے بلبلا اٹھے۔ بادشاہ گھبرا گئے۔

باجو نادرا نے یہ صورت حال دیکھ کر بادشاہ سے عرض کی کہ ایک لاکھ آدمی تالاب کے چاروں کناروں پر بٹھا دیے جائیں۔ جب تمام خلقت بیٹھ گئی تو انہوں نے ایسا گانا شروع کیا جو اشک آور تھا۔ تھوڑی دیر میں لوگوں نے زاروقطار رونا شروع کر دیا۔ دو ڈھائی گھنٹے میں آنسوں کا سیلاب بہ نکلا۔ تمام تالاب بھر گیا۔ بلکہ اشکوں کی لہریں تالاب کے کناروں سے باہر آنے لگیں۔ بادشاہ بہت خوش ہوئے۔ خلعت عطا کی اور تالاب الدولہ کا خطاب بھی عطا کیا۔ اور ساتھ ہی ملیح الملک بھی بنا دیا۔ بادشاہ کہتے تھے۔ کہ تالاب کا پانی اتنا نمکین ہے کہ اب سال بھر کے لئے نمک کی بھی ضرورت نہیں۔

باجو نادرا نے پندرہ سوچھپن راگنیاں ایجاد کیں۔ تمام راگنیاں ترکیب استعمال کے ساتھ اپنے ہاتھ سے ایک کتاب میں لکھی تھیں اس کتاب کی تیرہ جلدیں تھیں۔

جون کے مہینے کا گرم ترین دن تھا۔ آپ آدھی رات کے وقت اپنی کتاب کی تیرہ جلدیں سامنے رکھے راگ آتش فشاں کا الاپ کر رہے تھے۔ آنکھیں بند تھیں اور الاپ میں اتنے محو تھے کہ ان کو علم تک نہ ہوا اور کتابوں میں سے دھواں اٹھنے لگا۔ یہ الاپتے رہے اور جلدیں جلتی رہیں۔ جب انہوں نے الاپ ختم کیا تو جلدیں بھی ختم ہو چکی تھیں یعنی اس گھر کو گھر کے چراغ سے آگ لگ گئی۔ صد حیف ایک بے بہا قومی سرمایہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مٹ گیا۔ اللہ اللہ کیسے کیسے باکمال لوگ تھے کہ بے اختیار کہنا پڑتا ہے اگلے وقتوں کے تھے یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو۔

چلے بھی آؤ کہ......

رے ہاں بار بار جانے سے وہ قدر نہیں ہوتی جو کبھی کبھی جانے سے ہوتی ہے۔ مثل مشہور ہے کہ ایک دن مہمان دو دن مہمان اور تیسرے دن بلائے جان۔ پہلے دن ناشتے میں مہمان کو دو انڈوں کا آملیٹ ٹوسٹ اور مکھن ملتا ہے۔ دوسرے دن ایک انڈے کا آملیٹ اور دو ٹوسٹ تیسرے دن ٹوسٹ اور مکھن۔ چوتھے دن پوچھا جاتا ہے آج ناشتے میں کیا کھایئے گا۔ پانچوں دن راشن کی چینی کا رونا رویا جائے گا۔ ختم ہوگئی چینی کا بہت خرچ ہے۔ لیکن اگر کسی مس منی بائی یا مس مہیا کے ہاں روز روز جایئے بلکہ ایک دن میں دو تین بار جایئے تو ہر بار خندہ پیشانی سے استقبال ہوگا۔ آنکھیں اس طرح فرش راہ ہوں گی جیسے اُسے صرف آپ کا ہی انتظار ہو۔ ادھر آپ نے کمرے میں قدم رکھا اُدھر وہ آہٹ پر فوراً پیشوائی کو اُٹھ کھڑی ہوگی۔ آداب عرض کرتی ہوئی اور تشریف لایئے تشریف لایئے کہتی ہوئی جھکتی جائے گی۔ اس طرح استقبال صرف پہلی بار جانے پر نہ ہوگا بلکہ ہر بار اسی طرح ہنستی مسکراتی آپ کا استقبال کرے گی اور آپ کو ایسا محسوس ہوگا کہ زبانِ حال سے کہہ رہی ہے۔

چلے بھی آؤ کہ......

اس طبقے کے متعلق اکثر کہا جاتا ہے کہ اس بے وفا قوم کا کیا اعتبار۔ آج آپ کی اور کل آپ کے بھائی کی۔ آپکی جیب میں پیسہ ہو تو آپکے سامنے ہاتھ باندھ کر حاضر اور ہر خدمت کیلئے موجود اُدھر آپ کی جیب خالی اُدھر اس کا کمرہ آپ سے خالی۔ بات تو معقول ہے۔ مگر دیکھنا صرف

سنا ہے کہ اگر خدانخواستہ آپ کی جیب خالی ہے جو عموماً ہوتی ہے تو پھر آپ کے گھر والے وفادار لوگ آپ کو کہاں پوچھتے ہیں۔ دنیا کا دستور ہی کچھ ایسا ہے کہ جس کے پاس پیسہ اس کے سب دوست۔ شریف سے شریف انسان تب تک ساتھ دیتا ہے جب تک دیکھتا ہے کہ دوست کے پاس پیسہ ہے۔ دور کیوں جایئے۔ رفیقہ حیات، محرم راز یعنی بیگم صاحبہ کو دیکھ لیجئے پہلی تاریخ کو کس محبت سے پیش آتی ہیں۔ اور مہینے کی آخری تاریخوں میں ان کا موڈ کتنا خطرناک ہوتا ہے۔ یہ آپ سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ اب اگر کسی بے وفا نے ایسا خطرناک موڈ اختیار کر لیا تو یہ اس کا پیدائشی حق ہے۔ کیونکہ یہ تو مانی ہوئی بات ہے کہ مس منی یا چھیا کسی کے گھر بلانے پر جاتیں نہیں۔ انسان کی طبیعت میں کھلی ہوتی ہے۔ تو خود ہی جا پہنچتا ہے۔ بات تو مطلب کی طرف آتی ہے کہ یہاں پر استقبال خندہ پیشانی سے ہوتا ہے۔ پہلے دن نہیں بلکہ ہر بار ڈوانڈول کا آلیت ملے گا۔

مشہور تو یہاں تک ہے کہ پرانے وقتوں میں یہی کوئی ساٹھ ستر سال بیشتر راجہ، نواب اور بڑے بڑے رئیس اپنے ذاتی بچوں کو تہذیب سکھانے کی غرض سے چھیا بائی کے ہاں خود بھیجتے تھے۔ اور یہ وہی تہذیب ہوتی تھی جو خود راجہ صاحب اور نواب صاحب نے چھیا بائی کی والدہ محترمہ یعنی بڑی بائی جی سے سیکھی ہوتی تھی بچے وہاں پر اس طرح جاتے تھے جیسے کسی سکول یا کالج میں حصول تعلیم کے لئے جاتے ہیں اور چند دنوں میں تہذیب اور سلیقہ سیکھ کر مہذب ہو جاتے تھے۔ آج کل کے بچے ایسے شستہ اور تہذیب یافتہ نہیں ہوتے جیسے پہلے وقتوں کے ہوتے تھے۔

مجھے مس چھیا بائی کے ہاں جانے کا صرف ایک بار پہلا اور آخری اتفاق ہوا۔ یہ ۱۹۴۲ء کی بات ہے میں ان دنوں دہلی میں ملازم تھا۔ گول ڈاکخانہ کے پاس الیگزینڈرا پیلس میں دو کمرے رہائش کے لئے سرکار کی طرف سے ملے ہوئے تھے۔ کیا سنہری دن تھے۔ ان دنوں ہم اللہ تعالیٰ کے خاص فضل و کرم سے اکیلی ذات ہوتے تھے۔ نہ فکر نہ فاقہ۔ وہ تمام ایریا ہم جنسوں سے بھرا ہوا تھا۔ مکانوں کی تنگی کی وجہ سے ایک ڈیوڑھی والے بھی وہاں مجبوراً رہتے تھے۔ اور ہماری قسمت پر رشک کیا کرتے تھے۔ اس وقت ناتجربہ کاری کی وجہ سے ہم ان کی زندگی پر رشک کرتے تھے۔

دفتر میں میرا ایک دوست سنتوش کمار تھا۔ تھا تو دلی کا مگر تھا پنجابی۔ تمام دفتر میں یہی اکیلا تھا جو کار میں ٹائپ کرنے آتا تھا۔ ہمارا سب سے بڑا افسر سکریٹری سائیکل پر آتا تھا۔ اصل میں سنتوش کمار ایل ڈی دھنو کمار کا فرزند ارجمند تھا۔ باپ کے پاس کوٹھی، کار، سب کچھ تھا، جائیداد بھی بہت تھی۔ اس لئے کار تو ایک معمولی چیز تھی۔

سنتوش کمار زمانہ امن کے ایس ڈی او کا لڑکا تھا جب ایک روپیہ کی تین من لکڑی آتی تھی نہ کہ آج کل کی طرح بارہ روپے کی ایک من۔ دس آنے سیر خالص گھی کی مٹھائی آتی تھی اور آج کل بارہ روپے سیر خالص گھی کی مٹھائی۔ سنتوش کمار کی زندگی عیش کی زندگی تھی۔ حالانکہ ساٹھ روپے کی نوکری میں اس کا [illegible] تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ملتے تو مجھے صرف ساٹھ روپے ہیں مگر اس نوکری کا مجھے ایک بہت فائدہ ہے۔ وہ یہ کہ اب جس وقت چاہوں جہاں چاہوں کار لے کر چلا جاتا ہوں گھر والے سب خوش ہیں کہ لڑکا لازم ہے۔ پہلے بھی وہیں جاتا تھا جہاں اب جاتا ہوں مگر تمام گھر والے شور کرتے تھے کہ لڑکا آوارہ گردی کرتا ہے، کام نہ کاج کار لی کبھی ادھر نکل گئی کبھی ادھر۔ بے فائدہ پیٹرول پھونکتا ہے۔ نوکری کا یہ کیا کم فائدہ ہے کہ وہی آوارگی نیک چلنی میں بدل گئی ہے۔"

سنتوش کمار کی کوٹھی ہمارے ایریا کے قریب تھی یعنی چار منٹ کا راستہ تھا۔ سنتوش کمار اکثر شام کو میرے ہاں آجاتا تھا۔ خوب گپ شپ رہتی تھی، گوشت کھانے کا حد سے زیادہ شوقین تھا۔ پی کر کہیں اور سے آتا تھا مگر رات کو عموماً کھانا میرے ہاں کھا کر جاتا تھا۔ اور اکثر فرمائش کر دیا تھا آج پسندوں کا پروگرام ہے۔ آج نرگسی کوفتے پکوائے جائیں؟ وہ کہتا تھا کہ اگر مسلمانوں کے ہاں گوشت کھانے کا رواج نہ ہو تو ان کے کھانے بد مزہ ہوں۔ ان میں اور ہندوؤں میں خاص فرق نہ رہے۔

ایک شام میں دفتر سے ابھی آیا ہی تھا کہ میرے کالج کے وقتوں کے عزیز دوست اقبال حیدر زیدی تشریف لے آئے۔ ان کے لئے چائے کا بندوبست ہو رہا تھا کہ سنتوش کمار اپنے باپ کی گاڑی لے کر آگیا۔ چائے سے فارغ ہوئے تو کہنے لگا، چلو یار باہر نکلو۔ ذرا گاڑی میں گھوم پھر آئیں۔ جہاں کہاں گرمی میں بیٹھے ہو گھنٹہ آدھ گھنٹہ چکر لگا کر واپس آجائیں گے۔

چونکہ صرف سیر کا پروگرام تھا اور کار ہی میں جانا تھا۔ اس لئے جس حالت میں بیٹھے تھے اُسی طرح سنتوش نے گھسیٹ لیا کپڑے بھی بدلنے نہ دیئے۔ اتفاق کی بات جیب میں چند آنوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ گھوم پھر کر واپس آ جانا تھا۔ اس لئے اور پیسے لینے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔

گاڑی سٹارٹ ہوئی تو سنتوش کہنے لگا: "چلو راستے میں اجیت سنگھ بیدی کو بھی لیتے چلیں۔" ہمراہ اجیت سنگھ بیدی ہمارے ساتھ دفتر میں کام کرتے تھے۔ ان کو پہاڑ گنج سے لیا اور پھر روانہ ہو گئے۔ جب دوپہر ہو گئی سردار جی نے تجویز پیش کی: "چلو یار آج ذرا گانا وانا ہی سن آئیں۔ کیا خیال ہے آپ سب کا خیال ہے ... رہے ہیں۔"

سنتوش کمار فوراً رضامند ہو گیا مگر میں نے ذرا پروٹسٹ کیا: "یار میں پہلے کبھی گیا نہیں۔ اس لئے مجھے وہاں کے آداب سے واقفیت نہیں۔ چلو کہیں اور چلتے ہیں۔ چھوڑو اس گانے کو۔"

اجیت سنگھ بولا: "چھوڑ یار، تم تو اناڑی ہو۔ اس میں آداب سلیقہ ہے کیا۔ ہماری طرح زمین یعنی قالین پر بیٹھ جانا اور کانوں سے گانا سن لینا۔ کچھ پلے پڑے نہ پڑے سر ہلا ہلا کر داد واہ کرتے رہنا۔ میں تو ہمیشہ ایسے ہی کرتا ہوں۔ بس اتنی سی گل بات ہے آداب سلیقے کی۔ اور پھر جب تم جاؤ گے ہی نہیں تو آداب سلیقہ کیسے سیکھو گے۔"

میں نے پھر کہا: "یہ سب ٹھیک ہے سردار جی، مگر وہ جو پیسوں کا معاملہ ہے وہ کیسے حل ہوگا۔ ہم صرف سیر کرنے کے خیال سے نکلے تھے۔ میری جیب میں اس وقت زیادہ سے زیادہ ساڑھے نو آنے ہوں گے۔ اس سے گانے والی کا کہاں گذارہ ہوگا۔"

سردار جی بولے: "فکر نہ کرو تمہارا حساب کھلوا دیں گے یہ پہلی تاریخ کو نغمی روم کے جن کی طرح پیسے اڑا دیتا۔" سردار جی ہنسنے لگے۔

سنتوش کمار نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک ایک روپے کے دس نوٹ نکالے اور مجھے تھما کر بولا۔ "لو یہ مسئلہ بھی حل ہو گیا۔"

غرض گاڑی اجمیری گیٹ کے پیچھے صاف ستھرے بلڈنگوں کی کھلی گلیوں میں داخل ہوئی۔ سنتوش بڑی

بے فکری اور سہولت کے ساتھ گلیوں میں گاڑی کو اِدھر اُدھر لے جا رہا تھا جیسے یہ سب گلیاں اسے اور اُس کی گاڑی کو زبانی یاد ہوں۔ سردار جی چاہتے تھے کہ گاڑی کسی فلیٹ کے سامنے فوراً رکے۔ مگر سنتوش نہ جانے کہاں جانا چاہتا تھا۔

سردار اجیت سنگھ جی اب بگڑ کر بولے۔ یار یہ گلیاں کہیں ختم بھی ہوں گی۔ اب چلتے ہی جاؤ گے۔ جب پیٹرول ختم ہو گا تو تب رکو گے اب روکو کہیں گاڑی۔

اب اندھیرا ہو گیا تھا گلیوں میں زیادہ تر خاموشی تھی۔ لوگ پیدل آ رہے تھے گاڑیوں میں آ رہے تھے تانگوں میں آ رہے تھے۔ اور سیڑھیوں میں جا کر خاموشی سے غائب ہو جاتے تھے۔ بالا خانوں میں خوب روشنی تھی۔ اور اکثر کمروں سے سازوں اور عورتوں کی سُریلی آواز آ رہی تھی۔ اور کہیں کہیں کسی کسی کمرے میں چھنا چھن چھنا چھن ہو رہی تھی۔ آخر کار گاڑی ایک فلیٹ کے دروازے کے سامنے رکی۔ اور ہم سیڑھیاں چڑھنے لگے۔ سب سے آگے سنتوش کمار تھا اس کے بعد سردار اجیت سنگھ ان کے بعد اقبال حیدر اور سب سے پیچھے میں تھا۔ ایک تو پہلی بار ایسی جگہ جانے کا اتفاق دوسرے یہ سن رکھا تھا کہ اکثر رئیس زادے اصل نشے کی حالت یا باپ دادا کی دولت کے نشے کی حالت میں حد سے گذر جاتے ہیں۔ اور فوراً ہی مار کٹائی سے بھرپور جشن منانے لگتے ہیں۔ ایسے جشن میں شرکت ہمارے بس کا روگ نہ تھا۔ اس لئے میں سب سے پیچھے رہنا چاہتا تھا۔ کہ اگر کہیں وقت آئے تو بھاگنے میں آسانی ہو اور سب سے اول آؤں۔

سردار جی سیڑھیوں کو گالیاں دے رہے تھے۔ "کیا سالی چھوٹی چھوٹی پوڑیاں ہیں۔ کمنے میں نہیں آتیں۔ اور یہ گانے والی سالیاں قطب مینار پر چڑھ کر گاتی ہیں۔ نچلے کے کمروں میں گانے سے ان کو کیا تکلیف ہوتی ہے۔

جب ہم اوپر پہنچے تو کمرے میں مس منی اور سازندوں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔ ہم کو دیکھتے ہی منی بائی فوراً اُٹھیں اور ہماری طرف دیکھ کر سیدھی رکوع میں چلی گئیں۔ اور ہاتھ کا چمچو بنا کر ہاتھی کی سونڈ کی طرح اُوپر نیچے ہلانے لگیں۔ "آیئے آیئے تشریف لایئے سرکار۔ بہت دنوں کے بعد تشریف لائے آنکھیں ترس گئیں۔" کچھ اس انداز سے اس نے ہمارا استقبال کیا کہ میں تو واقعی گھبرا گیا کہ ہم کہاں کی سرکار یا شہزادے

ہیں کہ یہ بچھی جا رہی ہیں اور زبان حال سے کہہ رہی ہیں: چلے بھی آؤ کہ ۔۔۔۔۔۔

منی بائی شکل وصورت کی واجبی سی تھی۔ گو میک اپ تو بہت کیا تھا۔ مگر نقش چھپ نہ سکے تھے۔ ہم تو کیا سردار اجیت سنگھ کو بھی پسند نہ آئی۔

سردار جی آہستہ سے سنتوکش سے کہنے لگے "چھنڈیر، یہ کیا چیز ہے۔ نری جپ ہے۔ اس سے تو سنزل پر ہی اچھے تھے۔ چلو سرک چلیں۔"

منی بائی سنتوکش کار کو عرصے سے جانتی تھی۔ سنتوکش بولا۔ منی بائی۔ تاجی الہ آباد سے واپس آئی کہ نہیں۔ اب تو اس کو گئے ہوئے بہت دن ہو گئے۔

منی بائی نے جواب دیا سرکار آج خط آیا ہے کل شام آئے گی۔

سردار جی بیچ میں بول پڑے۔ "چنگا بھیر۔ جب وہ آئے گی تو ہم بھی آئیں گے۔ تب تک کیلئے چھٹی۔"

منی بائی کے تشریف رکھنے پر زور دینے پر بھی سنتوکش کار یہ کہہ کر واپس ہوا۔ "اچھا تو ہم بھی کل شام آئیں گے۔ کہیں جا رہے تھے۔ تاجی کا معلوم کرنے آ گئے تھے۔ تم تو جانتی ہو تاجی سے ذرا یاد اللہ ہے۔"

ہم سب نیچے اترنے لگے۔ اب سب سے آگے آگے میں تھا۔ ایسے جرنیل کی طرح جو فوج کو سکس فل ریٹریٹ (Successful Retreat) کرا رہا ہو۔

ایک فلیٹ کے سامنے گاڑی رکی۔ سردار جی پہچان کر کہنے لگے "واہ بھئی واہ یہ اول نمبر ڈیرا ہے بس اقبال پتلی کا۔"

ہمیں تو اس طبقے کا علم نہ تھا۔ ہمارے لئے تو ہر ایک اقبال پتلی تھی۔ یہاں پر بھی چلے بھی آؤ کہ۔۔۔۔ والا استقبال ہوا۔ اس گھمنے والی کا ناک نقشہ دلکش تھا۔ ادھر وہ وار بھی مناسب تھا۔ سردار جی کو یہ پہلے ہی پسند تھی۔ مسکرا کر بولے۔ یہ شاندار گل ہوتی نا فس کلاس۔ درجہ اول چیز۔

کمرے میں پہلے ہی چار پانچ گانے کے شوقین حضرات موجود تھے۔ گفتگو کی ابھی محفل جمی ہوئی تھی۔ ہمارے پہنچنے پر محفل اصل رنگ میں آئی۔ شاید کورم پورا ہونے کا انتظار تھا۔ یا یہ مطلب ہو گا کہ ایک وقت میں جتنے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہو سکیں بہتر ہے۔ ہم سب نیم دائرہ کی شکل میں بیٹھ گئے۔ جیسے نیم خانے والے ختم شریف کا

کھانا کھانے بیٹھتے ہیں۔ ان چار پانچ حضرات کے ساتھ اقبال حیدر اس کے ساتھ سردار اجیت سنگھ پھر سنتوش کمار اور میں بالکل دروازے کے پاس میں بیٹھا تھا۔ یہی سوچ کر کہ اگر کہیں کسی نے رنگ میں بھنگ ڈال کر گڑبڑ کر دی تو میں سیڑھیوں میں سے سب سے پہلے باہر۔

کمرہ بہت صاف ستھرا تھا۔ دیواروں پر مشہور گانے والیوں اور فلم ایکٹریسوں کی تصویریں لٹکی ہوئی تھیں۔ فرش پر بڑے بڑے گدوں کے اوپر سفید چاندنی بچھی ہوئی تھی۔ درمیان میں ایک نفیس ایرانی قالین تھا جس پر بالکل کونے میں اقبال پتلی خود براجمان تھی۔ اقبال پتلی واقعی بالکل تیلی کی طرح تھی۔ اس کے پیچھے نیم دائرہ کی شکل میں سازندے بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کا نیم دائرہ ہمارے نیم دائرے کے مقابل تھا۔ ایسا نظر آتا تھا جیسے بیت بازی کا مقابلہ ہو۔ اس نیم دائرہ کے دونوں کونوں پر سارنگی نواز تھے۔ ان کے سر پر پگڑی تھی۔ درمیان میں ایک طرف ہارمونیم نواز اور اس کے ساتھ طبلہ نواز تھا۔ اور اس کے پیچھے ستار نواز۔ ہارمونیم نواز کے سر پر لیاقت کیپ قسم کی ٹوپی تھی اور دونوں ہاتھوں کی تین چار انگلیوں پر انگوٹھیاں تھیں جن میں رنگ برنگے پتھر لگے تھے۔ دونوں ہاتھوں میں پتھر والی زیادہ انگوٹھیاں پہننا شوق کی نسبت زیادہ بیماریاں ظاہر کرتا ہے۔ جس کے استعمال سے قسم قسم کی بیماریوں کا ٹوٹکہ علاج کیا جاتا ہے۔ ستار نواز ننگے سر آنکھیں بند کئے گیان دھیان میں بیٹھا تھا۔

چاروں طرف جگہ جگہ بڑے بڑے گاؤتکیے پڑے تھے۔ قالین پر ایک طرف بہت بڑا پاندان رکھا ہوا تھا۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنا بڑا پاندان کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اور اس دن کے بعد آج تک دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ اور نہ دیکھنے کی خواہش ہے۔ حقیقت میں آج تک ایسی جگہ دوبارہ جانے کا اتفاق بھی نہیں ہوا۔ پاندان کیا تھا بالکل کسی شہنشاہ کے مقبرہ کا گنبد۔

سازندوں نے اشارہ پا کر ساز چھیڑنا شروع کئے۔ تھوڑی دیر بعد اقبال پتلی نے حاضرین کی طرف سوالیہ نظر سے دیکھا۔ جیسے پوچھ رہی ہو کیا پیش کروں۔ سردار اجیت سنگھ نظر پہچان کر بولے۔ گالب کی کوئی چیز ہو جائے حضور گالب کی۔

اس نے سردار جی کے گالب کی مشہور غزل گانی شروع کی جس کا ایک شعر ہے۔

؎ کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ ــــــ ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

ہر شعر پر واہ واہ ہو رہی تھی۔ اور اقبال بتلی واہ واہ کے جواب میں سوائے سجدہ کرنے کے بار بار رکوع میں چلی جاتی تھی۔ اور ہاتھی سونڈ سٹائل پر ہاتھ ہلا ہلا کر آداب آداب کرتی تھی۔ زود پشیمان کے شعر پر سردار اجیت سنگھ نے ہاتھ ہلا ہلا کر سور کی صورت میں بہت داد دی۔ سردار جی بار بار کہتے تھے۔ واہ واہ جو د پشیمان ملئے ملئے جو د پشیمان تعریف کے ساتھ ساتھ نوٹوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایک ایک شعر کی خوب قیمت پڑ رہی تھی۔

غالب کے دیوان اور دیگر تصنیفات کی شاید اتنی قیمت نہ ہوگی جو یہاں پر ایک ایک شعر کی تھی۔ اگر غالب زندہ ہوتے تو اپنے شعروں کی بلیک مارکیٹ دیکھ کر کتنے خوش ہوتے۔ سب دل کھول کر روپے دے رہے تھے۔ اقبال حیدر نے بھی چند ایک روپے دیئے۔ مگر مجھے اللہ تعالیٰ نے توفیق نہ دی کہ میں بھی اقبال بتلی کو کچھ پیش کر کے غالب کا ایک آدھ شعر خریدتا۔ سنتوش نے اشاروں اشاروں میں کچھ کہا بھی کہ بندہ خدا تم بھی کچھ ہمت کر۔ میں نے ہاتھ سے سمجھایا ابھی ٹھہرو۔

اقبال بتلی نے جب آخری شعر گایا۔

حیف اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالب ـــــ جس کی قسمت میں ہو عاشق کا گریباں ہونا

اس شعر پر بلوہ نما شور ہوا اور دیر تک شور ہوتا رہا۔ میں نے سردار اجیت سنگھ کی طرف دیکھا تو وہ جھوم جھوم کر اپنی تائی پر ہاتھ پھیر رہے تھے اور ساتھ ساتھ کہتے جاتے تھے۔ "چار گرہ ہائے چار گرہ کپڑا"۔ غزل ختم ہونے کے تھوڑی دیر بعد تک تعریف ہوتی رہی

سردار جی تعریف میں بولے۔ "آپ بہت چنگا اور سوہنا گاتی ہیں کمال کرتی ہیں کمال سواد آگیا۔" وہ مسکرا کر پھر جھک گئی۔

سردار جی پھر جوش میں بولے "آج اصلی سواد آ گیا۔ گالب کی شاندار غزل گانے والی آپ اور پھر آواز میں بلا کی سوزش، بس غضب ہو گیا۔

اس کے بعد مقبرہ کھول دیا گیا اور ایک چاندی کی طشتری میں پان رکھ کر پیش کئے گئے۔ ان دنوں شاید پیسہ کا ایک پان ہوتا تھا، مگر کہتے ہیں جو لذت اُس پان میں تھی اب کہاں۔ سردار جی نے پان اٹھا کر ہاتھ میں پکڑا اور دیر تک منہ میں نہ رکھا

اقبال بیلی نے مسکرا کر کہا: "سردار جی شوق فرمایئے۔ پان تو آپ کے ہاتھ میں ہی رکھا ہے۔ شاید آپ کھانا بھول گئے۔"

سردار جی سنجیدگی سے بولے: "بادشاہو، جلدی نہیں۔ میں گھر جا کر روٹی کے بعد کھاؤں گا۔" وہ ہنس پڑی۔ بدقسمتی سے نہ مجھے پان کھانے کا شوق ہے اور نہ سلیقہ آتا ہے۔ اسی لئے میں نے بغیر پان اٹھائے شکریہ کہہ دیا۔

ابھی ہم جانے کی سوچ رہے تھے کہ ایک لڑکا کمرے میں آیا اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی ٹوکری تھی۔ اس ٹوکری میں موتیا کے ہار تھے۔ ہار شاید بازار میں دو پیسے کا آتا ہوگا۔ مگر وہ لڑکا ہر ایک کے لئے حضور نواب صاحب، کہکر ہار پیش کرتا۔ اور بے تکلف نواب صاحب سے چار آٹھ آنے وصول کر لیتا۔ لوگ ہار لے کر یا تو اقبال بیلی کو پیش کر دیتے یا اپنے گلے میں ڈال لیتے یا کلائی کے گرد لپیٹ لیتے تھے۔ سردار جی نے جدت کی۔ وہ ہار لے کر مٹھیرے پر چڑھا دیئے اور پان دان کی طرف اشارہ کر کے بولے: "اچھے پانوں کو خوشبو رہے گی۔" اللہ کی مرضی کچھ ایسی تھی کہ لڑکے کی منت سماجت اور لیجئے نواب صاحب کہنے کے باوجود مجھے ہار لینا نصیب نہ ہوا۔

ہاروالا لڑکا ابھی کمرے میں تھا کہ سامنے کے دروازے کا پردہ ہٹا اور ایک ادھیڑ عمر کے آدمی میلی قمیص اور خاکی نیکر پہنے ہوئے تشریف لائے۔ سر پر میلی سی دوپلی ٹوپی تھی پاؤں سے ننگے تھے اور ہاتھ میں حقے کی چلم تھی۔ چہرے سے شرافت ٹپکتی تھی اور وقار نظر آتا تھا۔ مجھے معاً خیال آیا کہ یہ حضور نواب صاحب اقبال بیلی کی نانی خانم کے پاس آتے ہوں گے اور اب بالکل فارغ ہو کر اقبال بیلی کی چلمیں بھر رہے ہیں۔ میرے دل میں آیا کہ میں دس روپے اس کو پیش کر دوں۔ مگر اللہ کی مرضی ہمت نہ پڑی۔ یہ حضرت حقے پر چلم رکھ کر اسی پردے کے پیچھے غائب ہو گئے۔

اب ہم جانے کے لئے اٹھے تو اقبال بیلی بھی فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہماری تشریف آوری کا شکریہ ادا کرتے ہوئے مسکرا کر بولی: "سرکار اب پھر کب تشریف لائیں گے۔ غریب خانے کے دروازے ہر وقت کھلے ہیں۔"

سردارا جیت سنگھ پھر بیچ میں کود پڑے۔ "غریب خانے کے دروازوں کا ہم کو معلوم ہے کہ کھلے ہیں۔ مکرمت کرد فرصت ملے پھر تشریف لائیں گے۔

اقبال بیگی نے کہا "شکریہ۔ نوازش۔ مگر سردار جی روٹی کے بعد پان کھانا نہ بھولئے گا۔" سردار جی سنجیدگی سے بولے۔ "بادشاہو آپ کے ہاتھ کا پان ہے کبھی بھول سکتا ہوں۔ آدھا روٹی سے پہلے کھاؤں گا اور آدھا روٹی کے بعد۔"

ہم اور ہمارے محاورے

بہت سے محاورے ایسے ہیں جو بے موقع استعمال کر دیئے جاتے ہیں. کیونکہ استعمال کرنے والوں کو ان کا مطلب معلوم نہیں ہوتا. یہاں پر چند محاوروں کا مطلب آج کل کے حالات کے مطابق بیان کیا جا رہا ہے اور بعض محاوروں کے ساتھ مثالیں بھی دی جا رہی ہیں تاکہ سمجھنے اور استعمال کرنے میں آسانی ہو۔

۱. جس کی لاٹھی اُس کی بھینس - جس طرح ریڈیو۔ ٹی وی یا کار چلانے کے لئے لائسنس ضروری ہے. اسی طرح بھینس چلانے کے لئے لاٹھی ضروری ہے. لاٹھی کو بھینس کا لائسنس کہا جا سکتا ہے. فرق صرف اتنا ہے کہ بھینس کے لائسنس یعنی لاٹھی کی کوئی فیس نہیں ہوتی. ریڈیو۔ ٹی وی کار کے لائسنس کے لئے فیس ادا کرنی پڑتی ہے. جیسے جیسے ریڈیو اور ٹی وی کے پروگرام تنزل پذیر ہیں۔ ویسے ویسے ان کی لائسنس فیس ترقی پذیر ہے. پہلے سال ڈیڑھ گنی دوسرے سال دو گنی اگر اسی رفتار سے بڑھتی رہی تو خدشہ ہے کہ ایک سال ایسا آئے گا کہ ریڈیو اور ٹی وی کی قیمت سے ان کی لائسنس فیس زیادہ ہو گی۔ ایسے خدشے کو "داڑھی سے مونچھیں بڑی" کہتے ہیں. مطلب صرف اتنا ہے کہ لاٹھی بھینس کا ایک فری اور پرمانٹ لائسنس ہے. مثال کے طور پر اگر ایک شخص مال روڈ پر بھینس لئے جا رہا ہے اور اُس کے ہاتھ میں لاٹھی نہیں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ بغیر لائسنس کے بھینس ڈرائیو کر رہا ہے. ہو سکتا ہے کہ اُس کے پاس بھینس کی رجسٹریشن اور تھرڈ پارٹی انشورنس بھی نہ ہو۔ لاٹھی کو بھینس کی رجسٹری بھی کہا جا سکتا ہے. اگر سامنے

سے ایسا شخص آجائے جس کے ہاتھ میں لاٹھی ہو تو لاٹھی کے اصول کے مطابق بھینس اُس کی ہو جائے گی۔ بعض اوقات بالکل پکی ملکیت ظاہر کرنے کے لئے بھینسوں کے مالک اکثر کاندھے پر لاٹھی رکھ لیتے ہیں۔ اگر کسی شخص کے پاس دو لاٹھیاں ہوں اور بھینس ایک ہو تو وہ کسی اور کی بھینس کا مالک بن سکتا ہے۔ اگر ایک بھینس کے ساتھ دو آدمی ہوں اور دونوں کے پاس ایک ایک لاٹھی ہو تو صاف ظاہر ہے کہ وہ حصہ دار ہیں۔ دونوں آدھی آدھی بھینس کے حقدار ہیں۔ آدھے آدھے دودھ کے اور آدھے آدھے پانی کے بھی۔ یاد رکھیے اس دنیا میں بھینس کے علاوہ اور بھی بہت سی چیزیں اُس کی ہوں گی جس کے پاس لاٹھی ہوگی۔ اکثر لوگ جب پولیس والوں کو خاص خاص موقعوں پر ہلکی پھلکی لاٹھیاں لئے جن کے دونوں طرف ہلکا پھلکا لوہا لگا ہوتا ہے سڑکوں پر پھرتے دیکھتے ہیں تو غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ پولیس والے یا تو بھینسوں کے مالک ہیں یا ان کی تلاش میں نکلے ہیں۔ ایسا ہرگز نہیں ان کی کوئی ڈیری فارم نہیں وہ بیچارے صبح کے چلے صرف ڈیوٹی پر ہیں۔

۲ - بھینس کے آگے بین بجانا۔ بین صرف سانپ کے آگے بجائی جاتی ہے۔ کیونکہ سانپ صرف آگا ہی آگا ہوتا ہے پیچھا نہیں ہوتا۔ پیچھا نہ ہونے کی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ سانپ کا پیچھا مت کرو۔ اگر خدانخواستہ سانپ دستیاب نہ ہو تو پھر لوگ بھینس کے آگے بین بجاتے ہیں تاکہ آؤٹ آف پریکٹس نہ ہو جائیں۔ سانپ پر تو بین کا خاطر خواہ اثر ہوتا ہے لیکن بھینس ایسی بدذوق ہے کہ اگر بین بجائی جاتی ہے تو اس پر کچھ اثر نہیں ہوتا اور سخت تعجب کی بات ہے کہ اگر بین بھینس کے پیچھے بجائی جاتی ہے تب بھی ایک ہی بات ہے۔ اس سے کچھ حاصل نہیں ہوتا نہ آپ کو نہ بھینس کو۔ بلکہ قیمتی وقت ضائع ہوگا۔ آپ کا کم بھینس کا زیادہ۔ ویسے یہ بات بھی تجربے میں آئی ہے کہ مغربی ملکوں کے گوالے اپنی ماڈرن قسم کی گایوں بھینسوں کو آرکسٹرا سنواتے ہیں۔ جسے سن کر وہ مبہوت ہو جاتی ہیں اور دودھ دینے لگ جاتی ہیں اگرچہ ہمارا وطن موسیقی اور آرکسٹرا کا سب سے پرانا گھرانا ہے لیکن یہاں کی گائیں بھینسیں اپنی غیر ملکی بہنوں جیسا مذاق نہیں رکھتیں ورنہ وہ بین کی آواز پر دو چار قطرے دودھ میں اضافہ کرتیں۔

اس محاورے کو ایک دوسرے محاورے کی مدد سے سمجھنے میں آسانی ہوگی لہٰذا وہ ہے "اندھے کے

آگے رونا اپنی آنکھوں کا کھونا ' اندھا رونے والے کے آنسو نہیں دیکھ سکتا۔ صرف آواز سن سکتا ہے اور آواز سے خود اندھا بیچارہ غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اگر آواز مرد کی ہے تو وہ سمجھے گا کہ اُسے راگ الاپ یا خیال' سنایا جا رہا ہے اگر آواز خاتون کی ہے تو وہ اپنے خیال میں ٹھمری' یا جے جے ونتی' سن رہا ہو گا۔ اندھے تو ویسے ہی موسیقی کے رسیا ہوتے ہیں۔ یہاں رونے والا روتا رہے گا اور اپنی آنکھیں کھوتا رہے گا اور اندھا کلاسیکی یا نیم کلاسیکی راگ سنتا رہے گا۔ یعنی بھینس کے آگے بین بجتی رہے گی اور وہ بڑی بے نیازی کے ساتھ جگالی کرتی رہے گی۔ اگر موسیقی کے کسی پروگرام میں حصہ لینے کے لئے بین بجانے کی مشق کی ضرورت ہو تو بھینس سے بہتر سننے والا کوئی نہیں۔ بھینس کی خوبی یہ ہے کہ بین اگر بے سری بھی بجائی جائے تو ٹوکتی نہیں دل شکنی نہیں کرتی بلکہ داد کے طور پر دم ہلاتی رہتی ہے۔

۳۔ سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے۔ یہ خالص تجارتی یعنی کمرشل محاورہ ہے۔ اگر محاورہ تمام کا تمام حرف بحرف درست ہو جائے یعنی سانپ بھی مر جائے اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے تو اس میں سو فیصد منافع ہے۔ اگر لاٹھی بلیک مارکیٹ کی پیداوار ہو یا سمگل شدہ ہو تو دو سو فیصد منافع ہے۔ لیکن اس کے خلاف اگر سانپ بھی نہ مر جائے اور لاٹھی بھی ٹوٹ جائے تو سو فیصد خسارہ ہی خسارہ ہے۔ کراچی میں ایسے کاروبار کو 'کباڑا ہونا' راولپنڈی میں 'بھٹہ بیٹھنا' اور لاہور میں' بیڑی ڈبا' کہتے ہیں۔ اکثر ایسا بھی ہو جاتا ہے کہ سانپ بھی مر جاتا ہے اور لاٹھی بھی ٹوٹ جاتی ہے اس میں نہ نفع ہے اور نہ نقصان جتنے میں کوئی چیز خریدی اتنے میں بیچ دی۔ حساب برابر رہا۔ اسے ہومیوپیتھی کاروبار بھی کہتے ہیں۔ حسرتناک صورت یہ ہے کہ سانپ بھی بچ کر نکل جائے اور لاٹھی بھی ٹوٹنے سے بچ جائے تو ایسی صورت میں لکیر پیٹنی چاہیئے اور ساتھ ساتھ قوالی کرنی چاہیئے' گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر' یہ بول تین بار دہرانے کے بعد ہائے ہائے کہنا لازمی ہے۔

۴ ایک انار سو بیمار۔ طبی لحاظ سے انار کی یہ خاصیت ہے کہ وہ بیماری دور کرنے میں مدد دیتا ہے لیکن محاورے کے لحاظ سے انار بیمار روگ پیدا کرتا ہے۔ یہ حساب کا ایک آسان سا فارمولا ہے کہ جہاں پر ایک انار ہو گا وہاں پر یقیناً سو بیمار ہوں گے اور جہاں دو انار ہوں گے وہاں بیمار بھی دو سو ہوں گے۔

بیمار ... سب دیکھیں تو یقیناً ایک انار خراب ہوگا یا اُس کے چند دانے خراب ہوں گے۔ مطلب صرف اتنا ہے کہ اناروں کی تعداد سے بیماروں کی تعداد کا اندازہ بالکل صحیح لگایا جا سکتا ہے اور جہاں پر کہیں اناروں کا باغ نظر آ جائے تو وہاں پہنچنے کے قریب ہی ایک بہت بڑا خیراتی ہسپتال بھی ضرور ہوگا۔ اُس ہسپتال میں بیماروں کی تعداد باغ کے انار گن کر سو سے ضرب دینے سے معلوم ہو جائے گی۔ اور یہ بھی معلوم ہو جاتے گا کہ کتنے بیڈ کا ہسپتال ہے اور کتنے نادار اور بے کس مریض گنجائش نہ ہونے کے بہانے سے برآمدے میں بھرے ہوئے ہیں۔ ضرب دیتے وقت خیال رکھا جانے کہ ضرب انار پر نہ پڑے ورنہ ٹوٹ جائے گا اور اُس انار کے حصے کے بیمار بھی چلتے بنیں گے۔ انار بیماری دور کرنے میں مدد دیتا ہے۔ لیکن ایک اور سو کے تناسب سے بیمار کیوں پیدا کرتا ہے۔ اس کا جواب تو خیراتی ہسپتال والے ہی دے سکتے ہیں ان کی طرف رجوع کیجئے۔

۵۔ بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی۔ مشاہدے میں آیا ہے کہ جو رجب گھر سے چوری کی نیک نیت سے نکلتا ہے تو صرف لنگوٹی باندھ کر نکلتا ہے تاکہ ... کے لئے۔ موزوں ترین ڈریس ہے۔ یہاں پر اس بات کا خیال رکھیں کہ ہر لنگوٹی پوش کو چور ... کسی اکھاڑے میں لوگوں کو لنگوٹی باندھے ورزش کرتے دیکھیں تو یہ گمان ہرگز نہ کریں کہ وہ چوری کی پریکٹس کر رہے ہیں۔ وہ لوگ پہلوان ہوتے ہیں الاس اور چوروں میں دن رات کا فرق ہے۔ پہلوان دن کو لنگوٹی باندھتے ہیں چور رات کو۔ پہلوان دن کو پریکٹس کرتے ہیں اور چور رات کو۔ تیل کی مالش دونوں کرتے ہیں مگر فرق وہی دن اور رات کا ہے۔ پہلوان زیادہ تر پنجابی ہوتے ہیں۔ اس لئے اگر خدانخواستہ پہلوان کے ہاتھ چور آ جائے تو وہ بے چارے کی دھوں یعنی گردن توڑ کر رکھ دے گا۔ چور چوری سے جاتا رہے گا مگر ہیرا پھیری کر سکے گا۔

چور جب تمام سامان اُٹھا کر بھاگنے لگے تو اُس وقت کوشش کرنی چاہیئے کہ لنگوٹی میں ہاتھ ڈال کر بھاگتے چور کی لنگوٹی کھینچ لی جائے اور جب لنگوٹی ہاتھ آ جائے تو پھر نعرہ بلند کرنا چاہیئے "بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی"۔ اسی طرح کرتے کرتے اور نعرے لگاتے لگاتے جب اچھی خاصی لنگوٹیاں اکٹھی ہو جائیں تو ریڈی میڈ لنگوٹیوں کی ایک دکان کھولی جا سکتی ہے اور بارٹر سکیم کے تحت مال کے بدلے مال سے حاصل شدہ یہ

لنگوٹیاں وہی چور حضرات خرید کر لے جائیں گے جن کے سائیز کی یہ ہوں گی۔ اگر کسی کو یہ بزنس راس نہ آئے تو اس کو چاہیئے کہ وہ لنگوٹی پولیس کے حوالے کر دے۔ اس غرض سے نہیں کہ پولیس خود چوری کرنا شروع کر دے بلکہ اس لئے کہ چور کا سراغ لگانے میں پولیس کو مدد مل سکے وہ معلوم کر سکے کہ کس ٹیلر ماسٹر نے یہ لنگوٹی اسمبل کی تھی اور کس کے لئے کی تھی یا پھر دھوبی مارک نشان دیکھ کر معلوم ہو سکے کہ کس ڈرائی کلینرز سے کس نے ڈرائی کلین کرائی تھی وغیرہ وغیرہ

چور لنگوٹی اس لئے استعمال کرتا ہے کہ اس نیک اور بابرکت پیشے کے لئے اس سے جامع اور ہلکا لباس کوئی دوسرا انہیں پھر نے اہل خانہ کی نیت پر شبہ ہوتا ہے کہ وہ محاورے کی خاطر لنگوٹی پر ہاتھ ضرور ڈالیں گے۔ اس لئے وہ بھی محاورے کا بھرم رکھنے کے لئے لنگوٹی باندھ کر آتا ہے۔ اس بات کا خیال رکھا جائے کہ چور کی لنگوٹی پر ہاتھ اس وقت ڈالا جائے جب وہ بھاگنے لگے بے وقت ہاتھ ڈالنے سے محاورہ غلط ہو جائے گا۔ اکثر لوگ چور کی بجائے "بھاگتے بھوت کی لنگوٹی" کہتے ہیں، اگر بھوت کی لنگوٹی ہاتھ آ جائے تو کیا کہنے وارے نیارے ہو جائیں۔ کپڑے کا مسئلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حل ہو جائے باقی صرف روٹی اور مکان کا مسئلہ رہ جائے اس کا بھی کارساز کوئی ایسا ہی بندوبست کر دے گا۔ انشاء اللہ۔

۶۔ اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی۔ اونٹ میں خاص بات یہ ہے کہ اس میں اونٹیت کم اور کلیں زیادہ ہوتی ہیں۔ بالکل ایسے جیسے پٹواری کی واسکٹ، کم اور جیبیں زیادہ ہوتی ہیں دراصل یہ ایک گھریلو محاورہ ہے اور اونٹ بے چارہ شہر میں ویسے ہی بدنام ہے یہ محاورہ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب ایک شوہر اپنی بہت قیمتی حق مہر والی بیوی کا علاج کراتے کراتے تھک جائے اور بیوی ہر صبح اپنی کسی نئی تکلیف یا بیماری کا رونا رونے لگے کہ آج یہ تکلیف ہے یہاں درد ہے وہاں درد ہے، اس وقت شوہر کے منہ سے بے ساختہ نکلتا ہے اونٹ رے اونٹ تیری کونسی کل سیدھی۔

۷۔ احمد کی ٹوپی محمود کے سر۔ دنیا میں دو قسم کے انسان ہوتے ہیں ایک احمد یعنی ایاز اور دوسرا یعنی محمود سومنات والا۔ بالفاظ دیگر۔ ایک محکوم دوسرا حاکم۔ انکی پہچان یعنی احمد کون ہے اور محمود کون ہے، صرف ٹوپی سے ہو سکتی ہے۔ جس شخص کے سر پر ٹوپی نظر آئے تو سمجھ لیں کہ وہ محمود ہے اور ٹوپی ہرگز

اُس کی نہیں بلکہ احمد کی ہے اور بخشیش تگے سرنظر آنے لوجان ہیں کہ وہ بے چارہ احمد ہے اور اُس کی ٹوپی سومنات کی لوٹ مارہیں محمود لے گیا ہے اور وہ کبھی واپس نہیں کرے گا۔ محمودوں سے بچنے کے لئے لوگوں نے ٹوپی پہننی چھوڑ دی ہے اور آج کل محمود اور احمد آپس میں مِل جُل گئے ہیں اور ان کی پہچان مشکل ہو گئی ہے۔

۸ - ایک دن مہمان دو دن مہمان تیسرے دن بلائے جان - کسی زمانے میں خاص کر جب زمانہ بہت سستا اور بابرکت تھا۔ مہمان کے آنے پر اہلِ خانہ بسم اللہ بسم اللہ کہا کرتے تھے آج کل کے مہنگے زمانے میں اگر مہمان آجائے تو اہلِ خانہ عربی بھول جاتے ہیں اور مہمان جب جانے لگتا ہے تو اہلِ خانہ کو پھر عربی یاد آجاتی ہے۔ اور وہ دل میں "الحمد اللہ" کہتے ہیں۔ پہلے دن مہمان کو ناشتے پر ٹوسٹ مکھن آملیٹ ملتا ہے۔ دوسرے دن ٹوسٹ اور مکھن اور تیسرے دن صرف ٹوسٹ اور اِس وارننگ پر بھی جب مہمان جاتا نظر نہ آئے تو اہلِ خانہ چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے اُلٹے سیدھے بہانے تراشنے لگتے ہیں۔ مثلاً آپس میں اِس زور سے گفتگو کریں گے کہ مہمان دوسرے کمرے میں سن سکے۔ "بھئی ماموں جان بچوں سمیت آرہے ہیں فیملی پلاننگ میں افسرِ پرکار خاص ہیں، مگر پھر بھی ماشاء اللہ گیارہ بچے ہیں اور یہاں پہلے ہی جگہ تنگ ہے کیا کیا جائے۔ یا پھر بیوی والدہ کی بیماری کا بہانہ کرکے سامان باندھ کر ہمسائے کے گھر چلی جاتے اور بلا نے مہمانی پھر بھی نہ ٹلے تو پھر یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے۔

۹ - تمہارے منہ میں گھی شکر - یہ حد سے زیادہ بابرکت زمانے کا محاورہ ہے جبکہ ہر چیز بہت سستی تھی۔ آج کل حد سے زیادہ مہنگائی کے زمانے میں یہ محاورہ بھی بہت مہنگا ہے۔ آج کل لوگ اِس محاورے کو استعمال کرتے ہوئے محتاط ہی نہیں بلکہ ڈرتے ہیں۔ اگر غلطاً یہ محاورہ استعمال کرنا پڑے تو بہت مشکل آجانے کیونکہ آج کل خاص یا ناخالص گھی سستا ملتا ہے اور نہ ہی شکر۔ بہتر تو یہ ہے کہ آج کے دور میں تمہارے منہ میں گھی شکر کی بجائے "تمہارے منہ میں راشن ڈپو" کہہ کر جان چھڑائی جائے۔

۱۰ - دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی - یہ اِس دور کا خالص محاورہ ہے۔ کسی بھی دودھ کو

آنکھیں بند کر کے دیکھ کر، بلا خوف و شبہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہے۔ کیونکہ اس میں تھوڑی سی دودھ کی رنگت اور تھوڑی سی دودھ کی خاصیت ہوتی ہے لیکن اس کا مزہ اور اثر بالکل خالص پانی کا سا ہوتا ہے۔ یہ ایک بات میں دو مزے والی بات ہوتی ہے آج کل کے دودھ کو دودھوں نہاؤ کے لئے بخوبی اور بافراط استعمال کیا جا سکتا ہے۔ سنا کرتے تھے کہ پانی کے اجزا ہائیڈروجن اور آکسیجن ہیں۔ لیکن ہمارے سائنس دانوں نے دریافت کیا ہے کہ تیسرا جز دودھ بھی ہے۔ بہت سے لوگوں نے پانی پینا چھوڑ دیا ہے۔ کیونکہ وہ دودھ میں پانی پی لیتے ہیں۔ یہ ابھی تک معلوم نہ ہو سکا کہ اگر کبھی اصلی پانی کی قلت ہو جائے تو پھر ایسے دودھ سے وضو جائز ہے کہ نہیں۔ اس مسئلہ پر مذہبی امور کے محکمے والے روشنی ڈال سکتے ہیں۔

۱۱۔ ناچ نہ جانے آنگن ٹیڑھا۔ اس محاورے میں لفظ ٹیڑھا استعمال ہوا ہے۔ لیکن یہ بہت سیدھا سا محاورہ ہے۔ سیدھی سی بات ہے کہ جو حضرات ناچنا نہیں جانتے ان کے آنگن ٹیڑھے ہوتے ہیں یا رکھے جاتے ہیں۔ جن کا آنگن سیدھا اور ہموار نظر آئے تو یقین کیجئے کہ وہ ناچنا جانتے ہیں اور ان سے بغیر کسی جھجک کے ناچ کی فرمائش کی جا سکتی ہے۔ ہر گھر کے فرش سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس گھر کے مکین ناچنا جانتے ہیں یا نہیں۔ بڑے لوگوں کے گھروں کے فرش بالکل سیدھے ہوتے ہیں۔ اس لئے آدھی رات کو وہاں میوزک کے ساتھ رمبا سمبا اور فاکس ٹراٹ ہوتی ہے۔ گانے والوں کے ڈیروں میں تمام فرش سیدھے ہوتے ہیں۔ ہیرا منڈی کے سب فرش سیدھے ہی ہیں اور چکنے بھی جن پر ناچنے والے خوب ناچتے ہیں اور دیکھنے والے پھسل جاتے ہیں اور پھر کبھی سنبھلنے نہیں پاتے۔

۱۲۔ آج نقد کل اُدھار۔ اس محاورے کا زیادہ تر تعلق پان سگریٹ کی دکان والوں کے ساتھ ہے اور یہ محاورہ ان کی دکان میں نمایاں جگہ پر شیشے کے فریم میں سجا نظر آتا ہے اس کا صاف مطلب تو یہ ہے کہ آج جو لینا ہے نقد لیجئے اور کل سے اُدھار لیجئے۔ لوگ اس پر عمل کرتے ہیں۔ پہلے دن نقد اور پھر اُدھار حساب شروع کر دیتے ہیں۔ لیکن پھر اس اُدھار کے ادا کرنے کی کل نہیں آتی تو دوکاندار

دوسرا محاورہ "اُدھار محبت کی قینچی ہے" فریم لگوا کر دکان میں رکھ دیتا ہے۔ اُدھار لینے والے کیلئے اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں کہ اب وہ کوئی دوسری دکان ڈھونڈے۔ تاکہ آج نقد کل اُدھار کا محاورہ قائم رہ سکے۔

۱۳۔ نو سو کھا کے بلی حج کو چلی۔ یہ محاورہ اس زمانے کا ہے جب لوگوں کو صرف نو سو تک گنتی آتی تھی۔ آج کل لاکھوں کروڑوں کھا کر حج کو جاتے ہیں اور واپس آ کر پھر لاکھوں کروڑوں کھاتے ہیں اس محاورے پر آج کل دل و جان سے عمل ہو رہا ہے۔ حج کے خواہش مند بلی کی طرح جب تک اپنی مقرر کردہ تعداد تک نہیں پہنچتے۔ حج کیلئے نہیں جاتے۔ مراد اس سے ان لوگوں کی یہ ہوتی ہے کہ جب تک دنیا کی تمام برائیاں انجام نہ دے لی جائیں۔ تب تک حج فرض نہیں یا حج پر جانا نہیں چاہیے۔ یہاں پر ایک خاص طبقے کیلئے یہ محاورہ استعمال ہوتا ہے یہ اصحاب جب تک بلیک مارکیٹ اور سمگلنگ کے تمام مراحل طے نہیں کر لیتے سیل ٹیکس اور انکم ٹیکس کے حساب اوپر نیچے کر کے حکومت کو دھوکا نہیں دے لیتے۔ اپنے غریب عزیزوں رشتہ داروں دوستوں کے حقوق دبا کر حقوق العباد پوری طرح ادا نہیں کر لیتے ان پر حج فرض نہیں ہوتا۔ ان لوگوں کی بلیک کی ایسی پختہ عادت پڑ چکی ہوتی ہے کہ حج کے موقع پر جہاں لبیک کہنے کا موقع آتا ہے تو یہ لبیک کی بجائے بلیک کہتے ہوئے دوڑتے ہیں۔ ان کے خیال میں کچھ خاص فرق نہیں پڑتا کیونکہ 'لبیک' میں حروف تو تمام 'بلیک' کے ہوتے ہیں گو آگے پیچھے ہوتے ہیں اور یہی حضرات حج کے بعد واپس آ کر بلیک کو بلیک کہتے ہیں۔ تعجب ہے کہ نو سو والا حج تو یہ حضرات کرتے ہیں اور بلی مفت میں بدنام ہے۔

۱۴۔ الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے۔ سیدھا چور کوتوال کو کچھ نہیں کہتا۔ چپ چاپ مار کھاتا رہتا ہے لیکن جب چور کو الٹا کر دیا جاتا ہے یا الٹا لٹکا دیا جاتا ہے تو پھر وہ کوتوال کو دعا دینے سے تو رہا۔ اب اس کے ساتھ اس سے زیادہ اور کیا سختی ہو سکتی ہے۔ اسے کس بات کا ڈر کہ چپ کا مار کھاتا رہے۔ اس لئے وہ دل کا غبار نکالنے کے لئے کوتوال کو ڈانٹنا شروع کر دیتا ہے۔ کوتوال کو چاہیئے کہ چور کی ڈانٹ سے بچنے کے لئے اسے الٹا ہرگز نہ کرے۔ مشاہدہ ہے کہ سیدھا آدمی کبھی کسی کو کچھ نہیں کہتا چہ جائیکہ وہ کسی کو ڈانٹے خاص کر کوتوال کو اور وہ بھی آج کل کے کوتوال کو۔

۱۵۔ کوا چلا ہنس کی چال اور اپنی بھی بھول گیا۔ کوا سیاہ ہوتا ہے اور ہنس سفید۔ جب وہ سیاہ کوا

سفید ہنس کی طرح چلنے کی کوشش کرتا ہے۔ یعنی تقلید کرتا ہے تو اُس کی چال سیکھنے کے شوق میں اپنی چال بھول جاتا ہے۔ ہنس کی چال سیکھنا تو ایک طرف اپنی چال بھی کھو دیتا ہے۔ آج کل یہ محاورہ اس وقت استعمال ہوتا ہے جب کالے لوگ یعنی انگریزوں کی مجازی اولاد جب ان کی اندھا دھند تقلید کرتے ہیں۔ سفید لوگوں کی تہذیب اور زبان سیکھنے کے شوق میں وہ اپنی تہذیب اور اپنی خانساموں کی زبان بھی بھول جاتے ہیں۔ تو پھر وہ نہ گھر کے رہتے ہیں نہ گھاٹ کے۔

۱۶۔ مینڈکی کو بھی زکام ہوا۔ زکام دراصل مردانہ بیماری ہے اور ہمیشہ مینڈک اس کا شکار ہوتا ہے۔ یہ محاورہ اس وقت بولا جاتا ہے۔ جب کوئی ایسی بیماری جو مرد کے لئے مخصوص ہو لیکن عورت بھی اس کا شکار ہو جائے۔ مثال کے طور پر مرد کے لئے لازم ہے کہ عورت کے ساتھ اپنی ہو یا غیر بیچ کبھی نہ بولے بلکہ بلبلایا کرے۔ اگر یہی بلغ کی بیماری عورت کو بھی ہو جائے تو کہنا پڑتا ہے تو مئی مینڈکی کو بھی زکام ہوگیا۔

۱۷۔ نیکی کر دریا میں ڈال۔ بزرگوں کا فرمان ہے کہ نیکی کرو تو دریا میں ڈال دو یعنی بھول جاؤ۔ اگر ایسا نہ کرو گے تو جس کے ساتھ تم نے نیکی کی ہے وہ تم کو دریا میں ڈال دے گا۔ نیکی ہمیشہ دریا میں ڈالنی چاہئے کنویں میں ہرگز نہیں کیونکہ نیکی کنوئیں میں تیرتی رہتی ہے دریا میں ڈوب جاتی ہے یا بہ کر کہیں کی کہیں دور چلی جاتی ہے۔

۱۸۔ غریب کی جورو سب کی بھابھی۔ یہ شرف صرف غریب آدمی کی بیوی کو حاصل ہے کہ وہ سب کی بھابھی کہلاتی ہے۔ اگر کسی بڑے آدمی کی بیوی ہو تو بیگم صاحب کہلاتی ہے۔ قدرت کے معجزے خاص کر "ہذا من فضل ربی" سے اگر کوئی غریب آدمی امیر بن جائے تو اس کی بیوی بھابھی سے بیگم صاحب بن جائے گی۔ اور اگر انقلاب زمانہ سے امیر آدمی غریب ہو جائے تو اس کی بیوی بیگم صاحب کی بجائے بھابھی کہلانے کا شرف حاصل کرے گی۔ ویسے بھی دیور اور بھابھی کا پیار مشہور ہے۔

۱۹۔ کند ہم جنس باہم جنس پرواز۔ بڑا آسان سا محاورہ ہے۔ ہر ایک اپنی جنس کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا چلنا پھرنا پسند کرتا ہے۔ کیا انسان کیا جانور۔ اکثر دیکھنے کا اتفاق ہوا ہوگا کہ سڑک پر بھینسیں جا رہی ہیں تو تمام بھینسیں ہوں گی۔ ان میں عورتیں شامل نہیں ہوں گی۔ اگر بھیڑوں کا ریوڑ ہے تو تمام بھیڑیں ہوں گی۔ ان میں جوان لڑکیاں نہیں ہوں گی۔ اگر گدھے جا رہے ہیں تو سب گدھے ہوں گے

ان میں کوئی دانشور شامل نہیں ہوگا۔ ملازمت اور تجارت کے لحاظ سے بھی یہ محاورہ درست ہے۔ اکثر محفلوں اور پارٹیوں میں دفتروں کے لوگ الگ اکٹھے ہو جاتے ہیں اور تجارت پیشہ لوگ الگ۔ جو بلیک وغیرہ کرتے ہیں وہ الگ۔ اس کی سیدھی مثال یہ ہے کہ جو لڑکے امتحان میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اور جو فیل ہو جاتے ہیں وہ الگ ایک جگہ اکٹھے ہو کر ممتحن کو بُرا بھلا کہتے ہیں۔

۲۰ - دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ بات کرتے وقت چاروں طرف دیکھ لینا چاہیئے کہ کہیں دیوار تو پاس نہیں ہے بلکہ بات کرنی ہی اس جگہ چاہیئے جہاں دیوار نہ ہو کیونکہ نہ دیوار ہوگی نہ کان ہوں گے اور نہ کوئی بات سن سکیں گے اور جہاں دیوار ہوگی اس کے پیچھے کان ہوں گے۔ کان کسی اور کے ہوں گے مگر کہلائیں گے دیوار کے۔ غالب نے تجربے کی بنا پر مشورہ دیا تھا کہ 'بے در و دیوار کا اک گھر بنایا چاہیئے'

۲۱ - دیکھئے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ اونٹ کی ساخت کچھ اس طرح واقع ہوئی ہے کہ جس طرف سے بھی دیکھو کروٹیں ہی کروٹیں نظر آتی ہیں زاویے ہی زاویے دکھائی دیتے ہیں۔ اسی لئے یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ اونٹ جب بیٹھنے لگے گا تو کونسی کروٹوں کو نیچے لے گا۔ اُس کے بیٹھنے کا طریقہ بھی عجیب و غریب ہوتا ہے وہ جھکتا کسی طرف ہے ہچکولا کسی اور طرف کھاتا ہے "ٹانگیں مشرق کی طرف لے جاتا ہے اور بیٹھتا ہے جا کر جنوب کی طرف۔ اس لئے اونٹ کا کھڑا رہنا دیکھنے والوں کے لئے اتنا تکلیف دہ" نہیں جتنا اونٹ کو بیٹھتے ہوئے دیکھنا۔ پھر جب دیکھنے والا یہ بھی اندازہ نہ لگا سکے کہ اونٹ بیٹھنے میں جیومیٹری کا کونسا کونسا زاویہ استعمال کرے گا۔

۲۲ - آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔ یہ ایک متبرک محاورہ ہے۔ اس کا تعلق عرب شریف اور ملتان شریف سے معلوم ہوتا ہے۔ جہاں پر کھجوروں کے درخت ہیں۔ آسمان سے گر کر کھجور پر اٹک جانا ایک معجزہ ہے۔ سب سے پہلے آسمان پر جانا معجزہ ہے دوسرے آسمان سے خود ہمت کر کے گرنا معجزہ ہے اور پھر کھجور پر اٹک جانا بھی معجزہ ہے۔ کیونکہ کھجور کا درخت بالکل سیدھا ہوتا ہے اور اُس پر اٹکنے کی کوئی جگہ نہیں لیکن کھجوروں کے لالچ سے انسان خود وہاں پر تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر جاتے یہ الگ بات

ہے۔ یہ محاورہ اس وقت بولا جاتا ہے، جب کوئی شخص ایسی ہی کوئی بات کرے جس میں ایسا ہی معجزہ ہو۔

۲۲۔ رسی جل گئی پر بل نہ گیا۔ یہ ایک فیشن ایبل محاورہ ہے ان خواتین کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ جن کی عمر ۴۵ سال کے اوپر ہو لیکن اس عمر میں بھی اپنا بھی جوانوں کی طرح رکھ رہی ہوں، جوانی کی خوبصورتی کو مصنوعی چیزوں یعنی کاسمیٹک وغیرہ سے پورا کرتی ہوں۔ انہیں دیکھ کر فوراً منہ سے نکلتا ہے رسی جل گئی پر بل نہ گیا۔

۲۴۔ صبر کا پھل میٹھا۔ صبر ایک ایسا درخت ہے جو نظر نہیں آتا۔ اوّل تو اس کو پھل نہیں آتا اگر آتا ہے تو بہت دیر کے بعد کہ اُس وقت انسان خود پھل کھانے کے قابل نہیں رہتا۔ اور جب اس کو پھل آتا ہے تو ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے۔ جیسے یہ درخت نظر نہیں آتا۔ ویسے ہی اس کا پھل بھی نظر نہیں آتا اور آہستہ آہستہ اسی پھل کا انتظار کرنے والا بھی نظر آنا بند ہو جاتا ہے۔

باکمال لوگ لاجواب سروس

بس ٹرانسپورٹ، ویگن، سوزوکی، ٹیکسی چاہے لوکل ہو یا لمبے روٹ پر چلنے والی اُس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ مسافروں کو بہ سہولت تمام منزلِ مقصود تک پہنچا دے۔ مگر دیکھا یہ گیا ہے کہ سہولت اور آرام مسافروں کی بجائے بس کے مالکان کی قسمت میں لکھا ہوتا ہے۔ اور یہ مالک حضرات بڑے بڑے لوگ ہوتے ہیں۔ پہلے تو از قسم گورنر ہوتے تھے۔ بعض کے پاس بس تو ایک نہیں ہوتی تھی مگر روٹ پرمٹ دو دو تین تین ہوتے تھے۔ کاروبار تو ہوٹل کا چلتا تھا۔ مگر ساتھ ساتھ لاہور تک بسیں بھی چلتی تھیں۔ بیگم صاحبہ آرام تو راولپنڈی میں کر رہی ہوتی تھیں۔ مگر ان کی نام نہاد بس گوجرانوالہ سے ملتان تک چلتی تھی۔ ان روٹ پرمٹوں کے لینے دینے میں لینے والے بھی بن گئے اور دینے والے اُن سے بھی زیادہ بن گئے۔ اور جو ان کی بسوں میں سفر کرتے تھے وہ خوب بنائے گئے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب مجھے اس بات کا علم تھا کہ کسی بیگم صاحبہ نے اپنے اور اکلوتے خاوند کے اثر و رسوخ سے گوجرانوالہ سے ملتان تک کا روٹ پرمٹ حاصل کیا ہے تو میں یہ بات متعلقہ حکام کے نوٹس میں کیوں نہ لایا۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ متعلقہ حکام نے ہی تو ان کو روٹ پرمٹ عطا کیا تھا۔ ان کے نوٹس میں لا کر میں ان کے علم میں مزید کیا اضافہ کرتا۔ دوسری خطرناک بات یہ ہے کہ اگر میں ان حکام کے سامنے شور بھی کرتا تو وہ یقیناً مجھے بھی ایک روٹ پرمٹ

عطا کر دیتے اور میری دو وقت کی دال روٹی کا مفت بندوبست ہو جاتا کیونکہ اُس روٹ پرمٹ کا روٹ یقیناً جیل کی طرف ہوتا۔ وہ دور ہی ایسا تھا کہ جو کرتا تھا وہ ڈرتا نہ تھا عیش کرتا تھا۔ جو نہیں کرتا تھا وہ ڈرتا تھا اور پکڑا جاتا تھا اور اُس کی انگریزی میں ایش، بنا دی جاتی تھی۔

بس کے مالک کی حیثیت کا اندازہ بس کی حالت دیکھ کر لگایا جا سکتا ہے۔ بس اگر ٹوٹی ہوئی کھڑکتی اور ناکارہ ہو۔ جھولتی جا رہی ہو۔ تو سمجھ لیجئے کہ مالک کی حالت اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ بہت امیر ہے۔ جھولتی ہوئی بس کے مقابلے میں وہ دولت کے نشے میں جھوم رہا ہوگا مزے کی بات یہ ہے کہ اگر اتفاقاً آپ کی بس کے مالک سے ملاقات ہو جائے تو وہ آپ کے سامنے ٹرانسپورٹ کے بزنس کا رونا رونے لگے گا۔" بزنس خسارے میں جا رہا ہے۔ آج کل روٹیاں چلانی مشکل ہیں۔ وغیرہ وغیرہ یہ سنتے ہی فوراً سمجھ جائیے کہ روٹیوں کی بجائے اُس کی ڈبل روٹیاں چل رہی ہیں۔ اور اُس کا تیسرا بنگلہ سیٹلائٹ ٹاؤن میں بن چکا ہے۔ اور چوتھے بنگلے کی بنیاد اسلام آباد میں رکھی جا رہی ہے۔ خسارے میں جا کر ہر سال نئی کوٹھی اور نئی کار حاصل کرنے کا راز آج تک سمجھ میں نہ آسکا۔

زیادہ تر بسوں کی ٹیکسوں کی حالت بہت خراب ہے۔ ان کے پیچ اور پرزے ڈھیلے ہو کر ایسی ایسی آوازیں نکالتے ہیں جن پر مغربی طرز کے ہنگامہ خیز آرکسٹرا کا گمان ہوتا ہے۔ اور بعض بسیں تو ایسی سریلی آوازیں نکالتی ہیں جیسے تمام غیر ترقی پذیر ملکوں کے ملے جلے ترانے ایک ہی وقت میں بج رہے ہوں۔

ہماری بسوں کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ صرف کھڑکتی ہی نہیں بلکہ ٹوسٹ قسم کے جھٹکے بھی دیتی ہیں۔ ہفتہ بھر کا کھایا پیا ہضم کر دیتی ہیں۔ اگر کھانا ہضم نہ ہوتا ہو تو کسی لوکل بس میں سفر کر کے دیکھ لیجئے۔ اسلام آباد پہنچتے پہنچتے کھانا ہضم ہونا تو ایک طرف بلکہ دوبارہ بھوک لگ جائے گی۔ اس لئے ٹفن کیریر ساتھ لے کر سفر کریں۔ نظر بد دور یہ ہیں ہماری ناصرہ بسیں۔ جس طرح نئے تعمیر شدہ مکان کو نظر بد سے بچانے کے لئے الٹی ہانڈی مکان کے ماتھے پر لٹکائی جاتی ہے۔ اسی طرح ان بسوں کو نظر بد سے بچانے کے لئے بس کے بونٹ پر الٹی دیگ رکھنی چاہیئے۔

ایک بار ایک دوست کے ساتھ فوری طور پر مری جانے کی ضرورت پیش آئی راجہ بازار سے لال رنگ کی بسیں مری جاتی ہیں، بڑی مشکل سے ایک بس میں دو سیٹیں مل گئیں۔ تنگ سیٹوں پر اس طرح بیٹھے تھے جیسے "فکس اپ" کر دیئے گئے ہوں۔ فشار قبر کا گمان ہوتا تھا، نہ میرا دوست ہل سکتا تھا اور نہ میں۔ جب وہ سانس لیتا تھا تو مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں سانس لے رہا ہوں۔ سامنے والی سیٹ کے ساتھ گھٹنے رگڑے جا رہے تھے۔ ٹانگیں پھیلانا تو ایک طرف سیدھی کرنا یا ہلانا بھی مشکل تھا۔ سیٹ میں ایک چھا رستم سپرنگ، بڑی نرمی سے اپنی حاضری کا احساس دلا رہا تھا۔ اُس سے بچنے کے لئے میں نے اپنی بائیں ٹانگ بڑی کوشش سے بائیں طرف کی تو وہ نہ جانے کس طرح دوست کی دائیں ٹانگ کو کراس کر گئی۔ میں نے نیچے نگاہ کی تو مجھے: پتا بایاں جوتا اور دوست کا دائیں جوتا اس پوزیشن میں نظر آئے جیسے ہاکی میں بلی ہو رہی ہو۔ سپرنگ چبھ رہا ہے۔ ٹانگیں ہاکی کھیل رہی ہیں۔ گھٹنے اگلی سیٹ کے ساتھ رگڑے جا رہے، سانس لینا دشوار ہے۔ خون کی گردش بند ہو رہی ہے۔ بس کے اندر کی حالت تو یہ ہے۔ اور بس کے باہر پیچھے موٹے الفاظ میں لکھا ہوا ہے۔ "باکمال لوگ لاجواب سروس"، لاجواب سروس کا تجربہ ہو رہا تھا۔ باکمال لوگ کون تھے۔ بس کے مالکان یا ڈرائیور۔ جنہوں نے بس میں مسافروں کی جز بندی کرنے میں کمال کر دیا تھا۔ یا بس کے مسافر جو کمال صبر کے ساتھ انجام کا انتظار کر رہے تھے۔

گو یہ مسافروں سے چھلکتی ہوئی بس سائے میں کھڑی تھی۔ مگر چلنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ ایک صاحب بس کے پاس کھڑے تھے، انتظامیہ میں سے دکھائی دے رہے تھے۔ ان سے عرض کیا۔ "بس نل ہے اب اس کو یہاں سے سرکا ئیے کافی وقت ہو گیا ہے۔" انہوں نے کرم کیا کہ بس کو سائے میں سے سرکا کر دھوپ میں لے جا کر کھڑا کر دیا۔ اس سے ذرا تنی تسلی ہوئی کہ بس اب چلی ہی جانو۔ دس منٹ بعد ایک صاحب نے آ کر اعلان کیا" جو صاحب بغیر ٹکٹ کے سوار ہیں باہر آ جائیں۔" سب ایک دوسرے کو مشکوک نظروں سے دیکھنے لگے مگر باہر کوئی نہ گیا۔ اب بس میں چیکنگ شروع ہوئی۔ ایک صاحب ایسے نکلے جن کے پاس ٹکٹ تو مری کا تھا مگر تھا اُس بس کا جو مری جا چکی تھی۔ وہ حضرت

ٹکٹ خرید کر شاپنگ کے لئے چلے گئے کیونکہ بس کے چلنے میں دیر تھی۔ بعد میں کسی اور کو ان کی جگہ ٹکٹ دے کر بس روانہ کر دی گئی۔ وہ واپس آگر وال بس کا تصور لئے ہوئے اُس بس میں جو پہلی کی جگہ کھڑی تھی اطمینان سے بیٹھ گئے۔ ان صاحب کو زبردستی اتار دیا گیا۔ مگر بس پھر بھی کھڑی رہی۔ گرمی بھی تھی اور دھوپ بھی۔ یعنی گرمی لاجواب تھی اور دھوپ باکمال۔ اتنے میں ایک پہلوان قسم کے صاحب ملیشیا کے سوٹ میں پاس سے گزرے۔ میں اُن کو ڈرائیور سمجھا مگر وہ مالک نکلے۔ ان سے عرض کیا۔ "جناب ایک گھنٹے سے بس کے چلنے کا انتظار کر رہے ہیں"۔ وہ مطلب سمجھ گئے اور ان کو شاید رحم آگیا۔ ایک لڑکا قریب جا رہا تھا۔ اُس کو آواز دی۔ "اوے کاکا ادھر آ۔ جا ذرا اپناں نوں مری تیکر چھڈ آ۔" مری تیکر چھڈ آ کچھ اس انداز سے کہا جیسے مہمان کو گھر کے دروازے تک چھوڑنا ہو کاکا یہ سن کر اپنا کوٹ لینے چلا گیا۔ تو بس میں سے ایک صاحب نے انکشاف کیا۔ "یہ لڑکا کلینر ہے ڈرائیور نہیں"۔

یہ سن کر ذرا وہم پیدا ہوا کہ مالک صاحب اتنے لوگوں کی جانیں ایک کلینر کے ہاتھ میں دے رہے ہیں۔ پہاڑ کا سفر ہے۔ سڑک بھی سیدھی نہیں بل کھاتی ہوئی اوپر کو جاتی ہے۔ کہیں کاکا بالکل ہی اوپر نہ لے جاتے اور سب کلین ہو جائیں۔ مالک ابھی قریب ہی کھڑے تھے۔

میں نے پھر عرض کی۔ "صاحب یہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ کاکا ڈرائیور نہیں کلینر ہے۔ سوچ لیں اتنی جانوں کا سوال ہے۔ آئندہ سال بھی یہی آسامیاں کام آئیں گی۔ کہیں کم نہ ہو جائیں"۔ مسکرا کر کہنے لگے۔ "بادشاہو گھبراؤ نا۔ اللہ مالک ہے۔ تسی اللہ دا ناں لے کے چلو۔ اُسی دعا گو آں"۔

چلیے فیصلہ ہو گیا مومن کے لئے دعا سے بڑی کیا چیز ہے۔ آپ یقین کیجئے کہ کاکا نے جب انجن سٹارٹ کیا تو بس چلنے سے پہلے اس طرح ڈسٹ کرنے لگی جیسے جہاز ٹیک آف کرنے سے پہلے جھٹکے کھاتا ہے اور پھر قیامت کا شور رہا۔ مجھے تو شک گزرا کہ بس میں پی آئی اے کا انجن نہ لگا ہوا ہو۔ مگر یہ شک جلد دور ہو گیا کیونکہ بس ٹیک آف کرنے کی بجائے واقعی سڑک پر رینگنے لگی۔

ایک بس کمپنی کے مالک نے انکشاف کیا کہ ہر وہ بس چاہے اُس کی مشینری نئی ہو یا پرانی اس سے فرق نہیں پڑتا۔ دکیل انسپکٹر پاس کر دیتا ہے۔ بشرطیکہ قائد اعظم کی تصویر والا

کا فقدان کو پیش کر دیا جاتا ہے۔ اب مسافر اسلام آباد کی بجائے عدم آباد پہنچ جاتے۔ اس کی بلا سے۔

ویسے تو ہر بس کے پیچھے "رفتار چالیس میل فی گھنٹہ" لکھا ہوتا ہے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہوتا ہے: "ہارن دے کر پاس کریں" لیکن اکثر بسیں اسی میل فی گھنٹہ کی رفتار سے پی ڈبلیو ڈی کی ماتم زدہ، زخمی اور سسکتی ہوئی سڑکوں پہ پرواز کرتی جا رہی ہوتی ہیں۔ ان کو ہارن دے کر پاس کرنا تو ایک طرف رہا کوئی تیز سے تیز رفتار کار ان کی گرد کو نہیں پہنچ سکتی۔ میرے خیال میں نہایت مناسب ہو کہ جہاں رفتار چالیس میل فی گھنٹہ لکھا ہوتا ہے۔ اس کے نیچے باریک سا لکھ دیا کریں۔ بسکیل ایک گھنٹہ برابر ہے تیس منٹ۔ تاکہ ۴۰ میل فی گھنٹہ رفتار پڑھ کر اور ۸۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بس جاتی دیکھ کر جو غلط فہمی پیدا ہوتی ہے، وہ سکیل دیکھ کر دور ہو جائے۔ یہ تیز رفتاری کی وجہ ہے کہ اکثر مسافر لوگ منزلِ مقصود پر پہنچنے کی بجائے ہمیشہ کیلئے منزلِ مقصود سے بھی بہت آگے نکل جاتے ہیں، جہاں سے ان کی واپسی کا کوئی امکان نہیں ہوتا۔ ان حادثات میں عموماً یہ دیکھا گیا ہے کہ ڈرائیور تو بال بال بچ جاتا ہے۔ کلینر زخمی ہو جاتا ہے۔ چند مسافر کام آ جاتے ہیں۔ اور باقی زخمی ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے دو ایک ہسپتال جاتے ہوتے زخموں کی تاب نہ لا کر راستے میں دم توڑ دیتے ہیں۔ اور جو ہسپتال پہنچ جاتے ہیں ان میں سے دو تین کی حالت خطرناک ہوتی ہے۔ پولیس پانچ چھ گھنٹے کے بعد فوراً موقع واردات پر پہنچ جاتی ہے۔ اور جو کچھ مسافروں کے پاس راہ گیروں سے بچا کھچا رہ جاتا ہے۔ اس کی کچی لسٹ بنانے لگتی ہے۔ تاکہ دیکھ سکے کہ اب اس کے لئے کیا رہ گیا ہے۔ بس کے نام اور ملکیت پر جو بس کے دونوں طرف لکھی ہوتی ہے۔ مٹی کا پلاسٹر کر دیا جاتا ہے۔ جیسے بس کے نام اور ملکیت کو بہت زیادہ چوٹ لگی ہو۔

اگر کوئی راہ گیر قسمت کا مارا تیز رفتار بس کے نیچے آ کر خود بخود دنیا کی مشکلات سے چھٹکارا حاصل کر لیتا ہے۔ تو اس کا تمام ثواب بس کے مالکوں کو جاتا ہے۔ ٹریفک پولیس

یہ چیک نہیں کرتی کہ حادثے کے وقت بس کس سپیڈ سے جا رہی تھی۔ بلکہ وہ یہ چیک کرتی ہے کہ جو راہ گیر بس کے نیچے آیا وہ کس سپیڈ سے آیا ہے۔ اس کا ٹائم اور سپیس (SPACE) کا اندازہ یقیناً غلط ہوگا۔ جو وہ نیچے آگیا۔ بس کا ڈرائیور تو چھوٹے سے راہ گیر کو دیکھ نہ سکا ہوگا مگر چھوٹا سا آدمی یہ کیسے ممکن ہے اتنی بڑی بس کو آتا ہوا نہ دیکھ سکا ہو۔

چند سال گذرے راولپنڈی کی ایک مشہور بس کمپنی نے ہفتہ میں ایک آدھ حادثہ کرنے کی ہابی اختیار کر لی تھی۔ اُن دنوں میرے ایک فاضل دوست فاضل علی شاہ کو اپنی تیسری بیوی سے سخت شکایت تھی۔ اور اُس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے۔ لیکن بی ڈی سسٹم آڑے آ رہا تھا۔ کپتان ایس اے خان نے ان کو صلاح دی "شاہ جی آپ محترمہ کو فلاں کمپنی کی بس سے ہفتہ میں ایک بار لاہور بھیج دیا کریں۔ انشاء اللہ یہ مسئلہ خود بخود حل ہو جائے گا۔ اور آپ کو نجات حاصل ہو جائے گی اور اگر اُس کا بیمہ کرا کر بس میں سوار کرائیں گے تو چوتھی بیوی کیلئے بری کا بندوبست بھی ہو جائے گا۔"

ایک بار ایک پرائیویٹ بس میں لاہور کا سفر کرتے ہوئے بس کے ڈرائیور سے پوچھ لیا۔ "بھائی اتنی تیز رفتار سے بس کیوں چلاتے ہو۔"

اُس نے معقول جواب دیا۔ "بہت سے ڈرائیور بڑی بے احتیاطی اور غفلت سے بس چلاتے ہیں۔ حادثے کا موجب بنتے ہیں۔ میں ان سے دور رہنا چاہتا ہوں۔ اس لئے ان کے پاس سے یا درمیان میں سے تیزی سے دور نکل جاتا ہوں۔ ان سے جتنا دور رہا جائے اور بچا جائے اتنا ہی اچھا ہے۔"

اگر کوئی ٹریفک کانسٹیبل نہ جانتے ہوئے کسی مالک کی بس سے کبھی تیز رفتاری کا چالان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تو ڈرائیور اُسے فوراً اپنا لائسنس پیش کرتا ہے۔ اُس میں سٹیٹ بنک کا ایک قیمتی سفارشی نوٹ ہوتا ہے۔ اس منہ بولتی سفارش کے سامنے بے بس ہو کر کانسٹیبل ڈرائیور کو آئندہ احتیاط کرنے اور تیزی رفتاری سے بس نہ چلانے کا کہہ کر روانہ

ہونے کا اشارہ کرتا ہے۔ اور اگر ایمانداری سے اپنا فرض بجالاتا ہوا کانسٹیبل چالان کر بھی دے تو لاجواب سروس کے باکمال لوگ" باہر باہر سے فیصلہ کر لیتے ہیں اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کانسٹیبل بے چارے کی ایمانداری کی رفتار سست پڑنی شروع ہو جاتی ہے اور بس کی رفتار تیز تر ہو جاتی ہے۔

بس والوں کو عام شکایت ہے کہ پولیس والے ناجائز تنگ کرتے ہیں۔ خصوصاً ہر ماہ کے آخری تین چار دنوں میں کسی خوشی کے تہوار مثلاً عید شبرات سے دو چار دن پیشتر۔ ہر ماہ کے آخر میں پیسے ختم ہوتے ہوتے ہیں، اور عید پر بچوں کے لئے عیدی کی ضرورت ہوتی ہے۔ بے چاروں کی تنخواہ کم ہوتی ہے گذارہ نہیں ہوتا۔ ان کے برخلاف عام دفتروں کے چپڑاسی جن کی تنخواہ اُن سے بہت کم ہوتی اور رزق کوئی بس ٹیکسی یا تانگے والا ان کے ہتھے چڑھتا ہے نہ جانے یہ لوگ کیسے گزارہ کرتے ہیں۔ پولیس والوں کو چاہیئے ان سے صلاح مشورہ کریں۔ حلال میں برکت کیوں ہوتی ہے وہ سمجھ سکیں۔

جائز اور ناجائز تنگ کرنے کا مطلب میں یہ سمجھتا ہوں کہ اگر کوئی کانسٹیبل اپنی ڈیوٹی ایمانداری سے کرے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ جائز تنگ کرتا ہے۔ اگر بس والوں کی مرضی کے خلاف چلے تو اس کو ناجائز تنگ کرنا کہتے ہیں۔ پولیس والوں کے جائز تنگ کرنے سے شریف لوگ پناہ مانگتے ہیں ناجائز تنگ جب کرتے ہوں گے تو اللہ جانتا ہے۔ ان کا کیا حال ہوتا ہوگا۔ اور کیا حشر ہوتا ہوگا۔

میں بالکل سچ عرض کر رہا ہوں کہ میں دوزخ سے بہت ڈرتا ہوں۔ بہت گھبراتا ہوں۔ امان مانگتا ہوں۔ اس لئے نہیں کہ وہاں سخت اور دردناک عذاب ہوگا۔ مائی کوالٹی کی آگ ہوگی۔ سزا کے لئے بڑی بڑی زنجیریں ہوں گی۔ گرز ہوں گے۔ سانپ ہوں گے اژدھے ہوں گے۔ میں ان سے نہیں گھبراتا۔ بلکہ میری روح تو یہ سوچ کر فنا ہوتی ہے کہ وہاں پر بھی ہماری یہی پولیس ساری کی ساری موجود ہوگی۔ جنت تو ویسے ہی امن وامان کی جگہ ہے۔ وہاں پر تو پولیس کی ضرورت ہی نہیں۔ دوزخ میں تو امن قائم کرنے کی ضرورت ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ حادثے کیوں ہوتے ہیں۔ ان کی وجہ کیا ہے۔ خود بخود تو نہیں ہو جاتے۔

میں نے یہ دیکھا ہے کہ حادثے کی ہر وجہ کے ساتھ اوور (over) کا لفظ ضرور استعمال ہوتا ہے۔

مثال کے طور پر حادثے اوور ٹیکنگ (over taking) کی وجہ سے ہوتے ہیں ایک سوار روپیہ کے لئے ایک بس دوسری بس کو سوا سو میل کی رفتار سے اوور ٹیک کرتی ہے اور ہارن دے کر پاس نہیں کرتی اگرچہ پیچھے موٹے حروف میں لکھا ہوتا ہے ہارن دے کر پاس کریں۔ حادثے کی دوسری وجہ اوور لوڈنگ (over loading) ہے۔ بس میں گنجائش ۵۰ یا ۵۴ مسافروں کی ہوتی ہے۔ مگر ۸۰ سوار کرائے جاتے ہیں۔ کچھ بس میں کھڑے ہوتے ہیں اور کچھ باہر لٹک رہے ہوتے ہیں۔ اگر بس چلے تو بس کی چھت پر بھی بٹھائے جاتے ہیں۔ اتنے بڑے بوجھ کو سنبھالنا بس کے بس کی بات نہیں اور اتنے بڑے بوجھ کو کنٹرول کرنا ڈرائیور کے لئے آسان بات نہیں۔ ہوتا یہ ہے کہ جس طرف بوجھ زیادہ ہوتا بس ادھر لڑھک جاتی ہے، ڈرائیور کیا کر سکتا ہے۔ سوائے فرار ہونے کے۔ تیسری بڑی وجہ اوور سپیڈنگ over speeding ہوتی ہے۔ جو رفتار مقرر ہے، اس سے لگاتار تجاوز کرنا حادثے کا باعث بنتا ہے۔ ہر بات اور ہر چیز کی زیادتی بری ہوتی ہے۔

بعض اوقات ڈرائیور کا بلاوجہ اوور کانشس (over cautious) ہونا حادثے کا باعث بنتا ہے۔ اس سے ڈرائیور نروس ہو جاتا ہے۔ اگر حادثہ نہ بھی ہونا ہو تو ہو جاتا ہے۔

ڈرائیور لوگ کہتے ہیں کہ حادثے کی ایک وجہ خواتین کی ڈرائیونگ ہے۔ وہ نیلی عینک لگا کر ڈرائیونگ کرتی ہیں۔ اور اسی غرور و ناز میں بس میں ٹکر مار دیتی ہیں۔ ایک کمزوری خواتین میں یہ بھی ہے کہ جس طرف اشارہ دیتی ہیں اُدھر ہی مڑ جاتی ہیں اور حادثہ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ بڑے صاحبوں کی بیگمات ہوتی ہیں۔ اس لئے الزام بس کے ڈرائیور پر آ جاتا ہے۔ دوسری وجہ ڈرائیور لوگ کہتے ہیں۔ بڑے لوگوں کے نابالغ بچوں کا بغیر لائسنس کے باپ کی گاڑی تیزی کے ساتھ اندھا دھند چلانا ہے۔ ان سے بس کا بچانا مشکل ہے، وہ کوشش کر کے خود ڈیڈی کی کار بس میں مار دیتے ہیں اور خود کار سے نکل کر بھاگ جاتے ہیں۔ بس کا ڈرائیور قابو آ جاتا ہے۔

ہوسکتا ہے کہ جو کچھ ڈرائیور کہتے ہیں ٹھیک ہو لیکن اگر ڈرائیوروں کا رویہ دیکھا جائے تو سب کا ایک جیسا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر بے فکری سے بس چلانا۔ ہر ایک سے آگے نکلنے کی کامیاب کوشش کرنا اور آگے نکل کر دوسری بس کے ڈرائیور کو فاتحانہ انداز سے دیکھنا اور بار بار مسکرانا۔ اور جب بس تیز رفتاری سے جا رہی ہو اور سامنے سے اینٹوں سے بھرا ہوا ٹرک جسے کلینر چلا رہا ہو آ رہا ہو تو اس وقت جیب سے کے ٹو کی ڈبیا نکالنا اور دو انگلیوں سے سگریٹ کھینچ کر منہ میں نیم دار رکھنا اور پھر ایک ہاتھ سے ماچس کھول کر دو تیلیاں نکال کر اور ان کو جوڑ کر سٹیرنگ پر جھک کر ماچس جلانا سگریٹ سلگانے کی کوشش کرنا مزے کی بات یہ کہ پہلی بار اس کرتب میں کامیاب ہو جانا۔ اور اینٹوں سے بھرے ٹرک سے بھی صاف بچ نکلنا۔ دراصل کامیابی کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھا ہوا مسافر یہ تمام کرتب تیز ہمی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور جلدی جلدی منہ ہی منہ میں درود شریف کا ورد شروع کر دیتا ہے۔ یہ ورد تب تک جاری رہتا ہے۔ جب تک سگریٹ جل نہیں جاتا اور اینٹوں کا ٹرک گزر نہیں جاتا۔

ڈرائیور کو حادثے کا کوئی خوف یا ڈر نہیں ہوتا اس کو اپنے بچوں کے مستقبل کا فکر بھی نہیں ہوتا۔ اس کے بچوں کا مستقبل بالکل محفوظ ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اگر حادثہ ہوا تو وہ حادثے کے اصول کے مطابق بال بال بچ جائے گا۔ اگر اس پہ مقدمہ قائم ہوا تو لاجواب سروس کے باکمال مالک اس کو یہاں پہ بھی بال بال بچا لیں گے۔ اگر خدا نخواستہ دوسرے ڈرائیور کی بے اصولی سے وہ حادثے میں کام بھی آجاتے گا تو اس کے بچے آسانی سے اس بس کمپنی میں دو ماہ کلینر رہ کر ترقی کر کے پورے ڈرائیور بن جائیں گے۔ ڈرائیور بننے کے لئے کسی ڈپلومے یا ڈگری کی ضرورت نہیں۔ آسانی سے حادثے کرنا اور خود ان سے صاف بچ نکلنا سب سے بڑی کوالیفکیشن ہے۔ مالکان ایسے ڈرائیوروں کو بہت پسند کرتے ہیں۔ کیونکہ بسیں بیمہ شدہ ہوتی ہیں اور مسافر غیر بیمہ شدہ۔ مالکان کا کیا نقصان۔ ان کا تو فائدہ ہی فائدہ ہے۔

ڈرائیور اور کلینر مل کر ایک دلچسپ حرکت اور بھی کرتے ہیں۔ ایک دوست کو لاہور سے راولپنڈی آنا تھا۔ بادامی باغ بس سٹینڈ پر ایک بس تیار کھڑی تھی۔ کلینر کے پوچھنے پہ بتا دیا کہ پنڈی جانا

ہے۔ کلینر نے ان کا سوٹ کیس پکڑتے ہوئے کہا: "جلدی آجائیے بس جانے والی ہے۔ جب بس میں بیٹھ گئے تو راولپنڈی کا پورا کرایہ لے کر ایک پرچی تھما دی۔ پرچی پر الٹی لکیریں کھینچی تھیں۔ جیسے ڈاکٹر کا نسخہ ہوتا ہے۔ گوجرانوالہ پہنچ کر اُن سے کلینر نے کہا: "آئیے آپ کو دوسری بس میں بٹھا دوں یہ بس لائلپور جائے گی۔" انہیں دوسری بس میں بٹھا دیا گیا۔ کلینر نے گوجرانوالہ سے پنڈی تک کا کرایہ دوسری بس کے کلینر کو دے دیا اور ساتھ کہہ دیا: "پنڈی کی سواری ہے۔ آرام سے پہنچانا۔" جب وزیرآباد پہنچے تو اُس بس کے کلینر نے کہا: "جناب یہ بس تو سیالکوٹ جائے گی۔ آئیے آپ کو پنڈی کی بس میں بٹھا دوں"۔ اس پر انہوں نے غصے سے کہا: "خدا کا خوف کرو۔ مجھے کسی اغوا شدہ خاتون کی طرح ایک شہر سے دوسرے شہر بیچتے جا رہے ہو یہ کیا مذاق ہے۔"

بس کو اوور لوڈ کرنے کے لئے جو شخص بھی ہاتھ آتا ہے۔ کلینر صاحب اس کو بس میں کھینچ لیتے ہیں۔ بغیر جانے کہ اُس نے کہیں جانا بھی ہے یا نہیں۔ ماڈل ٹاؤن کے باہر فیروزپور روڈ پر ایک بزرگ صورت کھڑے کسی کا انتظار کر رہے تھے۔ اتنے میں لاہور کی طرف سے ایک تیز رفتار بس آکر رکی اور کلینر نے آواز لگائی "کاہنہ قصور۔ کاہنہ قصور" اور ساتھ ہی باباجی کو چادر سے پکڑ کر بس کے اندر کھینچ لیا۔ اور بس روانہ ہو گئی۔ تھوڑی دور جا کر بس اچانک رکی اور باباجی بُرا بھلا کہتے ہوئے بس سے اتر رہے تھے۔

یہ تو ہیں لمبے روٹ والی باکمال لوگوں کی لاجواب بسیں۔ مقامی بس سروس جس کو انگریزی میں اومنی بس کہتے ہیں، اُس سروس کا بھی یہی حال ہے۔ اس بے چاری پر تو مشقِ ستم کی جاتی ہے۔ اہلِ جنوں خاص کر طلبا کو سنگ اٹھاتے ہی بس یاد آجاتی ہے۔ اس بس کا بس سٹینڈ پر انتظار اُسی بے قراری سے کیا جاتا ہے۔ جس طرح شہزادان یا انٹر کا نئی نسل میں کسی ماڈرن بے وفا محبوب کا۔

کھلی فضا میں حفظانِ صحت کے اصول کو سامنے رکھ کر مرغ کی طرح ایک ٹانگ پر کھڑے ہو کر اومنی بس کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ انتظار کی مدت کا تعین کرنا ممکن نہیں۔ یہ بس سٹینڈ پر بس کی تشریف آوری

پر منحصر ہے۔ بس سٹینڈ کچھ اس انداز سے غالب کے مصرعے کو مدِ نظر رکھ کر بے درو دیوار اور بغیر چھت کے تعمیر کئے گئے ہیں کہ گرمیوں میں انسان دھوپ سے لطف اندوز ہو سکتا ہے۔ سردیوں میں تازہ سرد ہوا سے اور برسات میں اللہ کی رحمت سے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بس سٹینڈ ایم ای ایس کے اسی ٹھیکیدار کی اولاد سے بنوائے گئے ہیں جس نے حضرت غالب کو بے درو دیوار بنگلہ بنا کر دیا تھا۔ اگر آج غالب زندہ ہوتے تو ہر بس سٹینڈ کو اپنا گھر سمجھنے اور ان کو اس جائیداد پر بے اندازہ ٹیکس ادا کرنا پڑتا۔ شاعری کرنے کی بجائے ٹیکس کی بچتوں کے سلسلے میں میونسپل کمیٹی اور کنٹونمنٹ بورڈ کے چکر لگاتے رہتے اور بیٹیاں بھگتے بھگتے تمام عمر گزار دیتے اور آخر میں یہ کہہ کر "موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں" جاں بحق ہوتے۔

ریلوے کے ٹائم ٹیبل کی طرح بسوں کے اوقاتِ کار کا بھی ایک چارٹ ہوتا ہے۔ متحدہ پنجاب میں این ڈبلیو آر کا ٹائم ٹیبل حجم میں آدھا ہوتا تھا۔ پاکستان بننے کے بعد ٹائم ٹیبل حجم میں ڈبل ہو گیا اور پنجاب آدھا رہ گیا۔ ریلوے نے جتنی ٹائم ٹیبل میں ترقی کی ہے اور کسی بات میں نہیں کی۔

بسوں کی آمد و رفت کا وقت چارٹ پر تو بالکل ٹھیک نظر آتا ہے کہ بس نمبر ۱ پورے دس بجے فلاں جگہ پہنچے گی اور اتنے بجے دوسری جگہ۔ لیکن بسیں اپنے ایک مستقل اصول کے تحت چلتی ہیں۔ اصولاً ہمیشہ لیٹ چلتی ہیں، لیٹ آتی ہیں اور لیٹ پہنچاتی ہیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح ہماری ہر محفلِ مشاعرہ میں خواتین و حضرات لیٹ آتے ہیں اور مہمانِ خصوصی بھی لیٹ آتے ہیں۔ اور پھر مشاعرہ لیٹ شروع ہوتا ہے۔ اور لیٹ ختم ہوتا ہے۔ جب انسان جو اشرف المخلوقات کہلانے پر فخر کرتا ہے۔ اس کا یہ حال ہے تو ایک بے جان بس اگر وقت کی پابندی نہ کر سکے تو باعثِ تعجب نہیں۔

بسوں کی کئی قسمیں ہیں۔ مجھے صرف دو تین قسموں کا علم ہے۔ ایک بس تو وہ ہوتی ہے۔ جس کی دونوں سائڈ پر بیٹھنے کے لئے نشستیں ہوتی ہیں۔ اور درمیان میں کھڑا ہونے کے لئے بہت کم جگہ ہوتی ہے۔ یہ اصل بس ہوتی ہے۔ لیکن اس میں بھی مسافر بھر دیئے جاتے ہیں۔ جو اس بس کے ساتھ بہت زیادتی ہے۔

ایک اور قسم کی بس لاہور میں دیکھنے میں آتی ہے۔ اس بس میں ہر کھڑکی کے ساتھ ایک سیٹ ہوتی ہے۔ اور درمیان میں تمام جگہ میدان کی طرح خالی ہوتی ہے۔ اس میں بیٹھنے کا انتظام کم اور کھڑے ہو کر نکلنے کا پورا پورا بندوبست ہوتا ہے۔ اہل لاہور اس کو 'ویڑے والی بس' کہتے ہیں۔ 'ویڑہ' پنجابی زبان میں صحن کو کہتے ہیں۔ اس لفظ کو بابا بلھے شاہ نے خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔ "ویڑے آ وڑ میرے" یعنی میرے صحن میں آ۔ کمرے کے اندر نہیں۔ اس بس کی چھت کے درمیان لوہے کی ایک لمبی اور موٹی سلاخ لگی ہوتی ہے۔ یہ سلاخ کھڑے ہوتے مسافروں کو بیٹھے ہوئے مسافروں پر گرنے سے بچاتی ہے۔ اس بس میں مہذب ملک کے مہذب شہر میں مہذب انسان سلاخ کے ساتھ اس طرح جھولتے جاتے ہیں۔ جیسے غیر مہذب بکرے لٹکے جا رہے ہوں۔

ایک بس دو منزلہ ہوتی ہے۔ اس کو 'ڈبل ڈیکر' اور اہل لاہور اس کو کوٹھے والی بس کہتے ہیں۔ اس میں کافی لوگ سما سکتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ شروع شروع میں جب یہ بس امرتسر میں چلی تھی تو ایک صاحب اوپر کی منزل میں چلے گئے۔ جب بس چل پڑی تو بہت تیزی کے ساتھ گھبراتے ہوئے نیچے کی منزل میں بھاگ آئے۔ لوگ حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔ وہ کہنے لگے "اوپر ایکسیڈنٹ کا سخت خطرہ ہے۔ وہاں کوئی ڈرائیور تو ہے نہیں۔"

ادمنی بس کی ایک خاص خوبی یہ ہے کہ آبادی کے عین درمیان ایک ایک فرلانگ کے فاصلے پر موسلا دھار دھواں چھوڑتی جاتی ہے۔ یہ دھواں صرف ڈاکٹروں کے لئے فائدہ مند ہے۔ ان کی آمدنی میں نمایاں فرق ڈالتا ہے اور سینی ٹوریم کی آبادی بڑھانے میں مدد دیتا ہے۔ اگر ہم خالص گھی کی جگہ ڈالڈا استعمال کر سکتے ہیں۔ خالص دودھ کی بجائے امریکہ سے مفت آیا ہوا پاؤڈر والا دودھ اپنے گوالے سے قیمتاً لے کر پی سکتے ہیں تو پھر کیا وجہ ہے کہ خالص ہوا کی جگہ ان بسوں کا دھواں ہوا میں ملا نہیں کھا سکتے اور وہ بھی مفت میں۔

نئی بسیں آنے کے باوجود بسوں کی تعداد دن بدن کم ہونے کی وجہ سے رش بہت زیادہ ہوتا ہے۔ بس کے اندر کا سماں عوام کے لئے تکلیف دہ ہوتا ہے۔ لیکن جیب خرچ حاصل کرنے والے طبقے کیلئے

بہت فائدہ مند۔ یہ نامور طبقہ اس طریقے اور صفائی سے جیب تراشی کرتا ہے کہ مسافر کو علم تک نہیں ہوتا۔ مگر بار کر بے چارے کو معلوم ہوتا ہے کہ اس کی جیب ہی نہیں کاٹی گئی بلکہ نلنے کے دن ایک چھٹانک گول بوٹی بھی خوبصورتی سے کاٹ لی گئی ہے۔ اس آرٹ میں جو ہماری قوم نے ترقی کی ہے۔ وہ قابل رشک ہے۔

بس کے کنڈکٹر کو یہ سہولت بھی حاصل ہے کہ وہ تنخواہ کے علاوہ ہر روز تھوڑی سی رقم فضل ربی کا بغیر کسی کوشش کے مالک بن جاتا ہے۔ ہر مسافر کو دو تین ٹیڈی پیسوں کا بقایا نہیں ملتا۔ کیونکہ کنڈکٹر کے پاس روا جاً چینج نہیں ہوتی۔ ایک ایک قطرہ سے دریا بنتا ہے اور ایک ایک ٹیڈی پیسے سے روپیہ۔ بقول ٹی وی والوں کے یہ نیک پروگرام کنڈکٹر ڈرائیور کے تعاون سے پیش کرتا ہے۔

ہمیں اس بات پر فخر ہے کہ ہماری بسیں متبرک اور تاریخی ہیں۔ متبرک اس لئے کہ ہمارے باپ دادا کی عمر سے بھی بہت بڑی ہیں۔ اس لئے قابل احترام بھی ہیں۔ اور تاریخی اس لئے کہ آج تک معلوم نہ ہو سکا کہ کس تاریخ کو پیدا ہوئی تھیں اور کتنی حکومتوں کے دور دیکھ چکی ہیں اور کتنی حکومتوں کا دور ابھی دیکھنا ہے۔

یہ عمر کا تقاضا ہے کہ ان کی بینائی اور رفتار میں فرق پڑ گیا ہے۔ رفتار کیا ہے خرام ناز ہے۔ کراچی کے ایک صاحب کراچی کی بہت تعریف کر رہے تھے۔ ان کا مطلب تھا کہ کراچی بہت بڑا اور وسیع شہر ہے۔ اس کے ثبوت میں کہنے لگے "اگر آپ صبح کے وقت کراچی شہر کے ایک سرے سے بس میں سوار ہوں تو شام تک آپ آدھا شہر بھی نہ دیکھ پائیں گے"۔

یہ سن کر پنڈی کے ایک صاحب فخریہ بول اٹھے "یہ کونسی خوبی کی بات ہے ایسی تھرڈ کلاس بسیں تو ہماری راولپنڈی میں بھی بے شمار چلتی ہیں"۔

لاکھوں میل کی مسافت طے کرنے کی وجہ سے ہماری بسیں کچھ اس طرح تھک گئی ہیں کہ چلتے چلتے اچانک رک جاتی ہیں۔ یعنی "بیٹھ جاتی ہیں"۔ جہاں دھوپ گھنی ہوتی ہے ایسی تھکی ہوئی بسیں مختلف سڑکوں

پر اکثر بیٹھی ہوئی دیکھی جا سکتی ہیں، ہر ممکن کوشش کے باوجود ہلنے کا نام نہیں لیتیں۔ گدھے کی طرح اَڑ جاتی ہیں۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ اَڑنے کی عادت بس نے گدھے سے سیکھی ہے یا گدھے نے بس سے۔ اہلِ نجر کا کہنا ہے کہ اومنی بس کے راولپنڈی میں آنے سے پہلے یہ عادت گدھوں میں ہرگز نہیں تھی۔ صاف ظاہر ہے کہ پھر یہ عادت کس نے کس سے سیکھی ہے۔

مجھے کچھ کچھ یقین ہے کہ یہ حالات اب زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہیں گے۔ حالات روبہ اصلاح ضرور ہوں گے۔ ملک کی مشینری بدل گئی ہے۔ بسوں کے نام نہاد نااہل مالکوں اور الجرب ناکارہ بسوں کی مشینری بھی انشاء اللہ ضرور بدلے گی۔ آج کل جو سہولتیں اور آرام بس کے مالکوں کو حاصل ہے۔ ایک دن ایسا آئے گا کہ یہ تمام سہولتیں اور آرام مسافروں کو میسر ہوں گے۔ ہماری بسیں آرام دہ ہوں گی۔ وقت پر چلیں گی اور ان کی سروس قابلِ رشک ہو گی۔

آیئے ہم سب اس سنہری دن کا بس سٹاپ پر کھڑے ہو کر انتظار کریں۔

ایجوکیٹرز کلب راولپنڈی کی ایک شام

ایجوکیٹرز کلب راولپنڈی میں کچھ نہ کچھ ہوتا ہی رہتا ہے اس کلب کی بہت سی خوبیاں ہیں پہلی خوبی تو یہ ہے کہ اس کلب میں پڑھانے والا طبقہ کم اور دوسرا زیادہ ہے یہ کلب کی فراخدلی کی دلیل ہے۔

دوسری خوبی یہ ہے کہ اس کلب کا پروگرام دوسرے کلبوں کی نسبت کم دیر سے شروع ہوتا ہے کم از کم ایک ڈیڑھ گھنٹے کا ضرور فرق ہوتا ہے اس سے کافی وقت بچتا ہے۔

تیسری خوبی یہ ہے کہ پروگرام عموماً تلاوتِ قرآنِ پاک کے بغیر شروع ہوتا ہے جس سے وقت کی مزید بچت ہوتی ہے۔

چوتھی خوبی یہ ہے کہ گذشتہ میٹنگ کی کارروائی نہیں پڑھی جاتی جس سے مزید وقت بچ جاتا ہے۔

پانچویں خوبی یہ ہے کہ رپورٹ وغیرہ اگر پڑھی بھی جاتی ہے تو اس پر سوال جواب نہیں ہوتے بحث نہیں کی جاتی اس سے وقت کی اور زیادہ بچت ہوتی ہے مجھے یقین ہے کہ ایجوکیٹرز کلب والوں نے اسی طرح وقت بچا بچا کر بُرے وقت کے لئے بہت سا وقت اکٹھا کر لیا ہوگا۔

چھٹی خوبی یہ ہے کہ اس کلب والے چائے اور دیگر کھانے پینے کا انتظام نہایت عمدہ

کرتے ہیں اور پورے وقت پر شروع کرتے ہیں اہل کلب اگر چاہیں تو آسانی سے ریلوے ٹی سٹالوں اور ریلوے ڈائنگ کار کا ٹھیکہ لے سکتے ہیں۔

ساتویں خوبی یہ ہے کہ چندہ تو صرف تین روپیہ ماہوار ہے لیکن ہر ماہ تقریباً پانچ چھ روپے کی چائے اور دیگر لوازمات ہر ممبر کو کھلا پلا دیتے ہیں۔ ایسی حالت میں ریلوے ڈائنگ کار کا ٹھیکہ کسی حد تک سودمند ہو سکتا ہے یہ وہ خود سوچ لیں۔

آٹھویں خوبی یہ ہے کہ مہمانِ خصوصی عام طور پر بروقت آتا ہے۔ اور آکر کلب کے ممبران کا استقبال کرتا ہے۔ یہ خوبی کسی اور کلب میں نہیں۔

نویں اور سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر تقریب میں مہمانِ خصوصی کوئی کار آمد وزیر یا کم از کم سیکرٹری قسم کا صاحب ہوتا ہے۔ ان سے کلب کے ممبران کا مفت میں تعارف ہو جاتا ہے۔ اور یہ تعارف کبھی کام دے سکتا ہے۔ لیکن کلب کے صدر صاحب سے خاص تعارف ہوتا ہے۔ جو آئندہ دنوں میں ان کا زیادہ اور کلب کا کم کام کرتا ہے۔ کیونکہ صدر کے پاس ذاتی الو ہوتے ہیں اور کلب الووں سے بے نیاز ہے۔ اس لئے وہ کس چیز کو سیدھا کرلے۔

۳۰ رجون ۱۹۶۶ء کی شام کو کلب کا سالانہ اجلاس تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی کلب کے افسران کا چناؤ بھی ہونا تھا۔ کلب کے اصول اور معمول کے مطابق قاضی انوار الحق صاحب وزیر تعلیم بطور مہمانِ خصوصی تشریف لائے تھے۔

سُنا ہے کہ گذشتہ سالوں کی کلب کی صدارت کی ہسٹری کچھ اس طرح ہے۔ کہ ایک سال مسز نفیسہ احمد کلب کی صدر منتخب ہوئیں اور دوسرے سال خواجہ مسعود صاحب کلب کے صدر بنائے گئے۔ تیسرے سال ڈاکٹر مس کنیز یوسف کلب کی صدر چنی گئیں تو چوتھے سال پھر صدارت کے لئے خواجہ مسعود کا نمبر آگیا۔ پانچویں سال مسز خواجہ مسعود یا کوئی اور مسز کلب کی صدر بنائی گئیں تو چھٹے سال صدارت کا قرعہ فال خواجہ مسعود کے نام پڑا۔

صاف ظاہر ہے کہ ہر سال اس کلب کے صدر نہیں بدلے جاتے بلکہ ان کی جنس بدلی جاتی

ہے اور خواجہ مسعود کلب میں وہی کام دیتے ہیں۔ جو قوالی میں ٹیپ کا مصرع کام دیتا ہے خواجہ صاحب کی خاص خوبی یہ ہے کہ بیک وقت مثبت اور منفی کردار کرنے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ کسی نے جارج برنارڈ شا سے پوچھا تھا کہ دنیا میں چھ دانشوروں کے نام بتائیے تو انہوں نے فوراً فرمایا تھا کہ ایک تو جارج برنارڈ شا ہے۔ دوسرا برنارڈ شا اور تیسرا شا جارج برنارڈ ہے چوتھا شا برنارڈ جارج، پانچواں برنارڈ جارج شا ہے اور چھٹا دانشور جارج شا برنارڈ ہے۔

جہاں تک ایجوکیٹرز کلب کی صدارت کا تعلق ہے خواجہ صاحب کی حیثیت بھی جارج برنارڈ شا سے کچھ مختلف نہیں ہے۔

لکھنے پڑھنے کا کام سیکرٹری کا ہوتا ہے۔ سیکرٹری کوئی بھی چنا جائے۔ مگر صدیق اکبر صاحب پلے بیک سنگر کی طرح پس پردہ سیکرٹری کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ صدیق اکبر صاحب کے ہوتے ہوئے کسی سیکرٹری کو اپنے کام کی فکر نہیں ہوتی۔

کلب کا الیکشن برائے نام تھا۔ کیونکہ الیکشن 'غائبانہ' ہو چکا تھا۔ بلکہ اسی طرح جیسے نکاح کی رسم پہلے ہوتی ہے اور رخصتی بعد میں سب سے پہلے جنرل سیکرٹری صاحب نے اپنی سالانہ رپورٹ اردو میں پڑھی۔ جس میں زیادہ تر ان کارناموں کا ذکر کیا جو وہ کر نہ سکے تھے انہوں نے اس بات کا شکوہ کیا کہ کلب کے ممبران سے چندہ وصول کرنا اتنا ہی مشکل ہے۔ جتنا کمیٹی کے نل سے آج کل پانی حاصل کرنا۔ اس میں سے پھر بھی چند قطرے کبھی ٹپک پڑتے ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ منت سماجت سے لے کر رعب داب تک کا نسخہ استعمال کیا گیا۔ مگر کارگر نہ ہوا۔ ہومیوپیتھی اور ہمدرد دواخانہ کی حکمت کے کئی نسخے ممبران پر استعمال کئے گئے۔ مگر چندہ ادا نہ کرنے کی بیماری ایسی پرانی اور لاعلاج ہے کہ کوئی بھی علاج کارآمد ثابت نہ ہوا۔ سیکرٹری صاحب نے اتنا تو بتا دیا کہ سال بھر میں کتنا چندہ وصول ہوا ہے۔ لیکن یہ بتانے سے احتراز کیا کہ کتنا چندہ وصول نہیں ہوا اور کن لاعلاج مریضوں سے وصول نہیں ہوا۔ وصول شدہ چندے کی لسٹ مختصر تھی پڑھ دی گئی۔ اور

نادہندگان کی لسٹ بہت طویل تھی وقت کی کمی کی وجہ سے اس کا نہ پڑھنا بہتر تھا۔

سیکرٹری صاحب کے بعد اُوٹ گوئنگ، صدر ڈاکٹر مس کنیز یوسف نے انگریزی میں خطاب کیا۔ جو کچھ سیکرٹری صاحب نے اردو میں کیا تھا اس کا انہوں نے بامحاورہ انگریزی میں ترجمہ کر دیا۔ لیکن چند ایک باتیں انہوں نے مہمان خصوصی کے گوش گزار کیں۔ پرانے عہدہ داروں کے تعاون کا شکریہ ادا کیا اور دان گمنگ، صدر خواجہ مسعود اور دیگر افسران سے درخواست کی کہ جن کارناموں کو وہ اور ان کا شاف انجام نہ دے سکا اب ان کارناموں کو خواجہ صاحب اور ان کی پارٹی پورا کرنے کی کوشش کرے۔ اس کے بعد ڈاکٹر مس کنیز یوسف نے نئے عہدیداروں کا تعارف مہمانِ خصوصی سے کرایا۔ ڈاکٹر صاحبہ نام پکارتی تھیں۔ تو نئے عہدہ دار اپنی نشست سے اُٹھ کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ اور مہمان خصوصی اور مہمان عوامی انہیں جی بھر کر دیکھ لیتے تھے لیکن افسوس آدھے سے زیادہ عہدہ دار غیر حاضر تھے۔ الیکشن غائبانہ ہو جانے کی وجہ سے انہوں نے بھی غائب رہنا پسند کیا۔ اور ہم نے بھی ان کی غائبانہ نماز، پڑھ دی۔

آخر میں ڈاکٹر مس کنیز یوسف نے نئے صدر خواجہ مسعود کو کرسی صدارت کی جنس تبدیل کرنے کی درخواست کی۔ خواجہ صاحب بچارے کب سے اس درخواست کا انتظار کر رہے تھے انہوں نے فوراً منظور کی۔ خواجہ صاحب نے بھی انگریزی میں خطاب کیا۔ پرانے عہدہ داروں کے کارناموں کی بے حد تعریف کی۔ اور اعتراف کیا۔ کہ انہوں نے کلب کے لئے بہت کچھ کیا اور یقین دلایا کہ جو کام باقی رہ گئے ہیں انہیں وہ اور ان کی پارٹی سرانجام دے گی حیرت اس بات کی تھی کہ پرانے سیکرٹری جنرل صاحب نے صاف صاف سلیس اردو میں کہہ دیا تھا کہ ان سے کوئی نمایاں کام نہ ہو سکا۔ لیکن خواجہ صاحب نے انگریزی میں انکشاف کیا کہ پرانے عہدیداروں نے بہت سے قابلِ تعریف کارنامے سرانجام دیئے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کارنامے انگریزی میں انجام دیئے گئے ہوں۔ جن کو صرف خواجہ صاحب سمجھ سکے ہوں خواجہ مسعود صاحب نے ڈاکٹر مس کنیز یوسف کی طرح چند گزارشات مہمان خصوصی کے گوش گزار کیں۔ مہمان خصوصی

نے ان گذارشات کو بزیرانہ گوش سے تحمل کے ساتھ سنا۔ اور معمول کے مطابق ایسی گزارشات جو وہ گذشتہ کئی مختلف تقاریب نہ سنتے آئے تھے۔ ناموں کی تبدیلی اور تھوڑے بہت ردوبدل کے ساتھ ان کا مناسب جواب دیا۔ اور تقریب سے رخصت ہوگئے اب کہیں دوسری جگہ میٹنگ یا پارٹی تھی۔ مہمان خصوصی کے جانے کے بعد صاحب صدر نے اعلان کیا کہ دس منٹ کے وقفے کے بعد ایک آرکسٹرا جس کا انہوں نے خاص طور پر انتظام کیا تھا پیش کیا جانے گا خواجہ صاحب ابھی یہ اعلان کر ہی رہے تھے۔ کہ پاس کی مسجد کے لاؤڈ سپیکر سے عصر کی نماز کی اذان کی آواز گونجی اور ساتھ ہی چند اصحاب ساز سنبھالتے ہوئے سٹیج پر سے گذرتے ہوئے برآمدے میں چلے گئے اس منظر کو دیکھ کر مجھے فوراً یہ مصرعہ یاد آیا۔

اذان اس نے چھیڑی تھے ساز دنیا

دس منٹ کے وقفے کے بعد آرکسٹرا سٹاف سازوسامان کے ساتھ سٹیج پر براجمان ہوگیا۔ خواجہ مسعود صاحب نے تعارف کراتے ہوئے فرمایا۔ جس دن حکومت نے کالجوں اور سکولوں میں گانے بجانے پر پابندی لگائی تھی۔ اسی دن انہوں نے اس آرکسٹرا کی تشکیل کی تھی اور کمشنر صاحب بہادر نے اس فن کو مزید ترقی دینے کے لئے ایک ہزار روپیہ منظور کیا ہے۔ اب یہ آرکسٹرا ایجوکیٹرز کلب کا ایک جزو ہے۔ میں اسے صدارت کی کرسی سنبھالنے پر خواجہ صاحب کا پہلا کارنامہ سمجھتا ہوں۔ وہ اس لئے کہ حکومت کی پابندی کے باوجود بقول ان کے انہوں نے اس گانے بجانے کے سلسلے کو جاری رکھا۔ اور اسی حکومت سے اسی مقصد کے لئے ایک ہزار روپیہ بھی حاصل کیا۔ مزے کی بات یہ تھی۔ کہ یہ راگ رنگ کی محفل سی بی گرلز کالج میں افتتاحی جاری تھی اور خواجہ صاحب کے اعلان کے مطابق یہ بات اطمینان بخش تھی کہ یہ آرکسٹرا ایجوکیٹرز کلب کا "ٹوٹ رنگ" تھا۔

آرکسٹرا کے تمام افراد سوائے طبلہ نواز کے سب شوقیہ فن کار تھے۔ اور روحانی مسرت اس بات سے بھی ہوئی کہ آرکسٹرا میں ایک مولانا نے نواز بھی تھے۔ استاد داغ کا ایک شعر ہے۔

ع جو گزرتی ہے سینۂ نَے پر   وہ لبِ نَے نواز کیا جانے

مولانا بڑی محبت اور بڑی نرمی سے نَے نوازی کر رہے تھے کہ بنسری بجتی بھی دکھائی دیتی تھی اور بے آواز بھی تھی۔ اس سے گمان ہوتا تھا کہ شاید مولانا استاد داغؔ کے شعر کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

جو چیزیں خواجہ صاحب کے آرکسٹرا نے پیش کیں۔ فن کے اعتبار سے عمدہ اور مکمل تھیں۔ اس کے لئے خواجہ مسعود صاحب ایجوکیٹرز کلب کے ارکان اور آرکسٹرا کے فن کار مبارکباد کے حق دار ہیں۔

قینچیاں

قینچی دیکھنے میں تو بالکل سیدھی سادھی چیز نظر آتی ہے۔ ٹیڈی بوائے کی طرح اس کی دو ٹانگیں ہوتی ہیں لیکن سر دو ہوتے ہیں۔ دو ٹانگوں والی چیز عموماً خطرناک ہوتی ہے لیکن اتنی نہیں جتنی دو ٹانگوں اور ایک سر والی۔ قینچی ایک ایسی مفید چیز ہے جو مختلف کاموں کے لئے مخصوص اور کارآمد ہے اس کی بہت سی قسمیں اور سائز ہوتے ہیں سائز میں چھوٹی ہوتی ہے درمیانی ہوتی ہے بڑی ہوتی ہے اور بہت بڑی ہوتی ہے اور ایک سائز ایسا ہوتا ہے جو نظر نہیں آتا مگر محسوس ہوتا ہے یہاں پر مختلف قسم کی قینچیوں کا ذکر کیا جاتا ہے تاکہ ہر ایک کو ہر قسم کی قینچی سے واقفیت ہو جائے اور وقت پڑنے پر خود استعمال کی جا سکے یا کوئی اور استعمال کرے تو انسان اس سے بچ سکے۔

سب سے پہلے باربر یعنی خلیفہ کی قینچی کو لیجئے۔ یہ درمیانے سائز کی ہوتی ہے صرف سر کے بال کاٹتی ہے مونچھیں درست کرتی ہے یہ واحد قینچی ہے جس کو انسان کے سر پہ چلنے پھرنے کا شرف حاصل ہے۔ مردوں کے سر پر بڑی روانی سے چلتی ہے باربر کی زبان کی طرح بلکہ دونوں ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔ کبھی باربر کی زبان چلنے میں سبقت لے جاتی ہے اور کبھی اسکی قینچی۔ مرد نما عورتوں اور عورت نما مردوں کے سر پر نرم رفتاری سے چلتی ہے یہ ایک ایسی کارآمد چیز ہے جو انسان کو اچھی خاصی شکل وصورت عطا کرتی ہے اس کا باقاعدہ استعمال انسان کو جنگل سے نکال کر شہر میں لے آتا ہے اور بے قاعدہ استعمال ایک شہری کو جنگل

کا باشندہ ظاہر کرتا ہے۔ یہ عموماً خط بنانے کے بھی کام آتی ہے لیکن خط لکھ نہیں سکتی باربر کی قینچی بہت تیز ہوتی ہے اور اس کا استعمال صرف باربر ہی کرسکتا ہے مرد پر بھی عورت پر بھی مرد نما عورت پر بھی اور عورت نما مرد پر بھی۔

دوسری قسم کی قینچی گھروں میں ہوتی ہے ایک چھوٹے سائز کی ہوتی ہے ایک درمیانے یا بڑے سائز کی۔ چھوٹے سائز کی قینچی اتنی چھوٹی ہوتی ہے اگر اس کو بے بی قینچی کہا جائے تو بہتر ہے یہ قینچی صاحب کے استعمال میں آتی ہے اس سے صاحب اپنی مونچھوں کا میک اپ درست کرتا ہے بڑی قینچی بیگم کے استعمال میں آتی ہے وہ اس سے جو کپڑے سلنے ہوتے ہیں وہ کاٹتی ہیں ان قینچیوں میں خاص بات یہ ہے کہ صاحب مونچھوں کا میک درست کرنے کے لئے بیگم کی قینچی استعمال نہیں کرسکتا اور بیگم کپڑا کاٹنے کے لئے صاحب کی قینچی استعمال میں نہیں لاسکتی۔ اس لئے آپس میں قینچیوں پر جھگڑا نہیں ہوتا۔ صاحب تو چھوٹی سی قینچی ضرورت پڑنے پر کبھی کبھی چلاتا ہے۔ لیکن بیگم بڑی قینچی کے ساتھ ساتھ اور اکثر بڑی قینچی کے بغیر بھی ایک اور قینچی چلاتی ہیں جو زبان کی قینچی ہوتی ہے دیکھا یہ گیا ہے کہ جب دونوں ایک ساتھ چل رہی ہوں تو زبان کی قینچی بڑی قینچی سے سبقت لے جاتی ہے۔ بیگم کی بڑی قینچی اور زبان کی قینچی میں فرق صرف اتنا ہوتا ہے کہ بڑی قینچی بیگم کے اپنے اور بچوں کے کپڑے قطع کرنے کے لئے استعمال ہوتی ہے لیکن زبان کی قینچی صرف صاحب کیلئے استعمال ہوتی ہے۔ بیگم ایک ایسی ماہر اور لاجواب ہستی ہے جو دونوں قینچیوں کو بیک وقت چابکدستی سے استعمال کرسکتی ہے۔ اگر کبھی موڈ بگڑنے پر بڑی قینچی صاحب پر استعمال کر بیٹھے تو معاملہ گو خطرناک نظر آتا ہے لیکن حقیقت میں صاحب کی تراش خراش، درست ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ جب بیگم کپڑا سینے کے موڈ میں ہو تو صاحب اپنے خیالات اور جذبات کو اپنے سینے میں محفوظ رکھے تاکہ بیگم دونوں قینچیاں بیک وقت چلاتے وقت غلطی نہ کر بیٹھے یاد رکھئے کہ بڑی قینچی کا کٹا ہوا تو سل جاتا ہے لیکن زبان کی قینچی کا کٹا ہوا سل نہیں سکتا۔ اس کی سلائی کے لئے نہ کوئی سوئی ایجاد ہوئی ہے اور نہ کوئی دھاگہ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ صاحب

بیگم کی زبان کی قینچی سے تو بچیا رہے ملن جلنے والے بھی زد میں آجاتے ہیں۔ بعض اوقات جب بیگم بات الٹی سمجھتی ہے تو قینچی بھی الٹے ہاتھ سے چلا دیتی ہے۔ جس کی کاٹ بھی الٹی پڑتی ہے۔ ایسی کاٹ سینے کے لئے الٹے معالج کی ضرورت پڑتی ہے جو ابھی پیدا نہیں ہوا اور نہ پیدا ہونے کا امکان ہے اس لئے مناسب یہی ہے کہ جب بیگم قینچیاں استعمال کر رہی ہوں تو صاحب جہاں تک ممکن ہو سکے ان کی زد سے دور رہے۔

ایک قینچی سب قینچیوں سے بڑی ہوتی ہے یہ صرف کوٹھیوں بنگلوں اور باغوں میں دیکھنے میں آتی ہے یہ سب قینچیوں کی بابا آدم کہلاتی ہے یہ مالی کی قینچی ہوتی ہے باغوں اور کوٹھیوں کی باڑ اور چھوٹے موٹے پودوں کی نوک پلک درست کرنے کے کام آتی ہے اس قینچی کو صرف مالی بخوبی استعمال کرسکتا ہے کبھی کبھی صاحب بھی موڈ میں آجاتے تو تھوڑی دیر کے لئے پودوں پر مشق ستم کرتا ہے یہ قینچی بہت جلد تھکا دیتی ہے۔ یہ تمام کی تمام لوہے کی بنی ہوئی نہیں ہوتی اس کے دستے لکڑی کے ہوتے ہیں۔ گو یہ قینچی خطرناک نہیں ہوتی مگر کبھی کبھی جڑ بھی کاٹ دیتی ہے پودوں کی۔

ایک قینچی ہوتی ہے جو نظر نہیں آتی یہ قینچی دکانداروں کے پاس ہوتی ہے اس کو بزنس کی قینچی کہتے ہیں۔ اس قینچی کا بہت زیادہ استعمال آجکل ہوتا ہے۔ اس سے گاہک کی جیب ہی کاٹی نہیں جاتی بلکہ تار تار کر دی جاتی ہے جس کا احساس گاہک کو گھر جا کر ہوتا ہے جب وہ دیکھتا ہے کہ وہ بازار سے چیز تو ضرور خرید لایا ہے مگر ساتھ ہی جیب کٹوا آیا ہے۔

ایک اور چیز ہوتی ہے جو دراصل قینچی نہیں ہوتی مگر کام وہی انجام دیتی ہے جو قینچی دیتی ہے یہ ہے سگریٹ قینچی مارکہ۔ یہ چیز بہت پرانی ہے شاید قینچی جتنی پرانی ہے یہ صحت کو اسی طرح کاٹتی ہے جیسے قینچی کپڑے کو۔ اس سے جیب بھی کٹتی ہے اور ساتھ کے ساتھ انسان کی صحت بھی۔ یہ سب سے زیادہ نقصان دہ ہے لوگ جان بوجھ کر مدتوں سے اس سے کٹتے چلے آرہے ہیں۔ جتنے زیادہ کٹ جاتے ہیں اتنے ہی اور زیادہ کٹنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں تعجب ہے کہ لوگ اس کے نقصانات سمجھتے ہوئے بھی اس کے والہ و شیدا ہیں۔

ایک قینچی بالکل بے ضرر ہوتی ہے اور وہ ہے ٹینس کی قینچی۔ یہ قینچی ٹینس کا جال کھڑا کرنے کے کام آتی ہے۔ لوہے اور فولاد کی بجائے لکڑی کی بنی ہوتی ہے یہ نہ کسی چیز کو کاٹتی ہے نہ نقصان دیتی ہے بلکہ سہارا دیتی ہے اس لئے گمنام ہے اور گمنام ہی رہے گی جب تک یہ کسی نہ کسی طریقہ سے نقصان دینا نہ شروع کر دے لیکن یہ قینچی آج کل بہت کم دیکھنے میں آ رہی ہے۔ بلکہ ختم ہوتی جا رہی ہے۔

سب سے زیادہ خطرناک وہ قینچی ہوتی ہے جو بالکل نظر نہیں آتی مگر موقع ملنے پر لوگ بے دریغ استعمال کرتے ہیں اس کو قینچی چلانا قینچی مارنا کہتے ہیں یہ قینچی ہوتی تو ہر ایک کے پاس ہے مگر اس کا استعمال کسی کسی کو آتا ہے زیادہ تر پہلوان یا اس قسم کے لوگ قینچی مارتے ہیں کمزور اور شریف انسان اول تو اس کا استعمال نہیں جانتا مگر جان بھی جائے تو استعمال کرنے سے گریز کرتا ہے۔ وہ خود بچتا رہتا ہے کہ کوئی ذاتِ شریف اس کو قینچی نہ مار دے۔ یہ علم کسی کو نہیں ہوتا کہ کب کوئی قینچی مار دے اور کون مار جائے اور کس کو مار جائے اکثر موقع ملنے پر دوست دوست کو قینچی مار جاتا ہے قینچی پڑنے کا علم قینچی پڑنے کے بعد ہوتا ہے اور جب پڑ جائے تو اس کا کوئی تدارک ہے اور نہ علاج۔ جو انسان یہ قینچی مارنا جانتا ہے وہ ترقی کرتا کرتا لیڈروں کے درجے تک پہنچ جاتا ہے اور قوم کو خطاب کرتا ہے جو صرف کھانا جانتا ہے وہ قوم کا فرد ہوتا ہے اور اس سے ہمیشہ خطاب کیا جاتا ہے۔

لاہور میں ایک مولوی صاحب کا نام "مولوی قینچ" تھا اس اسم گرامی کی شانِ نزول کچھ اس طرح تھی کہ مولوی صاحب کے پاس ایک قینچی ہوتی تھی جو وہ چھپا کر اپنے پاس رکھتے تھے سڑک پر اگر کوئی عورت بغیر دوپٹے کے یا ننگے سر نظر آتی پھرتی سے اس کی چوٹی کاٹ لیتے تھے۔ ان کو جنون تھا کسی عورت کو ننگے سر نہ دیکھ سکتے تھے بعض کا خیال ہے کہ ان کو جنون نہیں تھا ورنہ ننگے سر کے علاوہ اگر کسی عورت کو بے پردہ دیکھتے تو جہاں ننگے سر دیکھ کر اس کی چوٹی کاٹ لیتے تھے۔ وہاں ننگے منہ دیکھ کر اس کی ناک بھی

صاف کر سکتے تھے۔ مگر وہ ایسا نہیں کرتے تھے۔ اس لئے جنون نہیں تھا۔ بلکہ خیال ہے کہ چوٹیاں کاٹ کاٹ کر جمع کرنا ان کی "ہابی" تھی۔ پرانے سکے اور ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنا بھی ایک ہابی ہے یہ مولوی صاحب کی ہابی تھی۔ ناک جمع کرنے کی ہابی بھی ہو سکتی تھی مگر وہ خطرناک ہے روایت ہے کہ مولوی قینچ سے ڈر کر اکثر مستورات نے خود ہی چوٹیاں کٹوا کر انگریز عورتوں کی طرح بال رکھ لئے تھے نہ رہے چوٹی نہ کاٹے مولوی قینچ نہ رہے بانس نہ بجے بنسری۔ مولوی صاحب کی قینچی اپنا کام سرانجام دے کر مولوی صاحب کے ساتھ ہی ختم ہو گئی۔

ایک قینچی ایسی ہوتی ہے جو نہایت خاموشی اور صفائی سے چلتی ہے یہ قینچی سٹیشنوں بسوں کے اڈوں۔ سینما گھروں میلوں اور جہاں بھیڑ بھاڑ ہو وہاں پر اپنے جوہر دکھاتی ہے یہ قینچی بہت سستی ہوتی ہے مگر کام بہت قیمتی کرتی ہے ایسی خاموشی سے کام کرتی ہے انسان جب ضرورت کے وقت جیب میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کا ہاتھ انتہائی گہرائی میں چلا جاتا ہے۔ اور جیب نہیں ملتی۔

اس قینچی کو چلانے کی باقاعدہ تربیت دی جاتی ہے۔ بڑے بڑے گمنام پرائیویٹ ادارے بغیر کسی فیس کے تربیت دیتے ہیں اور پھر تربیت یافتہ اصحاب کو اپنے ادارے کے ساتھ اس طرح منسلک کر کے فکر معاش سے آزاد کر دیتے ہیں جس طرح ایم بی بی ایس کرنے کے بعد کسی ڈاکٹر کو ہاؤس سرجن لگا کر۔ یہ اصحاب کمیشن پر اس قینچی کا جائز استعمال کرتے ہیں ان کی رہائش اور خوراک کا بندوبست ادارے کے ذمے ہوتا ہے ان اداروں اور یتیم خانوں کے اداروں میں فرق صرف اتنا ہے کہ یتیم خانے کے اداروں کی پرورش یتیم کرتے ہیں اور ان اداروں کی پرورش یہاں کئے تربیت یافتہ اصحاب۔ ان اداروں کا ایک پرنسپل ہوتا ہے جس کو اپنی زبان میں استاد یا خلیفہ کہا جاتا ہے اگر ماڈرن قسم کا ادارہ ہو تو استاد کی بجائے 'باس' کہا جاتا ہے۔ استاد اپنے علاقے میں تربیت یافتہ

لوگوں کو حلقے بانٹ دیتا ہے۔ مثلاً میاں لاوا گوالمنڈی کے حلقے میں اپنے جوہر دکھائیں گے اسٹیشن پر فجو خان کا ملاج ہو گا۔ صدر کے تمام سینما گھروں پر گامے شاہ نجر کہ آرائی کریں گے۔

ا جس شہر میں اس قسم کے ایک سے زیادہ ادارے ہوں تو اس شہر میں اداروں کے استاد یا خلیفے ایک اجلاس بلا کر اپنے اپنے علاقے بانٹ لیتے ہیں۔ جیسے صدر کا علاقہ استاد رستم کا۔ شہر کا علاقہ استاد سہراب کا چک لالہ کا علاقہ استاد حاتم کا تو سیٹ لائٹ ٹاؤن کا علاقہ استاد شادے شاہ کا۔ علاقے بٹنے کے بعد کڑی شرط لگا دی جاتی ہے کہ ایک ادارے کا رکن اپنے علاقے کے علاوہ کسی دوسرے کے علاقے میں جا کر کارروائی ہرگز نہ کرے گا۔ ان کے جو "رولز" آف دی گیم ہوتے ہیں ان پر سختی سے پابندی کی جاتی ہے۔ اگر کوئی کارکن غلطی سے ایسی حرکت کر بیٹھے تو اس کی رپورٹ متعلقہ استاد کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ جس استاد کے علاقے میں غیر متعلقہ ادارے کے رکن نے کارروائی کی ہوتی ہے اس علاقے کا ایک رکن اپنے استاد کا زبانی پروٹسٹ نوٹ مٹھائی کی ٹوکری کے ساتھ پیش کر دے گا۔ "استاد جی استاد حاتم نے سلام کہلایا ہے اور استاد جی سے گلہ کیا ہے کہ آپ کا میاں لاوا کل شام ہمارے علاقے میں کارروائی کر گیا۔ یہ ناجائز بات ہے اور اصول کے خلاف" اس پر میاں لاوے کا جواب طلب کیا جائے گا۔ اس ادارے کے لوگوں میں خاص خوبی یہ ہوتی ہے کہ اپنے کاروبار میں ایمانداری اور دیانت داری سے کام لیتے ہیں کہ کیرکٹر کے بلند ہوتے ہیں لاوا اپنی غلطی کا اعتراف کرے گا اور تمام رقم نکال کر استاد کے سامنے رکھ دے گا اس پر استاد لاوے کو لعنت ملامت کرے گا پانچ چھ فصیح اور بلیغ انتخابی گالیاں عطا کر کے جھاڑے گا سالے ادارے کو بدنام کرتا ہے پہلے استاد سہراب کی شکایت آئی تھی اب استاد حاتم کی۔ اب کے کسی کی شکایت آئی تو ٹانگیں توڑ دوں گا۔ تمام رقم استاد حاتم سے زبانی معافی نامے کے ساتھ ان کے ادارے کے رکن کے حوالے کر دی جاتی ہے آدھی مٹھائی رکھ کر آدھی واپس کر دی جاتی ہے۔ یہ بات بلا خوف و تردید کہی جا سکتی ہے کہ جس ایمانداری اور خلوص سے یہ ادارے اپنا کاروبار کرتے ہیں دنیا کے تختے پر کوئی دوسرا ادارہ

بڑا نہیں کرتا۔ اگر وہ بدنیتی کرے تو اس کا تختہ ہو جائے اس قینچی کو ایماندار قینچی کا خطاب عطا کیا جا سکتا ہے۔

سب سے قیمتی اور خوش نصیب وہ قینچی ہے جو بڑے لوگوں کو ان کی حیثیت کے مطابق انگلش پلیٹ یا گجراتی پلیٹ میں رکھ کر پیش کی جاتی ہے۔ یہ قینچی وزیروں کی قینچی کہلاتی ہے یہ نہایت چمکدار نفیس اور عمدہ قسم کی ہوتی ہے۔ یہ قینچی صرف رنگ دار ربن کاٹ سکتی ہے۔ کاٹنے کا طریقہ یہ خود بتا دیتی ہے اور آگے اپنا اپنا حوصلہ اور ہمت ہے افواہ ہے کہ جیسے باربر حضرات بال تراشنے کا اپنا اپنا سامان رکھتے ہیں اسی طرح ایک ملک میں ایک وزیر خود اپنی جیب میں ایک ننھی سی قینچی اور چھوٹی سی پلیٹ رکھتے تھے تاکہ اگر موقع بے موقع "افتتاحی الات" دستیاب ہونے میں دقت ہو تو اپنے ذاتی الات استعمال کر سکیں ان وزیر کے متعلق ایک سچا واقعہ بیان کیا جاتا ہے۔ دروغ بر گردن تسلیم' ایک جگہ شادی کی رسم ادا ہو رہی تھی وزیر موصوف وہاں مدعو تھے۔ جب دُلھا اور دلہن پگڑی اور دوپٹے کا لڑ باندھ کر پھیرے لینے لگے تو وزیر صاحب عادت سے مجبور جھٹ کھڑے ہو گئے اور جیب سے قینچی نکال کر اور لڑ کاٹنے کے لئے آگے بڑھے تاکہ رسم افتاح ادا ہو۔ لوگوں نے شور کیا۔ اور منت کر کے سمجھایا "حضور یہ پھیروں کی رسم ہے کسی تقریب کی افتاح کی رسم نہیں اگر یہ لڑ کٹ گیا تو یہ افتتاح کا 'انجام' ہو جائے گا۔ ایک اور آخری قینچی کے متعلق بھی آپ کو بتا دیا جائے اس سے بچنا ازحد ضروری ہے اس قینچی کا نام "ادھار محبت" کی قینچی ہے یہ زیادہ تر پان سگریٹ کی دکان والوں پر استعمال ہوتی ہے اور دوسرے دکانداروں پر بھی حسب توفیق چلائی جاتی ہے۔ لیکن چلانے والے ہم اور آپ ہیں۔

جتنی قینچیوں کا مجھے علم تھا وہ میں نے آپ کے استعمال کے لئے ترکیب استعمال سمیت آپ کی خدمت میں پیش کر دی ہیں ان کے علاوہ اگر کوئی اور قینچی آپ کے علم میں ہو تو مجھے بتانے کی ضرورت نہیں۔

ابن بطوطہ ماڈل ٹاؤن میں

پہلی بار میں ہز میجسٹی نورالدین جہانگیر شہنشاہ ہندوستان کے ساتھ لاہور آیا تھا۔ ان دنوں عالم پناہ کا ارادہ اپنی مستقبل رہائش کے لئے موزوں سائیٹ لاہور کے کسی حصے میں پسند فرمانے کا تھا۔ ہز میجسٹی نے دریائے راوی کے کنارے سائیٹ پسند فرمائی اور آج کل وہاں آرام فرما رہے ہیں۔ دوبارہ میرا ارادہ لاہور آنے کا نہ تھا لیکن دوران سیاحت چنڈی گڑھ میں سردار چورن سنگھ وزیر سیر سپاٹہ نے انٹرویو کے وقت اس بات پر زور دیا کہ میں دوبارہ لاہور جاؤں اور وہاں خاص طور پر ماڈل ٹاؤن دیکھوں سردار چورن سنگھ نے مشہور کہاوت سنائی کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ پیدا نہیں ہوا اور جس نے لاہور میں ماڈل ٹاؤن نہیں دیکھا اس کا پیدا ہونا بیکار ہے۔ ہز میجسٹی کے ساتھ میں لاہور کی سیر کر چکا تھا۔ اس لئے میرے پیدا ہونے میں کوئی شک و شبہ نہیں لیکن میں یہ نہیں چاہتا تھا۔ کہ میرا پیدا ہونا بیکار جائے اس لئے میں ماڈل ٹاؤن دیکھنے لاہور چلا آیا۔

جس وقت میں لاہور سٹیشن پر اترا تو مجھے ایک شخص جس نے انگریزی خاکی وردی اور انگریزی ٹوپی پہنی ہوئی تھی لاہور ہوٹل میں ٹھہرنے کی دعوت دی میں نے اس کی دعوت کا شکریہ ادا کیا۔ اور کہا کہ میں ہوٹل میں ٹھہرنے کے لئے نہیں آیا بلکہ ماڈل ٹاؤن دیکھنے آیا ہوں اگر وہ مجھے ماڈل ٹاؤن کی سیر کرا دے تو میں اس کا نہایت مشکور ہوں گا اور اسے

انعام کے علاوہ مناسب خطاب بھی دوں گا وہ شخص رضامند ہوگیا اور کہنے لگا میں ماڈل ٹاؤن کے ایک ایک ملی میٹر سے واقف ہوں۔ گو میں مہاجر نہیں میں نے پھر بھی وہاں ایک کوٹھی الاٹ کروائی ہوئی ہے جس کا کرایہ آٹھ سو روپیہ ماہوار ہے۔

میں اور میرا گائیڈ ایک تانگے میں سوار ہو کر ماڈل ٹاؤن کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں وہ مجھے بتاتا جاتا تھا یہ ایمپرس روڈ ہے یہ ایجرٹن روڈ ہے ادھر کوپر روڈ ہے سامنے اسمبلی ہال ہے اور وہ ریگل سینما ہے مجھے سخت تعجب ہوا کہ دنیا کی ایک بڑی اسلامی سلطنت میں سڑکیں ابھی تک مشرف بہ اسلام نہیں ہوئیں۔ گائیڈ نے مجھ سے پوچھا۔ آپکا نام کیا ہے میں نے بتایا ابن بطوطہ وہ پوچھنے لگا۔" اس کا مطلب کیا ہوتا ہے"۔ میں نے گائیڈ سے اس کا نام پوچھا وہ کہنے لگا۔ "چودھری نتھو خان" میں نے بھی اس کا مطلب پوچھا تو وہ بولا۔' یہ تو نام ہے ہر نام کا مطلب نہیں ہوتا۔' میں نے اسے کہا' تو وہ پھر میرا نام ہے'! اس نے پھر سوال کیا۔ آپ ابن منشا کے منجھلے بھائی تو نہیں ہیں'۔ میں نے نفی میں جواب دیا۔ اس نے پھر پوچھا"۔ بطوطہ جی آپ چودھری ہیں یا راجہ" میں نے اُسے بتایا کہ میں صرف بطوطہ ہوں میں کوئی خطاب یافتہ نہیں ہوں"۔ گائیڈ کہنے لگا۔ میں آپ کو میاں بطوطہ یا ملک بطوطہ کی بجائے صرف مسٹر بطوطہ کہونگا" میں اس کا منہ تکنے لگا۔ ریگل سینما کے قریب گائیڈ نے تانگہ چھوڑ دیا اور ہم ایک نیلے رنگ کی بس میں سوار ہوئے بس میں بیٹھنے کے لئے کھڑکیوں کے ساتھ ساتھ صرف ایک ایک نشست تھی۔ باقی بس درمیان میں سے بالکل خالی تھی۔ میرے گائیڈ نے بتایا اس بس کو پنجابی زبان میں" ڈیڑھے والی بس' کہتے ہیں۔ ڈیڑھا صحن کو کہتے ہیں۔ اس میں فائدہ یہ ہے کہ زیادہ سے زیادہ مسافر اس میں سما سکتے ہیں بس کے صحن میں چھت کے ساتھ جو ڈنڈا لگا ہوا ہے اس کو پکڑ کر کھڑے ہو سکتے ہیں"۔ میں نے دیکھا تو واقعی بہت سے مہذب قسم کے حضرات ڈنڈا پکڑے ہوئے قربانی کے بکروں کی طرح لٹکے ہوئے تھے۔ میں نے گائیڈ سے پوچھا "کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ باقی کی نشستیں بھی اٹھوا دی جائیں تاکہ زیادہ سے زیادہ مسافر لٹک سکیں"۔ اس پر گائیڈ نے

کہا۔ "مسٹر بطوطہ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ تمام ملک کو ادمنی بس میں لٹکا دیا جائے۔ بس والے یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتے۔ اگر تمام نشستیں اٹھوا دی جائیں تو پھر بس کا چالان ہو جائے گا" میں نے اس سے پوچھا "یہ چالان کیا ہوتا ہے؟" وہ کہنے لگا "مسٹر بطوطہ کبھی ٹیکسی یا بس چلاؤ تو سمجھ جاؤ گے زبانی بتلانے سے پتہ نہیں چلے گا"۔

ہم دونوں بھی بس میں جھٹکے کھاتے اس طرح جھومتے جا رہے تھے جیسے قوالی کر رہے ہوں ایک گھنٹے کے بعد لٹکنے سے نجات ملی۔ بس ماڈل ٹاؤن کے پٹرول پمپ کے پاس رکی ہم بس سے نیچے اترے۔

گائیڈ نے بتایا "مسٹر بطوطہ ماڈل ٹاؤن میں کل دس بلاک ہیں 'ایسے' سے لے کر 'کے' تک 'آئی' بلاک غائب ہے۔ 'آئی' کا مطلب ہے 'میں'۔ اور یہ 'میں' انسان کو لے ڈوبتی ہے اس لئے ماڈل ٹاؤن میں حرف بلاکوں میں 'آئی' کو شروع سے نہیں رکھا گیا۔ جہاں ہم اس وقت کھڑے ہیں یہ 'جے' بلاک ہے۔ اور اس طرف ماڈل ٹاؤن کا ذاتی پٹرول پمپ ہے"۔

میں نے پوچھا "چودھری نتھو خان پٹرول اندر جانے کے لئے لینا پڑتا ہے یا باہر جانے کے لئے"۔ گائیڈ نے کہا۔ "دونوں طرف کے لئے اور دیکھئے یہ سیدھی سڑک ماڈل ٹاؤن میں داخل ہوتی ہے اور پھر اسی طرح واپس آتی ہے"

اب ہم سیدھی سڑک پر روانہ ہوئے دو سو گز کے قریب سفر طے کیا تھا کہ سڑک پر ایک پانی کا چشمہ نظر آیا۔ گائیڈ نے بتایا کہ یہ قدرتی چشمہ نہیں بلکہ پانی کا نل سڑک کے نیچے کہیں نہ کہیں سے ٹوٹ گیا ہے۔ اور یہ چشمہ نل کے کسی حصہ سے پھوٹا ہے اس کا آج تک پتہ نہیں لگ سکا۔ حالانکہ سڑک کو کئی بار کھود کھود کر اس کا ستیاناس کیا گیا ہے لیکن مسٹر بطوطہ اس چشمے کا پانی صحت کے لئے مفید ہے اس کے پینے سے چستی و چالاکی پیدا ہوتی ہے۔ دل جمعی سے کام کرنے کی انتھک عادت کے آثار پیدا ہوتے ہیں صحت بنتی ہے۔ لیکن اس ٹاؤن کے حاکموں کو اس بات کا علم نہیں ورنہ وہ اور ان کا عملہ تمام پانی خود پی جائیں

اور پھر ان کے دفتروں میں چستی و چالاکی سے کام ہوتا آج کل صرف چالاکی سے ہوتا ہے ایسے سرکاری چشمے اور بھی کئی سڑکوں پر موجود ہیں۔

ہم ذرا اور آگے گئے تو ایک چوک آ گیا۔ گائیڈ نے بتایا "اس چوک کا نام پاکستان چوک ہے پاکستان بننے سے پہلے یہ گوردوارہ چوک کہلاتا تھا۔ سکھوں کے قول کے مطابق ایک سکھ سوا لاکھ کے برابر ہوتا ہے جب اس ٹاؤن کے تمام سکھ گردوارے میں جمع ہوتے تھے تو ایک سکھ سوا لاکھ کے حساب سے پاکستان کی آبادی کے برابر ہو جاتے تھے اسی نسبت سے اس چوک کا نام پاکستان چوک رکھ دیا گیا۔"

پاکستان چوک چھوٹا سا گول چکر ہے جس کو بغور دیکھتے ہوئے ہم آگے روانہ ہوئے تھوڑی سے دور جا کر ایک چھوٹا سا چکر اور آ گیا جس کے درمیان ایک چھوٹا سا مینار تھا۔ یہاں پر سڑک دائیں اور بائیں طرف مڑتی ہے گائیڈ کہنے لگا یہ ماڈل ٹاؤن کی بسوں کا اڈا ہے یہاں پر درختوں کے جھنڈ کے نیچے دو چار چائے کی دکانیں دیکھنے میں آئیں یہاں پر اومنی بس اور ماڈل ٹاؤن بس سروس کے ڈرائیور تھوڑی دیر کے لئے دم لیتے ہیں اور مسافر بسوں میں حبس کی وجہ سے دم دیتے ہیں میں نے دیکھا کہ درختوں کے نیچے بہت سے لوگ بیٹھے ہوئے تمباکو نوشی میں مصروف ہیں اڈا کسی بزرگ کا تکیہ نظر آتا تھا۔ گائیڈ مجھ کو ایک کچی مگر سیدھی سڑک پر چند گز کے فاصلے پر لے گیا وہاں پر عظمت رفتہ کی یادگار تین چار بسیں شکستہ حالت میں کھڑی تھیں۔ گائیڈ نے بتایا۔ یہ بسیں ماڈل ٹاؤن بسنے سے پہلے کی ہیں۔ اب ان کو بطور تبرک یہاں پر رکھا گیا ہے تاکہ لوگ ان قدیم بسوں کی جن میں ان کے آباؤ اجداد کبھی سفر کرتے تھے زیارت کر کے آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچا سکیں۔ مگر بطور تبرک یہ بسیں بغیر پہیوں اور انجن کے کھڑی ہیں ان کے پہیے اور انجن یہاں کے مالکوں نے اس لئے غائب کر دیئے تاکہ کوئی ڈرائیور [illegible] طور پر غائب نہ کر دے۔ [illegible] کی بسیں ہیں جو ان بسوں کی قربت حاصل کر [illegible] گائیڈ نے [illegible] آپ [illegible] کے [illegible] گے تو یہاں پر

ایسی بے شمار لسیوں کی زیارت کر سکیں گے۔ آئیے اب آپ کو ایک دکان دکھائی جائے جس کو چیپ سٹور کہتے ہیں"۔

جب ہم واپس پکی سڑک پر آئے تو دائیں طرف ایک بڑا سا کمرہ دیکھا جس کی طرف گائیڈ نے اشارہ کر کے کہا۔ "مسٹر بطوطہ یہ چیپ سٹور ہے"۔ میں نے دیکھا اس سٹور کے باہر چند لڑکے چوڑی والی پتلونیں اور نہایت چست قسم کی قمیصیں پہنے کھڑے کھڑے چھوٹی چھوٹی بوتلوں میں کچھ پی رہے تھے اور قریب ہی چند بے پردہ لڑکیاں ایسا ہی لباس پہنے تنکوں پر کوئی سفید سفید مایا لگا ہوا چاٹ رہی تھیں میں نے گائیڈ سے پوچھا۔ "یہ کون حضرات ہیں اور کھڑے کھڑے کیا نوش جان کر رہے ہیں"

گائیڈ نے کہا۔ یہ ٹیڈی بوائے ہیں اور کوکا کولا سے دل بہلا رہے ہیں اور وہ گرلز یعنی دختران قوم ہیں" ایس کریم کھا رہی ہیں" میں نے قریب جا کر ایک لڑکے سے پوچھا" میاں صاحبزادے ایک بات بتلایئے" ویلا پتلا مریل سا لڑکا مجھے سر سے پاؤں تک ٹانگیں ہی ٹانگیں نظر آتا تھا۔ قینچی کی طرح اور اکڑ کر کھڑا ہو گیا اور عجیب خواجہ سرایانہ انداز سے مسکرا کر بولا۔ "ہیلو مسٹر میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں"۔ میں نے اس چست لباس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔ برخوردار یہ بتاؤ کہ اس لباس میں آپ کیسے گھسے تھے۔ آپ نے یہ لباس سلوا کر پہنا ہے۔ یا پہن کر پھر سلوایا ہے" لڑکا حیرت سے میرا منہ دیکھنے لگا اور لڑکیاں منہ دوسری طرف جلدی جلدی ایس کریم چاٹنے لگیں زبان اتنی لمبی نکالتی تھیں جیسے بھینس نمک چاٹتے وقت نکالتی ہے۔ گائیڈ سے جب میں نے پوچھا کہ اس دکان کو چیپ سٹور کیوں کہتے ہیں تو وہ مسکرا کر کہنے لگا" کیونکہ اس سٹور والے سستے داموں پہ چیزیں خرید کر مہنگے داموں بیچ دیتے ہیں شاید اس لئے اس کو چیپ سٹور کہتے ہیں"

چیپ سٹور کی زیارت کے بعد میں گائیڈ کے پیچھے پیچھے باجماعت سڑک کی بائیں طرف روانہ ہوا گائیڈ نے بتایا کہ اس سڑک کو سرکلر روڈ کہتے ہیں۔ اس سڑک کی خوبی یہ ہے کہ یہ زمین کی طرح گول تو نہیں لیکن ہے گول۔ اگر اس سڑک پر ایک مقام سے دائیں طرف چلا جائے

تو چکر کاٹ کر ہم اسی مقام پر آجائیں گے جہاں سے چلے تھے اسی طرح اگر بائیں طرف سے سفر کیا جائے تو چکر کاٹ کر ہم اسی مقام پر آجائیں گے۔ اس سڑک کے گرداگرد تمام بستی آباد ہے اور بستی کے لوگ کبھی بائیں طرف سے اور کبھی دائیں طرف سے ایک ہی مقام پر آتے جاتے رہتے ہیں"۔

راستے میں ہم نے ایک چوبرجی دیکھی۔ گائیڈ نے کہا یہ ایف بلاک ہے اب ہم اس طرف جائیں گے جس طرف شاندار جامع مسجد ہے یہاں کی سڑکیں میں نے عجیب طرز کی بنی ہوئی دیکھیں دنیا میں انوکھی سڑکیں ہیں جن پر چھوٹے چھوٹے تالاب نما گڑھے بنے ہوئے ہیں مجھے بتایا گیا کہ برسات کے موسم میں ان تالابوں میں پانی بھر جاتا ہے پھر ان سے بہت سے کام لئے جاتے ہیں بچے ان گڑھوں میں نہاتے ہیں تیرنا سیکھتے ہیں لوگ کپڑے دھوتے ہیں۔ جانوروں کو نہلاتے ہیں اگر ضرورت پڑے تو کنارے پر بیٹھ کر کوشش سے مچھلیاں پکڑ سکتے ہیں ورنہ مینڈک تو خود بخود ہاتھ میں آجاتے ہیں۔ اس بستی کی حکومت ان تالابوں کو اس لئے بند نہیں کراتی کہ کہیں اہل بستی کو اتنے فوائد سے ہاتھ نہ دھونا پڑے بلکہ وہ ہاتھ دھونے کی بجائے کپڑے دھوتے رہیں۔

گائیڈ مجھے ایک عظیم الشان مسجد کے سامنے لے آیا جب مسجد کی ڈیوڑھی میں داخل ہوا تو میں نے دیکھا کہ دیوار پر دونوں طرف چھوٹی چھوٹی ٹائلز پر نام کھدے ہوئے ہیں میں سمجھا کہ یہ شاید اللہ تعالےٰ کے ننانوے نام ہیں لیکن قریب جاکر پڑھنے سے معلوم ہوا کہ یہ نام اللہ تعالےٰ کے بندوں کے ہیں بندے ننانوے کے پھیر میں نہیں آتے۔ گائیڈ نے بتایا" یہ ان لوگوں کے ناموں کی گزیٹیڈ لسٹ ہے جنہوں نے مسجد کی تعمیر کے لئے بار بار تاکید کرنے پر مجبوراً دل کھول کر اپنی نیک کمائی میں سے چندہ دیا"۔

میں نے کہا" میں تو سمجھا تھا کہ یہ ان لوگوں کے ناموں کی لسٹ ہے جن کا مسجد میں داخلہ بند ہے۔ یا جو مفرور ہیں"۔ مرد بھی عجیب ہستی ہے برتری اور فوقیت ہر جگہ قائم کرنے

کی کوشش کرتا ہے ان کتبوں پہ نام اس طرح لکھتے دیکھے کہ اوپر شوہر کا نام اور نیچے بیوی کا نام۔ اللہ تعالیٰ کے گھر میں سب برابر ہوتے ہیں لیکن یہاں پر دیکھا کہ اوپر نظام علی ہیں اور نیچے بیگم نظام علی۔ اس جا پہ مرد نے عورت کو ہمیشہ اپنے نیچے ہی رکھا بعض کتبوں پر مرد کے نیچے کسی اور کی بیگم کا نام ہے۔

کتبوں کی زیارت کے بعد جب میں مسجد میں داخل ہوا تو دیکھا کہ نہایت کشادہ اور وسیع میدان ہے۔ لیکن نمازی بہت کم۔ ظہر کا وقت تھا میں نے نماز باجماعت ادا کی اس شاندار مسجد میں صرف ایاز ہی ایاز ایک صف میں کھڑے تھے بسیار تلاش کے محمود کہیں نظر نہ آیا۔ یہ منظر یہاں ہی نہیں میں نے دنیا کی اکثر مساجد میں دیکھا ہے۔ میں نے گائیڈ سے پوچھا۔ کیا یہ صرف ایازوں کی مسجد ہے یا ان لوگوں کی جن کے کتبوں پر نام نہیں شاید ان کی کمائی نیک نہیں اور یہ چندہ بھی نہیں دے سکے"۔

گائیڈ نے مسکرا کر کہا"۔ اس مسجد میں محمود صرف عید کی نماز ادا کرتے ہیں ان کی غیر حاضری کی وجہ یہ ہے کہ وہ آج کل بلیک مارکیٹ اور سمگلنگ کا سرمایہ لوٹنے میں مصروف ہیں اس کام سے کبھی فارغ ہوں گے تو مسجد میں آئیں گے"

جب ہم مسجد سے باہر آ گئے تو ایک محمود پہ نظر پڑی۔ میں رہ نہ سکا اور میں نے اس سے پوچھا" بندہ نواز کیا وجہ ہے کہ آپ مسجد میں نظر نہیں آتے۔

بندہ نواز نے پہلے تو مجھے سر سے پاؤں تک دیکھا اور یہ سمجھ کر کہ میں غیر ملکی ہوں کہنے لگا" کیا آپ نے وہ شعر نہیں سنا جو اکثر مساجد کی محرابوں پہ لکھا ہوتا ہے۔ کہ روز محشر چوں جاں گداز بود۔ اولین پرسش نماز بود" پرسش ہمیشہ اس بات کی ہوتی ہے جو کی جائے مطلب یہ ہے کہ [illegible] جائے گا بتاؤ تم نے نماز کیوں پڑھی" میں یہ [illegible] سن کر لا جواب ہو گیا [illegible] پڑھنے لگا بندہ نواز نے سب کچھ سوال کیا۔ کیا آپ کے [illegible] لگ گئے

اگر ایسا ہو سکے تو آپ میرے پارٹنر بن سکتے ہیں"۔ میں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ مسجد دیکھنے کے بعد گائیڈ مجھے کلب گھر لے آیا۔ یہ ایک شاندار عمارت ہے گائیڈ نے بتایا۔ "پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے سے پہلے یہ عمارت سومنات کے مندر کی طرح ہر قسم کے ساز و سامان سے بھری ہوئی تھی۔ پاکستان بننے کے بعد بت شکنوں نے اس مندر کو خوب لوٹا اس کا صفایا کر دیا۔ صوفہ سیٹ، کراکری سب سامان ہاتھوں ہاتھ لے گئے۔ گائیڈ نے مزید بتایا کہ اس کلب میں جمہوریت کا زور ہے۔ اس کلب کا ایک صدر ہے ایک نائب صدر ایک سیکرٹری ایک نائب سیکرٹری ہے مجلس عاملہ بھی ہے اس کے رکن بے شمار ہیں لیکن کلب کا تمام کام بوڑھے مارکر جو ٹینس سکھاتا ہے کرنا پڑتا ہے۔ چندہ وہ اکٹھا کرتا ہے خرچ وہ کرتا ہے اور زبانی حساب کتاب بھی رکھتا ہے اگر کوئی حساب پوچھے تو زبانی اس کو چیک بھی کرا دیتا ہے" گائیڈ نے یہ بھی بتایا کہ یہاں پر ایک لیڈیز کلب بھی ہے جو آتنی بڑی وسیع بستی میں غیر آباد ہے اور آج کل یہاں مصوری کی مشق ہوتی ہے۔

یہاں سے فارغ ہوئے تو گائیڈ نے ہسپتال اور ڈسپنسری کی سیر کروائی۔ ہسپتال میں مریضوں کے پلنگ تمام خالی پڑے تھے معلوم ہوا کہ یہاں مریض داخل نہیں ہوتے یا ہونے نہیں دیئے جاتے اس سے ظاہر ہوا کہ یہاں کے لوگوں کی صحت بہت اچھی ہے۔ ہسپتال میں لوگ آتے ہیں اور ایک ہی قسم کی لال دوا لے کر چلے جاتے ہیں اور جب تک ان کو فائدہ نہ ہو وہ دوا حاصل کرتے رہتے ہیں اور تمام عمر یہی دوا استعمال کرنے میں ختم کر دیتے ہیں۔ یہاں کا پانی شفا بخشتا ہے اس لئے یہاں دوا میں پانی کے اجزا بہت زیادہ اور دوا کے اجزا بہت کم رکھے جاتے ہیں۔

ہسپتال میں ایک ڈاکٹر چند کمپونڈر اور ایک لیڈی نرس بھی دیکھنے میں آئے۔ کہتے ہیں کہ مرد کمپونڈر مردوں کو انجکشن لگاتے ہیں اور لیڈی نرس عورتوں کو انجکشن [illegible] کمپونڈر [illegible] مریض کی جیب کی طرف دیکھ لیتے ہیں اگر جیب [illegible]

صاف ہے تو اسی کے مطابق انجکشن لگاتے ہیں اگر جیب ابھری ہوئی نظر آئے تو واقعی انجکشن لگایا جاتا ہے ۔ ورنہ چھو دیا جاتا ہے ہسپتال میں ایک مولوی بھی نظر آیا جس کی چھوٹی چھوٹی داڑھی ہے اس کی چھوٹی داڑھی کو مدنظر رکھ کر وہاں کے مریضوں نے اسکوٹیڈی مولوی کا خطاب دیا ہے یہ بے چارہ دوا کم اور دعا زیادہ دیتا ہے لیکن دونوں بے اثری کی نظر ہو جاتی ہیں۔

شاندار ہسپتال ڈسپنسری اور وہاں کا سٹاف دکھانے کے بعد گائیڈ مجھے ایک تجارتی مرکز دکھانے کے لئے لے گیا میں نے دیکھا ایک خوبصورت کوٹھی کے باہر جا بجا کھاد کے ڈھیر لگے ہیں میں نے تعجب سے گائیڈ کی طرف دیکھ کر پوچھا۔چودھری نتھو خان یہ تجارت کا مرکز کس طرف سے ہے ؟" وہ ڈھیروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا "مسٹر بطوطہ یہ سب کھاد کے خزانے ہیں ۔ اس پیداوار میں ہم خود کفیل ہیں ۔ اس بستی کے لوگ اس قیمتی چیز کو بستی سے باہر جانے نہیں دیتے اور نہ ہی باہر سے منگواتے ہیں اس خزانے کی خوشبو سے جراثیم پیدا ہو کر مرجاتے ہیں اگر کوئی اتفاقیہ بیماری پیدا ہو جائے تو اس ٹاؤن کے ڈاکٹروں کے لئے فائدہ مند ہے ۔

تجارتی مرکز دیکھنے کے بعد ہم عید گاہ دیکھنے چلے گئے جو جی بلاک میں ہے یہ چھوٹی سی مسجد ہے لیکن مسجد کے سامنے بہت وسیع میدان ہے جو درختوں اور پودوں سے بھرا ہوا جنگل کی تصویر پیش کرتا ہے ۔ گائیڈ نے کہا۔ یہ اس ٹاؤن کی عید گاہ ہے اس عید گاہ کی خاص خوبی یہ ہے کہ یہاں پر سوائے عید کی نماز کے ہر نماز ادا کی جاتی ہے ۔ اسی نسبت سے اس کا نام عید گاہ ہے" عید گاہ کی زیارت کے بعد ہم ایک اور مسجد مبارک کے سامنے گئے ۔ یہ چھوٹی سی مسجد بر لب سڑک ہے گائیڈ نے بتایا " یہ مسجد بہت پرانی ہے پاکستان بننے سے پہلے کی ۔ یہاں پر صاف میدان ہوتا تھا اور ایک شیشم کا درخت جس کے قریب کھڑے ہو کر امام خطبہ دیتا تھا اور نماز پڑھایا کرتا تھا۔ اس مسجد کا نام ثانی مسجد

ہوا کرتا تھا۔ ملک کی آزادی کے بعد اب تمام ملک اپنا ہے اس لئے مسجد بنانے میں چنداں دقت پیش نہیں آئی۔ ایک بے آسرا مخیر شخص نے جس کے نہ ماں باپ تھے نہ اولاد تھی اس مسجد کی تعمیر میں مالی طور پر حصہ لیا۔ اب اس مسجد کا نام مبارک مسجد ہے اس مسجد کی تعمیر پر زیادہ پیسہ خرچ نہیں آیا۔ مزدور لوگ خود گھر سے محروم ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کا گھر تعمیر کرنے میں ان کا جذبہ قابلِ قدر ہے وہ اس نیک کام میں خوشی سے حصہ لے رہے ہیں اور مزدوری لینے کے وقت حاجی ٹھیکیدار سے گالیاں کھا کر دعا دیتے ہیں۔" اس مسجد کو دیکھ کر اور اس کا قصہ سن کر طبیعت بہت خوش ہوئی۔ حاجی ٹھیکیدار کے دیدار کی حسرت رہ گئی۔ گائیڈ نے بتایا "حاجی ٹھیکیدار نے سنا ہوا ہے کہ مزدور کی مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کر دینی چاہیئے۔ لیکن حاجی ٹھیکیدار مزدوروں کو ہمیشہ پسینے میں تر رکھتا ہے انہیں پسینہ خشک کرنے کے قریب بھی نہیں ہونے دیتا۔ اس مسجد میں ایک امام ہے اور ایک موذن خوش الحان ہے اس لئے اس کا نام لوگوں میں مولوی مکھنی مشہور ہو گیا ہے۔ امام کی آواز ذرا کرخت ہے وہ مولوی ڈانڈا کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

مسجد مبارک دکھانے کے بعد آخر میں میرے گائیڈ نے مجھے ایک کالونی دکھائی کہنے لگا۔" یہ خوشنما بلڈنگ مکینوں کے لئے مبارک ہے اس لئے اس کو مبارک کالونی کہتے ہیں جس حاجی نے مبارک مسجد کی تعمیر میں حصہ لیا بلڈنگ اسی کی ملکیت ہے"۔ اچانک میری نظر عمارت کے باہر برلب سڑک ایک مزار پر پڑی میں نے فوراً ہاتھ اٹھا کر فاتحہ پڑھنی شروع کر دی گائیڈ مجھے حیرت سے دیکھنے لگا۔ جب میں فاتحہ سے فارغ ہوا تو میرے گائیڈ نے پوچھا۔ مسٹر بلوطہ یہ آپ کیا کر رہے تھے؟

میں نے مسکرا کر جواب دیا "چودھری نھتو خان تم نے مجھے مبارک مسجد دکھائی اس کے بعد مبارک کالونی دکھائی اور اب میں اس مزارِ مبارک پر فاتحہ خوانی کر رہا تھا۔"

گائیڈ ہنس کر بولا۔ جناب بلوطہ صاحب آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ مزار مبارک

نہیں۔ مبارک تو ابھی زندہ ہے۔ یہ تو ڈمپ ہے، آپ نے غلط جگہ فاتحہ پڑھی۔"

میں نے پوچھا 'ڈمپ' کیا ہوتا ہے" گائیڈ کہنے لگا آپ اس میں جھانک کر دیکھیں خود بخود سمجھ جائیں گے۔ یہ 'ڈمپ' ایک چھوٹا سا قبر نما حوض ہے اور جب میں نے اس میں جھانک کر دیکھا تو روح افزا نظارا پایا۔ اس حوض میں تین کنستر کھلے منہ کے رکھے ہوئے تھے ایک کنستر خالی تھا۔ باقی دو "انسانی" "لایم جوس" اور متاع زندگی سے لبریز تھے میں اس ڈمپ کی 'جانفزا خوشبو' برداشت نہ کرسکا دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر لاحول پڑھتا ہوا وہاں سے بھاگا۔ گائیڈ نے کہا "نختو خان سردار جورن سنگھ ٹھیک بکواس کرتا تھا کہ جس نے لاہور میں ماڈل ٹاؤن نہیں دیکھا اس کا پیدا ہونا بیکار ہے۔"

مر کے بھی چین نہ پایا تو......

(میری اپنی نذر)

مشرقی پنجاب سے بھاگنا پڑا تو سیدھے پاکستان آکر دم لیا۔ اچھے خاصے شریف انسان سے مہاجر کہلانے لگے۔ دھکے کھاتے آئے تھے دھکے کھاتے چلے جارہے ہیں۔ اس کے علاوہ اور کچھ کھانے کو میسر نہ آیا۔ کبھی مکان کا جھگڑا کبھی دکان کا چکر۔ تجارت کے لئے سرمایہ ندارد۔ نوکری کے لئے دفتر موجود مگر ملازمت غائب۔ اگر ملازمت کہیں مل بھی گئی تو ترقی یافتہ افسروں کی غلط انگریزی میں جھاڑیں کوئی ایک بات ہو تو کہی جائے۔ در در کی خاک چھانی مگر خاک کی ایسی فراوانی کہ ختم ہونے میں نہ آئی۔

آخر روز روز کے چکروں، مشکلوں اور مصیبتوں سے تنگ آکر اللہ تعالیٰ سے گڑگڑا کر دعائیں مانگیں۔ اے پاک پروردگار! یہ ہجرت تو راس نہ آئی۔ اپنی طرف ہجرت کا موقع عطا فرما۔ آخر اللہ تعالیٰ تھا رحیم اور کریم۔ کب تک نہ سنتا دریائے رحمت جوش میں آیا اور فوراً دعا قبول ہوئی۔ غموں فکروں میں گھرے ہوئے ایک رات ایسے سوئے کہ پھر اُٹھنے کا نام نہ لیا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں پیارے تھے اور اب ہم اللہ تعالیٰ کو پیارے ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا چلو! دکھوں سے چھٹکارا ہوا۔ نہ مکان کی الاٹمنٹ کا جھگڑا۔ نہ کرایہ ادا کرنے کا سوال۔ نہ دفتر کے چپڑاسیوں کی خوشامد۔ اور نہ کلرکوں کی رشوت دفتروں کے سب چکر ختم۔

رشتے دار، دوست احباب اور اہل محلہ جو وقت پر تو کنی کتراتے تھے۔ اب ہاتھوں ہاتھ اٹھائے گئے اور منٹوں میں زمین دوز نئی عمارت میں منتقل کر آئے۔ عمارت تھی تو ابھی نیم پختہ مگر تھی ذرا وسیع۔ تین دن تک تو خوب مزے سے آرام کیا۔ کوئی ملنے ملانے یا تنگ کرنے نہ آیا۔ رشتہ دار عزیز وہ ایک بار مجبوراً آ کر ہاتھ اٹھا کر دعا دے کر چلے گئے۔ قرض خواہوں کا ڈر تھا، مگر وہ بہت شریف نکلے انہوں نے شکل تک نہ دکھائی۔ یہ دیکھ کر اللہ کا پھر شکر ادا کیا۔

یہاں پر بھی دنیا کے مکانوں کی طرح مکان اور بلڈنگیں ہیں۔ بہت نفیس اور اعلیٰ بھی کچھ ٹوٹی پھوٹی اور خستہ حالت میں بھی۔ کچی اور نیم پختہ عمارتوں میں ایک پختہ اور نفیس بلڈنگ ایسے دکھائی دیتی ہے جیسے کسی محلے میں غریبوں کے مکانوں کے درمیان کسی خان بہادر کی شاندار حویلی ہو۔ بہت سی عمارتوں پر ناموں کے بورڈ بھی لگے ہیں۔ ایک بلڈنگ بہت بڑی گنبد نما اور شاندار ہے۔ اور اس پر اس علاقے کا جھنڈا بھی لہرا رہا ہے۔ یہ یہاں کے بہت بڑے حاکم کا محل ہے۔

خدا سمجھے ان عزیزوں کو نہ جانے کیا سوجھی اور کس بات کا بدلہ لیا کہ اب محبت کے ابال میں آ کر تین چار دن کے بعد نیم پختہ عمارت کو پکا اور خوبصورت بنا گئے۔ اور سنگِ مرمر کا سائن بورڈ بھی نصب کرا گئے جس پر عمارت کی تعمیر کا سن، ملکیت مع ولدیت لکھی ہوئی تھی۔ یہ عزیز دنیا میں تو بات تک نہ پوچھتے تھے۔ اب ان کو کیا خیال آگیا۔ مزدور بنگلے کی لاگت میں ہاتھ مارنے کے لئے کیا ہو گا۔ اگر عمارت کو ویسا ہی نیم پختہ رہنے دیتے تو کیا حرج تھا۔ مگر پھر اپنے ہاتھ کیسے رنگتے۔ انہی خیالوں میں غلطاں تھا کہ ایک صاحب ملاقات کے لئے آگئے۔

فرمانے لگے "ادھر آپ ہیں اس بنگلے میں؟"

عرض کیا، "جی میں ہی ہوں کیا خدمت کر سکتا ہوں آپ کی؟"

کہنے لگے، "شکریہ۔ ویسے ہی ملنے کے لئے آگیا تھا۔ بہت شاندار ہے آپ کا بنگلہ۔"

جواب دیا "آپ کی دعا سے اچھا ہی ہے۔"

پوچھنے لگے، "آپ یہاں کب تشریف لائے۔ معاف کیجئے لیٹ ہو گیا آپ کی ہسٹری شیٹ پڑھ رہا تھا۔

ورنہ آپ کی تشریف آوری کی تاریخ دیکھ لیتا۔

عرض کیا۔ یہی کوئی چار پانچ دن ہوتے ہوں گے۔ آپ کس جگہ رہتے ہیں۔

فرمانے لگے۔ آپ کے بائیں طرف پانچ مکان چھوڑ کر ایک کچے کوٹھے میں رہتا ہوں۔ سیر کے لئے نکلا تھا نئی عمارت دیکھ کر ادھر آ گیا۔

اُن سے پوچھا "صاحب یہ بتلایئے وہ جو مغرب کی طرف بہت بڑی گنبد والی بلڈنگ ہے جس پر جھنڈا لہرا رہا ہے وہ کن صاحب کی ہے۔

کہنے لگے "وہ عمارت یہاں کے حاکم اعلیٰ کی ہے۔ گورنمنٹ ہاؤس ہے یہاں کا۔ اور جھنڈے کا گورنمنٹ ہاؤس پر لہرانا لازمی امر ہے۔ اس عمارت کے گرد جو چھوٹی بڑی بلڈنگیں ہیں، وہ حاکم اعلیٰ کے پرنسپل سٹاف کی ہیں"

گھبرا کر پوچھا "تو خوب یہاں پر بھی دنیا کی طرح سلسلہ قائم ہے"

کہنے لگے "ہاں صاحب بالکل۔ فرق صرف اوپر نیچے کا ہے۔ وہ زمین کے اوپر اور یہاں زمین کے نیچے۔ یہاں پر ہر محکمہ ہے۔ دفاع۔ بحالیات۔ واپڈا، ملٹری۔ پولیس۔ محاسبہ وغیرہ وغیرہ دنیا کے محکموں سے دو ایک زیادہ ہی ہوں گے"

ان سے پھر پوچھا "تو یہاں پر وزیر بھی ہوں گے"

بولے۔ "ہاں ہاں کیوں نہیں۔ تمام منسٹریاں ہیں۔ اور چھ سات تو یہاں بے محکمہ وزیر ہیں۔

ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد وہ حضرت پھر کسی دن آنے کا کہہ کر رخصت ہوئے۔ لیکن ان کے جاتے ہی ایک اور صاحب ملاقات کے لئے آ گئے۔

فرمانے لگے "سلام عرض ہے بندہ نواز"

میں نے کہا۔ آیئے آیئے تشریف لایئے۔

کہنے لگے۔ آپ مہربان ستے نئے ٹرانسفر ہو کر آئے معلوم ہوتے ہیں۔

یہ حضرت بات بات میں بندہ نواز، مہربان، جناب عالی، جی جناب وغیرہ وغیرہ کہنے کے عادی تھے۔ گفتگو کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ دنیا میں ضرور بزنس مین ہوں گے اور گاہکوں سے اسی انداز میں بات چیت کرتے ہوں گے۔ نہ رہا گیا ان سے پوچھ ہی لیا "کیوں صاحب آپ یہاں آنے سے پہلے کیا کاروبار کرتے تھے"۔

جواب دیا "جی مہربان کپڑے کا کاروبار تھا۔ بہت بڑا کاروبار۔ ہر قسم کے کپڑے کے معاملے میں ماہر تھا۔

عرض کیا "بہت خوب"

کہنے لگے۔ "یہ دیکھئے بندہ نواز۔ یہ لٹھے کا سوٹ جو آپ نے پہن رکھا ہے۔ حقیقت میں اصلی لٹھا نہیں۔ دھوبی کی دھلی ہوئی مارکین ہے۔ پار سو جیس کی گئی ہے۔

میں نے پوچھا۔ یہاں آپ لٹھے کا ہی کاروبار کرتے ہیں۔

کہنے لگے۔ "نہیں مہربان۔ اصل میں بندہ نواز دنیا سے ناقص قسم کا لٹھا امپورٹ ہوتا ہے اور اس پر ڈیوٹی بھی بہت زیادہ ہے۔ مل والے بہت لالچی ہو گئے ہیں۔ گھٹیا چیز اور منافع زیادہ یہ اصول ہے ان کا۔ کیا کاروبار کیا جاتے۔ آج کل بیکار ہوں۔

میں نے گھبرا کر پوچھا "یہاں پر بھی دنیا والے ہی جھیلے ہیں۔

کہنے لگے۔ جی جناب بالکل۔ بلکہ کچھ زیادہ۔ ایک بات عرض کروں۔

میں نے کہا "فرمائیے"۔

کہنے لگے۔ اپنے بنگلے سے میرا بنگلہ بدل لیجئے۔ مہربانی ہوگی۔ نذرانہ بھی پیش کروں گا۔

جواب دیا "اچھا صاحب سوچ کر جواب دوں گا"۔

کہنے لگے "ہاں سوچ لیجئے۔ جناب عالی میرا بنگلہ مولسری کے درختوں میں گھرا ہوا ہے ہر وقت خوشبو آتی رہتی ہے۔ میں عادی نہیں اس لئے اکثر زکام رہتا ہے۔ دراصل مجھے لٹھے کی خوشبو کے علاوہ اور کوئی خوشبو برداشت نہیں کر سکتا۔ بجلی پانی سب موجود

ہے۔ اگر بجلی کا بل نہ بھی دیں تو کوئی فکر نہیں۔ مدیکو کی طرح نہیں کہ بل ادا کر دو پھر بھی بجلی کاٹ جائیں گے۔

میں نے کہا۔ آپ کا بنگلہ تو بہت اچھا ہے۔

کہنے لگے۔ فلش سسٹم بھی ہے اور سوئی گیس کی لائن بھی بچھائی جا رہی ہے۔

میں نے کہا۔ سوئی گیس کی لائن تو بہت پہلے بچھ جانی چاہیئے تھی۔

انہوں نے کہا۔ بچھ جانی تھی۔ مگر پہلا ٹھیکہ صاحب کے سالے کا تھا۔ اُس نے کاغذ پر لائن بچھا دی اور بے منٹ لے کر افغانستان شہر خموشاں میں سیٹل (Settle) ہو گیا۔ بڑے صاحب کا چھوٹا سالہ تھا کیس دب گیا۔

یہ حضرت رخصت ہوتے تو طبیعت گھبرانے لگی۔ یا اللہ دنیا اور دنیا کے بکھیڑے تو میں پیچھے چھوڑ آیا تھا۔ مگر یہ تو ساتھ ساتھ ہیں۔ سوچا تھا کہ یہاں آرام ملے گا عزیزوں رشتہ داروں سے دور رہ کر۔ دنیا کی مصیبتوں سے نجات ملے گی۔ ذرا نظر اُٹھائی تو سامنے ایک صاحب ہاتھ میں رجسٹر تھامے کھڑے تھے۔

اسلام علیکم۔

وعلیکم اسلام۔ فرمایئے؟ میں نے کہا۔

خود ہی بیٹھ کر بولے۔ اس بنگلے کے آپ مالک ہیں۔

میں نے کہا جی۔

بولے۔ اس کا پراپرٹی ٹیکس ادا کرتے ہیں۔

میں نے کہا۔ ابھی چند دن ہوتے تو آیا ہوں۔ مگر آپ کی تعریف۔

بولے۔ میں ٹیکس انسپکٹر ہوں۔ اس کا مطلب ہے کہ ابھی ٹیکس کی تشخیص نہیں ہوئی۔ پھر اِدھر اُدھر نظر دوڑا کر بولے۔ اس بنگلے کا سالانہ ٹیکس تیرہ سو روپے ماہوار ہوگا۔ لیجئے اس فارم پر دستخط کر دیجئے۔

میں نے کہا۔ ایک ہی وقت میں سالانہ ٹیکس اور ماہوار ٹیکس کیا ہوتا ہے۔

بولے۔ صاحب یہ تو سیدھی بات ہے۔ معلوم ہوتا ہے دنیا میں آپ کو ٹیکس کے محکمہ سے واسطہ نہیں پڑا۔ اگر آپ یہاں ماہوار ٹیکس ادا کریں گے۔ یعنی مجھے تو سالانہ ٹیکس میں بہت کمی ہو جائے گی۔

میں نے جواب دیا۔ مگر ادا کہاں سے کروں گا ان ٹیکسوں سے بھاگ کر تو یہاں آیا تھا۔ مگر تیرہ ۱۳۰۰ سو تو بہت زیادہ ٹیکس ہے۔

وہ بولے۔ اچھا تو اس طرح کیجئے اس میں ہم دونوں کا فائدہ ہوگا۔ چارپائی کے لئے دو صد روپے کا یکمشت بندوبست کر دیجئے۔ سالانہ ٹیکس برائے نام ہو جائے گا۔

میں نے کہا۔ اچھا پہلے یہ بتلایئے۔ اس کے علاوہ اور کون کون سے ٹیکس مجھے ادا کرنے ہوں گے کہنے لگے۔ ایک تو یہی ہے پراپرٹی ٹیکس، دوسرا ایک ادا کریں گے جائیداد ٹیکس۔ تیسرا ہاؤس ٹیکس۔ چوتھا بنگلہ ٹیکس یا بڑاں کوٹھی ٹیکس، چھٹا اونرشپ ٹیکس۔ گیراج ٹیکس۔ ڈرائنگ روم ٹیکس، ڈائننگ روم ٹیکس۔ اگر ڈرائنگ روم اور ڈائننگ روم اکٹھے ہوں جس کو کم کہتے ہیں، تو پھر ۲۵ رفیصد ریبیٹ ملتا ہے۔ آپ کو نہیں ٹیکس لینے والوں کو اس کے علاوہ کچن ٹیکس ہے۔ باتھ روم ٹیکس اور.....

میں نے گھبرا کر کہا۔ خدا کے لئے بس کیجئے۔ ذرا سانس لیجئے اور سانس لینے دیجئے۔

"تھوڑی دیر بعد میں نے اسی گھبراہٹ کے عالم میں کہا۔ تعجب کی بات ہے کہ گھر تو صرف ایک اور مختلف ناموں سے ٹیکس اتنے سارے؟"

وہ بولے۔ جی ہاں وہی بات ہے کہ صاحب کا ملازم تو ایک ہے مگر سارے کام وہی کرتا ہے۔ مالی بھی وہ، خانساماں بھی وہ، شوفر بھی وہ، بیرا بھی وہ آدمی ایک آسامیاں زیادہ۔ گھر ایک ٹیکس زیادہ۔ آپ نے یہ بنگلہ بنک سے قرضہ لے کر بنایا ہے۔

میں نے جواب دیا۔ جی نہیں بنک سے قرضہ نہیں لیا۔

کہنے لگے تو آپ بڑے خوش قسمت ہیں۔ پندرہ سال ہوتے ہیں مَیں نے بنک سے قرضہ لے کر گھر بنایا تھا۔ آج تک بنک کے چکروں میں پھنسا ہوا ہوں۔ جتنی قرضے کی رقم کم ہوتی ہے اتنی ہی سود کی بڑھ جاتی ہے۔ مسلمانوں کے لئے سود حرام ہے۔ لیکن یہ بنک والے مسلمان ہو کر سود در سود رقم وصول کرتے ہیں۔ یعنی حرام در حرام۔ خدا کی پناہ۔ نہ جانے ان کا کیا حشر ہو گا۔

مَیں نے کہا۔ سود در سود کا مطلب ہے آگ در آگ۔

کہنے لگے۔ بڑے لمبے لمبے اشتہار اخباروں میں دیتے ہیں۔ عوام کی خاص سہولت کے لئے آسان قسطوں میں قرض ادا کیجئے۔ آپ کا اپنا بنک۔ ایک بار قرض لے لیں تو ایسا جکڑیں گے کہ جان چھڑانی مشکل ہو جائے گی۔ سہولت آپ کو دیتے دیتے بنک والے خود سہولت لے جائیں گے یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے غریب لوگ مرغ چھولے کے لالچ میں مرغ کے بہانے چھولے کھا لیتے ہیں۔

مَیں نے کہا آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ گھر آپ کا اور آدھی رقم رہن ان کے پاس۔

بولے۔ ہر ماہ اچھی خاصی قسط کی رقم ادا کرتا ہوں۔ بعض اوقات مجھے محسوس ہوتا ہے کہ اپنے گھر میں ڈبل کرایہ پر رہ رہا ہوں۔ خدا بچائے ان بنکوں کے قرضے اور ان کے دلکش اعلانوں سے۔ خدمت میں پیش پیش کہہ کر پھنسا لیتے ہیں۔ اور بعد میں خدمت میں پس و پیش کرتے ہیں۔

اچھا صاحب اجازت دیجئے۔ پرسوں پھر حاضر ہوں گا۔ چارپائی کا بندوبست کر رکھئے خدا حافظ۔

پہلے صرف طبیعت گھبراتی تھی اب روح بھی گھبرانے لگی۔ تھوڑی دیر کے لئے آنکھیں بند کیں اور کچھ سکون محسوس ہوا کہ اتنے میں کھٹکا ہوا۔ دیکھا تو ایک نوجوان لٹھے کا سوٹ پہنے اور ریشمی ٹائی لگائے بڑے رعب کے ساتھ اکڑتے ہوئے کودتے آ رہے ہیں۔ شکل و صورت سے دفتر کے بابو معلوم ہوتے تھے۔ آتے ہی اِدھر اُدھر نظر دوڑا کر بغیر سلام دعا کہنے لگے۔

"آپ اس بنگلے میں رہتے ہیں؟"

عرض کیا۔ جی ہاں۔ کچھ اعتراض ہے۔

فرمایا۔ اس کا کرایہ ادا کرتے ہیں آپ۔

پھر پوچھنے لگے۔ اس کی الاٹمنٹ ہے آپ کے پاس۔

میں نے کہا۔ نہیں۔ لیکن صاحب آپ کی تعریف۔

ذرا گردن اکڑا کر بولے۔ میں محکمہ بحالیات کا انسپکٹر ہوں۔ سینئر انسپکٹر۔

عرض کیا۔ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں۔

رعب سے کہنے لگے۔ "دیکھئے مسٹر بات یہ ہے کہ نہ آپ کے پاس اس بنگلے کی الاٹمنٹ ہے اور نہ آپ اس کا کرایہ ادا کرتے ہیں۔ اور پھر یہ بنگلہ آپ کی حیثیت سے زیادہ ہے۔

میں نے پوچھا۔ ان باتوں سے کیا مطلب ہے آپ کا۔

پھر رعب سے بولے۔ مطلب صاف ہے۔ یہ بنگلہ آپ کو خالی کرنا پڑے گا۔

پوچھا وہ کیسے اور کیوں۔

کہنے لگے۔ آپ کو بے دخلی کا نوٹس دیا جائے گا۔

عرض کیا۔ مگر کیوں۔

کہنے لگے۔ اس لئے کہ یہاں کے ایک سی ایس ایس افسر کو یہ بنگلہ پسند آگیا ہے۔ یہ ان کو دیا جائے گا۔

میں نے پوچھا۔ یہ سی ایس ایس کیا ہوتا ہے۔

جواب دیا۔ سول سروس آف سیکرٹری۔

میں نے کہا۔ جناب سیکرٹری تو سی سے ہوتا ہے ایس سے نہیں۔

کہنے لگے۔ دنیا میں ہوتا ہوگا۔ یہاں پر نہیں۔ یہاں پر سیدھی سادھی زبان ہے۔

میں نے کہا۔ بجا فرمایا۔

کہنے لگے۔ بجا وجا رہنے دیں۔ بنگلہ خالی کرنے کا کریں۔

عرض کیا۔ وہ سی ایس ایس افسر کوئی اور بنگلہ کیوں پسند نہیں کر لیتے۔ بے شمار عمدہ عمدہ

عمارتیں ہیں۔ کسی انصار کی الاٹ کرا لیں۔ مجھے کیوں تنگ کرتے ہیں۔

کہنے لگے۔ اچھا تو آپ مہاجر ہیں۔

عرض کیا۔ جی ہاں بالکل اصلی مہاجر مشرقی پنجاب کا۔

پوچھنے لگے۔ اچھا کتنی جائیداد چھوڑ کر آئے ہیں۔ آپ مشرقی پنجاب میں۔

عرض کیا۔ اللہ کے فضل سے آدھے سے زیادہ محلہ خموشاں اپنے خاندان کا تھا۔

فرمانے لگے۔ صاحب ایسی باتیں سبھی کہتے ہیں۔ جو کہتا ہے یہی کہتا ہے سوا لاکھ چھوڑ کر آیا ہوں بعد میں معلوم ہوتا تھا کہ کرایہ کے مکان میں رہتا تھا۔ کوئی رجسٹری ہے آپ کے پاس۔

میں نے کہا۔ رجسٹری کہاں سے آتی۔ لانے کا ہوش کس کو تھا۔

کہنے لگے۔ خیر ہوگی آپ کی بہت سی جائیداد۔ مگر کل تک یہ بنگلہ خالی کردیں۔

عرض کیا۔ خود کہاں جاؤں۔

کہنے لگے۔ جہاں دل چاہے چلے جائیں۔ کسی دوست کے پاس یا کسی کے ساتھ شریک ہو جائیں۔ بس کل شام تک عمارت خالی ہو۔

جب دیکھا مصیبت پڑ گئی اور بلا ٹلنے کا نام نہیں لیتی تو جھنجلا کر کہا۔ سنیئے سپرنٹنڈنٹ انسپکٹر صاحب یہ میں ہرگز خالی نہ کروں گا۔

پوچھنے لگے۔ "وہ کیوں"

میں نے کہا۔ وہ اس لئے کہ یہ بنگلہ مجھے کسی نے الاٹ نہیں کیا۔ بلکہ یہ میری ذاتی ملکیت ہے۔ حقیقت میں یہ میں نے بڑی مشکل سے مرکر حاصل کیا ہے، کیا آپ نے باہر میرے نام کا بورڈ نہیں دیکھا۔

وہ صاحب بولے۔ بورڈ دیکھا تو تھا مگر پڑھا نہیں۔ بہت خوش خط ہے۔ اچھا تو یہ آپ کی ذاتی ملکیت ہے۔ پھر بھی کوئی بات نہیں ہم آپ کو اس کی بجائے ایک اور اچھی سی کوٹھی الاٹ کردیں گے۔ بالکل مفت میں۔ آپ چاہے کرایہ بھی نہ دیں۔ اور اس کو بے شک کرایہ

پر اُٹھا دیں۔

میں نے اب ذرا تیزی سے کہا۔ نہیں صاحب یہ ہرگز نہ ہوگا۔ میں قیامت تک یہ عمارت نہ چھوڑوں گا۔ چاہے ایجکٹمنٹ آڈر لائیں، چاہے پنجاب پولیس لے آئیں۔ میں ہرگز خالی نہ کروں گا۔ میری اپنی ملکیت ہے کیوں چھوڑوں۔

وہ حضرت رعب سے بولے۔ چُپ چاپ خالی کر دیں تو بہتر ہے۔ شائد آپ کو علم نہیں جس افسر کے لئے درکار ہے، وُہ بڑا سخت اور ضدی ہے۔ اور ایک وزیر صاحب کا رشتہ دار بھی ہے۔ اُس کی خالہ کی بہن کی پھوپھی کے بھتیجے کا سالا ہے۔ سمجھ گئے۔

میں نے بھی اُسی تیزی کے ساتھ جواب دیا۔ یہ رعب کسی اور پر جمایئے۔ اپنا بھی ایک قریبی رشتہ دار وزیر بہاں آنے ہی والا ہے۔ بس دو ایک سال میں۔ اُس وقت پچھتر سال سے اُوپر ہو چکا ہے۔ اب وُہ حضرت ذرا نرمی سے بولے۔ اچھا کیا نام ہے اُن کا۔

میں نے کہا نام پوچھ کر کیا کیجئے گا۔ کئی منسٹریوں میں مستقل وزیر رہا ہے۔ مارشل لا ہٹنے تک آنے دیجئے آپ سے تعارف کرا دیا جائے گا۔

اب ذرا اور نرمی سے بولے۔ اچھا میں سمجھ گیا کون ہو سکتے ہیں بہت نیک ہیں۔ میرے چچا زاد بھائی۔ ان کے پرائیویٹ سیکرٹری کے پی اے تھے۔

میں نے کہا۔ جب کسی شاندار بنگلے کی بنیاد پڑتے دیکھئے گا تو جان لیجئے آ رہے ہیں۔

اب وہ حضرت بالکل ملائم ہو کر بولے۔ اجی جناب سچ مانیئے میں رعب وعب کہاں دے رہا تھا۔ میری تو ڈیوٹی ایسی کم بخت ہے کیا کروں۔ اگر آپ کو منظور نہیں تو نہ سہی۔ میرا مطلب تھا۔ آپ کو حکومت سے اچھا کرایہ مل جائے گا۔ بہرحال بندھا بندھایا چک۔ خیر ہم افسر کا کوئی اور بندوبست کر دیں گے۔ کوئی خدمت ہو تو فرما دیجئے۔

میں نے شکریہ ادا کیا۔ اور دل میں سوچا یہاں پر بھی وزیروں کا بہت رعب ہے۔ مرا ہوا سفید ہاتھی یہاں پر سوا لاکھ سے بھی زیادہ کا نکلا۔

وہ حضرت خوشامدانہ صورت بنا کر بولے: "جناب یہ آپ کا 'نیم بورڈ' بہت خوبصورت ہے۔ آرٹسٹک۔ ایسا تو کسی بھی عمارت کا نہیں۔ مجھے یہ سب سے زیادہ پسند آیا۔"

میں نے عرض کی۔ اگر آپ کو یہ نیم بورڈ پسند ہے تو شوق سے لے جائیے اور اپنا نیم بورڈ بنا کر گھر پر لگا دیجئے۔

ہنس کر بولے۔ نہیں صاحب یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اس سے اکونٹنٹ جنرل کو غلط فہمی ہو جائے گی۔ آپ کا حساب میری کتاب میں لکھا جاتے گا اور میرا حساب آپ کی اکونٹ بک میں۔ سب حساب غلط ملط ہو کر رہ جائے گا۔ اسے جی پی آر والوں کو پریشانی ہو گی۔ ہاں تو صحیح کتابوں میں لکھا ہوا حساب کتاب نہیں تھا۔ میں نے تو ویسے ہی عرض کیا تھا کہ آپ کا نیم بورڈ بہت خوبصورت ہے۔ اچھا اب اجازت دیجئے۔ دفتر کا کوئی کام ہو تو بلا تکلف فرما دیجئے۔ بندہ حاضر ہے۔

انسپکٹر صاحب بہادر رخصت ہوتے تو طبیعت بہت گھبرائی دیکھئے اب کون آتا ہے اور یہ شگوفہ چھوڑتا ہے۔ اے اللہ میاں آن پہنا۔ سوچا تھا کیا اور کیا ہو گیا۔ مگر کیا کرتا سر پیٹ کر بیٹھ رہا اور علامہ اقبال کا مصرعہ دہرانے لگا۔

تیرے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا

پھر ذوق کا مصرعہ قوالی کے انداز میں گانے لگا۔ "مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے، کدھر جائیں گے، کدھر جائیں گے۔" مانوس نسوانی آواز آئی اٹھو ناشتہ کر کے دفتر جاؤ اور کہاں جاؤ گے۔

UQAABI
03055198538

ہماری زندہ جاوید مطبوعات

۱	جاناں جاناں	احمد فراز	۲۰/-
۲	نایافت	"	۲۰/-
۳	شب خون	"	۲۰/-
۴	میرے خواب ریزہ ریزہ	"	۲۰/-
۵	دردِ آشوب	"	۲۵/-
۶	تنہا تنہا	"	۲۵/-
۷	بسلامت روی	کرنل محمد خان	۳۰/-
۸	تکمیلِ انسانیت	کرنل افضل کیانی	۳۶/-
۹	متاعِ قفس	"	۲۰/-
۱۰	اسلام کے عظیم فرزند	صادق حسین طارق	۱۲/-
۱۱	جادہ کامرانی	ڈیل کارنیگی	۱۳/۵۰
۱۲	حیاتِ جوہر	سید محمود آزاد	۹/-
۱۳	نماز کی مکمل کتاب پلاسٹک کور	اکرام الحق	۱۶/-
۱۴	میرا نام منگو ہے	جبار توقیر	۵/۵۰
۱۵	مثبت نتائج	زاہد ملک	۲۵/-
۱۶	ڈونگے سمندر	راجہ ظہور احمد	۲۰/-
۱۷	یہ شوہر یہ زمیں	اسرار اشفاق	۲۰/-
۱۸	گفتگو اور تقریر کا فن	جبار توقیر	۲۱/-
۱۹	جھوٹ کا پل	"	۵/-
۲۰	قصے اللہ والوں کے	سعد اللہ ممتاز	۲/-
۲۱	میرے بھی صنم خانے	قرۃ العین حیدر	۳۰/-
22	ITALIAN CAMPAIG	MAJ. ANJUM	14/-
23	ADMINISTRATIOA & MORALE		30/-
24	LEGACY OF KASHMIR	C. COL. M. ZAFFAR IQBAL	60/-
۲۵	مہربان پری		۳/-
۲۶	جادو کے پیالے		۳/-
۲۷	ہمسفر	آمنہ اقبال	۱۸/-
۲۸	تحریکِ پاکستان	صادق حسین ط	

یوسف پبلشرز

بنک روڈ • راولپنڈی • صدر